اسلام کا روحانی و نفسیاتی پہلو

علامہ محمد غزالیؒ

ترجمہ

ابومسعود اظہر ندوی

مکتبہ اشاعت القرآن، دہلی
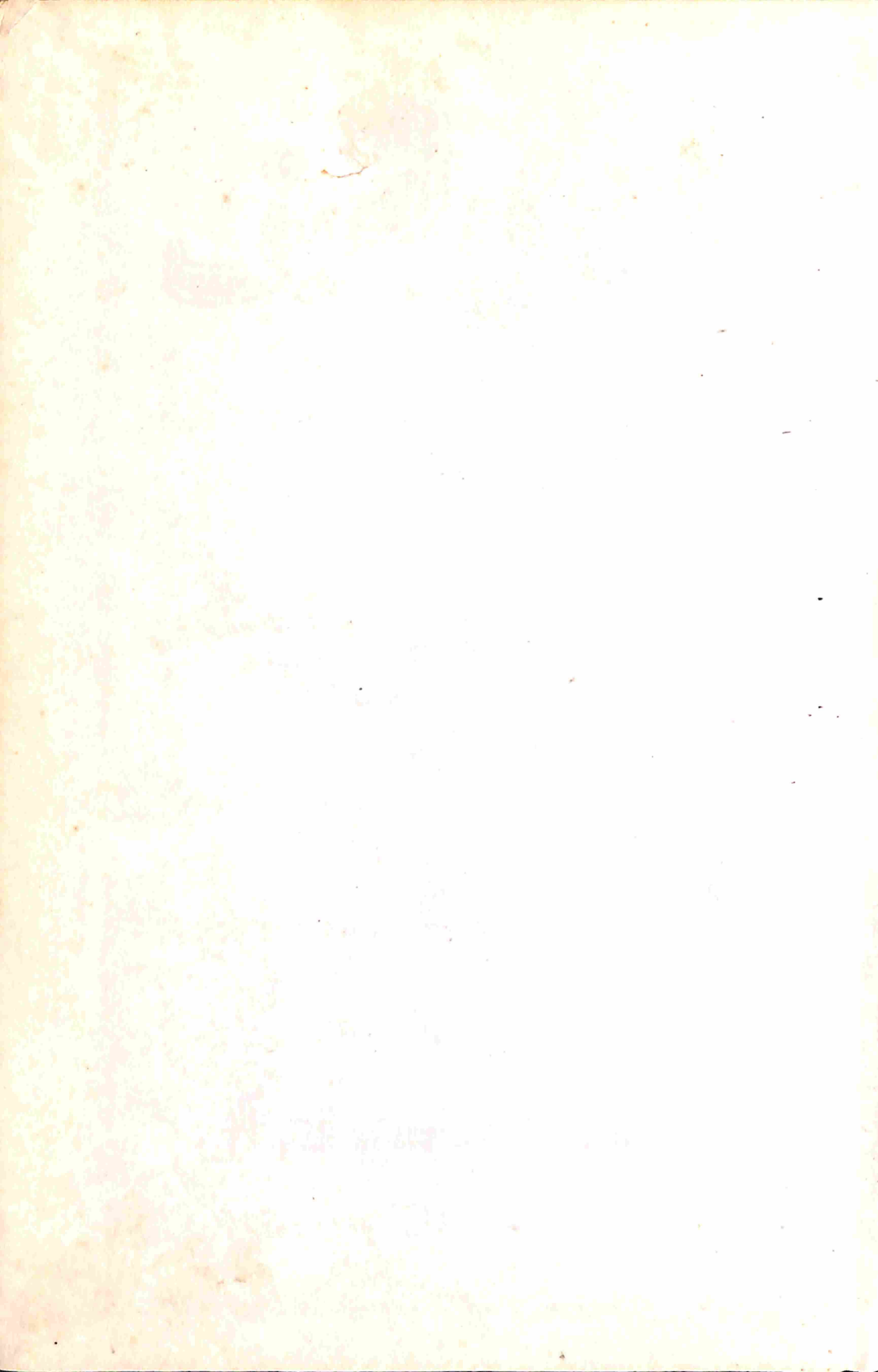
اسلامی تصوف

اسلام کا روحانی اور نفسیاتی پہلو

تصنیف

علامہ محمد غزالی

ترجمہ

ابو مسعود اظہر ندوی

ناشر

مکتبہ اشاعت القرآن

4159-اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔ ۱۱۰۰۰۶

فہرست

ہمارے دور کے لوگوں کو زندگی کے فتنوں نے اپنے شکنجوں میں اس طرح جکڑ لیا ہے

نام کتاب : اِسلامی تصوّف
(اسلام کا روحانی و نفسیاتی پہلو)

مصنّف : علّامہ محمد غزالیؒ

مترجم : ابو مسعود اظہر ندوی

بار اوّل : ۲۰۰۰ء

تعداد : گیارہ سو

طابع : فائن آفسیٹ ورکس 4152 اُردو بازار، دہلی ۶

قیمت : اسّی روپے

ناشر

مکتبہ اشاعت القرآن

۴۱۵۹ اُردو بازار ۔ جامع مسجد دہلی ۱۱۰۰۰۶

ملنے کے پتے :

ریحان فاؤنڈیشن ۔ ڈی ۲۳۲ ۔ ابوالفضل انکلیو ۔ جامعہ نگر نئی دہلی ۱۱۰۰۲۵

کتب خانہ عزیزیہ ۔ اُردو بازار جامع مسجد، دہلی

فرید بکڈپو ۔ مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفے چند

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی خَاتَمِ النَّبِیِّیْنَ۔

اسلام کا تعلق انسان کے ظاہر و باطن دونوں سے ہے۔ وہ جس طرح کچھ ظاہری اعمال کی بجاآوری پر زور دیتا ہے اسی طرح دل کے پورے خلوص اور انہماک پر بھی زور دیتا ہے۔ جسم کی ظاہری پاکیزگی کے ساتھ قلب کی اندرونی پاکیزگی کو بھی نہایت اہمیت حاصل ہے اور جب یہ دونوں چیزیں یعنی ظاہری اعمال وکردار اور باطنی پاکیزگی اور قلب کی صفائی ہم آہنگ ہو جائیں تبھی انسان احسان کے درجہ تک پہنچ سکتا ہے جو دنیا میں اہل ایمان کی منزلِ مقصود ہے۔ دل کی پاکیزگی وخلوص کے بغیر اعمال بے روح جسم ہو جاتے ہیں اسی لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ایسا ہے کہ اگر وہ تندرست ہو تو پورا جسم تندرست رہتا ہے اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جاتا ہے اور وہ دل ہے۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ تقویٰ وپرہیزگاری کا مرکز وسرچشمہ دل ہی ہے۔

تزکیۂ نفس یعنی دل کی صفائی وپاکیزگی کی تربیت کو کچھ علماء نے اپنی توجّہ کا خاص مرکز بنایا اور اپنے اپنے انداز میں اس میدان میں کافی محنت ومشقت سے کام لیا۔ بعد میں مختصر طور پر اس عمل کو تصوف کہا جانے لگا۔

تصوف شکستہ دلوں کا مداوا بن کر اس وقت سامنے آیا تھا جب فاسد نظامِ حکومت اور دنیا پرستی وعیش کوشی کے ماحول نے ملّت کے باشعور اور مخلص افراد کے لیے گھٹن کا ماحول پیدا کر دیا تھا۔

انتساب

اپنے اساتذۂ کرام
کے نام

جنھوں نے شفقت اور جانسوزی کے ساتھ میری تعلیم وتربیت کی کوشش فرمائی ان میں سے بعض حضرات اب اس دنیا میں نہیں رہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ اور ان کے درجات بلند فرمائے:
حافظ صدیق احمد مرحوم، ماسٹر ابو رفعت مرحوم، ماسٹر صفت حبین مرحوم، ماسٹر شاہد علی مرحوم، ماسٹر نیاز احمد صدیقی مرحوم، ماسٹر صدیق احمد جونپوری مرحوم، قاری اسلام احمد مرحوم، مولانا غالب احسن اصلاحی مرحوم، مولانا وجیہ الدین ندوی مرحوم، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی مرحوم، مولانا ابو العرفان ندوی مرحوم، مولانا اسحاق سندیلوی مرحوم اور مولانا سلمان ندوی مرحوم۔

آسماں ان کی لحد پر شبنم افشانی کرے

دیگر اساتذۂ کرام کی عمر میں اللہ تعالیٰ برکت دے اور ان کا سایہ تادیر قائم رکھے۔
ڈاکٹر محمد امین اعظمی، مولانا اقبال احمد قاسمی، جناب محمد فاروق خاں، مولانا احتشام احمد اصلاحی، رشید کوثر فاروقی، ڈاکٹر محمد اجتبا ندوی، مولانا سعید الرحمٰن الاعظمی ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن سلطانپوری مولانا ناصر علی ندوی، مفتی ظہور احمد ندوی اور مولانا محمد رابع ندوی حفظہم اللہ۔
اللہ تعالیٰ ان سب حضرات کو جزائے خیر سے نوازے۔

خاکِ کفِ پا
ابو مسعود اظہر ندوی

حدیث، تفسیر اور فقہ کے امام ہوا کرتے تھے پروفیسر خلیق احمد نظامی "تاریخ مشائخ چشت"، میں لکھتے ہیں:

"شاہ ولی اللہ نے قرآن اور حدیث کے علم کو ایک پیر و مرشد کے لیے لازمی قرار دیا ہے حضرت یحییٰ بن معاذ رازیؒ کا کہنا ہے کہ تین قسم کے آدمیوں کی صحبت سے بچنا چاہیے۔ غافل عالموں سے، مکار و چاپلوس فقیروں سے اور جاہل صوفیوں سے۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ فرمایا کرتے تھے کہ جاہل پیر مسخر شیطان ہو جاتا ہے اس کی نگاہ حقیقت اور سراب میں امتیاز کرنے سے قاصر رہتی ہے وہ دل کی بیماریوں کی صحیح تشخیص اور مناسب علاج نہیں کر سکتا۔" حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ پیر ایسا ہونا چاہیے کہ احکام شریعت، طریقت اور حقیقت کا علم رکھتا ہو اگر ایسا ہوگا تو وہ خود کسی نامشروع چیز کے لیے نہیں کہے گا۔ آپ کا یہ اصول تھا کہ کسی ایسے شخص کو جو عالم نہ ہو خلافت نہیں عطا کرتے تھے حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ ایک خط میں لکھتے ہیں کہ "اے برادر اگر تم آج فقراء کے مراتب کا پتہ لگانا چاہو تو ان کی اتباعِ شریعت پر نظر کرو کہ شریعت ہی معیار ہے اسی کسوٹی پر فقیر کی حقیقت روشن ہو جاتی ہے۔ شیخ حسین نوریؒ کا مشورہ تھا کہ اگر کسی ایسے شخص کو دیکھو جو خداوند تعالیٰ کے ساتھ ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جو اس کو علم شریعت کی حد سے نکال دیتی ہے تو اس کے قریب بھی نہ جاؤ اور اگر کسی ایسے شخص کو دیکھو جو ایک ایسی حالت کا دعویٰ کرتا ہے جس کی کوئی دلیل نہیں اور ظاہری احکام کی پابندی اس کی شہادت نہیں دیتی تو اس کے دین کو قابلِ اعتبار نہ سمجھو۔"

(تاریخ مشائخ چشت ص ۴ - ۵)

اور خود تصوف کے راستے سے در آنے والی خرابیوں پر حضرات صوفیہ ہی سب سے زیادہ اور سخت تنقید کرتے رہے ہیں۔ مولانا رشید احمد گنگوہیؒ نے ایک بار فرمایا:

"ابتدا سے اور اس وقت تک جس قدر ضرر دین کو صوفیہ سے پہنچا ہے اتنا کسی اور فرقہ سے نہیں پہنچا۔ ان سے روایت کے ذریعہ سے بھی دین کو ضرر ہوا اور عقائد کے لحاظ سے بھی اور اعمال کے لحاظ سے بھی اور خیالات کے لحاظ سے بھی۔ اس کے بعد اس کی قدرے تفصیل فرمائی اور فرمایا کہ جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی قوتِ روحانی کی یہ حالت تھی کہ بڑے سے بڑے کافر کو لا الٰہ الا اللہ کہتے ہی مرتبۂ احسان حاصل ہو جاتا تھا۔ جس کی ایک نظیر یہ ہے کہ صحابہؓ نے عرض کیا کہ ہم پاخانہ پیشاب

صحیح الفکر اور پختہ کردار کے مخلص علماء نے ملّت کے افراد کی صحیح خطوط پر تربیت اور کردار سازی اور دین کی خدمت کے لیے یہ راستہ اختیار کیا تھا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ صحیح تصوّف نے دین وملت کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔

صوفیائے عظام رہبانیت کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ جس چیز کو ترک کرنے پر زور دیتے تھے وہ دنیا نہیں بلکہ دنیا کا غیر ذمے دارانہ و بے اعتدالانہ استعمال تھا کیونکہ بقول مولانا آزادؒ "دنیا نہیں بلکہ دنیا کا بے اعتدالانہ استعمال ہی روحانی سعادت کے خلاف ہے۔"

صوفیہ کہتے تھے کہ انسان اللہ کی دی ہوئی سب نعمتوں سے فائدہ اٹھائے، اس کائنات کی ایک ایک چیز سے مستفید ہو لیکن اس طرح کہ دنیا کی محبت اس کے دل کو آلودہ نہ کرنے پائے اور جب جان دینے اور اس کی لذّتوں سے دستبردار ہونے کی دعوت دی جائے تو وہ لبیک کہتے ہوئے اس طرح دوڑے گویا بھوکے کو غذا اور پیاسے کو پانی کی پکار سنائی دی اس کی زندگی کا مرکز و محور رضائے خداوندی بن جائے۔

"شیخ ہجویریؒ نے ایک بزرگ کا قول نقل کیا ہے کہ فقیر وہ نہیں کہ جس کا ہاتھ توشہ سے خالی ہو بلکہ فقیر وہ ہے جس کی طبیعت مراد سے خالی ہو۔"

"حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ ترک دنیا کے یہ معنی نہیں کہ کوئی اپنے آپ کو ننگا کرے اور لنگوٹہ باندھ کر بیٹھ جائے بلکہ ترک دنیا یہ ہے کہ لباس بھی پہنے اور کھائے بھی اور حلال کی جو چیز بھی پہنچے اسے روا رکھے لیکن اس کے جمع کرنے کی طرف رغبت نہ کرے اور نہ دل کو اس سے لگائے۔ ترکِ دنیا یہ ہے۔"

(تاریخ مشائخ چشت از خلیق احمد نظامی ص ٦)

صوفیائے کرام اللہ تعالیٰ کی محبت ہی کو مرکزِ توجّہ بناتے تھے لیکن بہترین اخلاق اور مخلوقِ خدا سے محبت ہی کو اس مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھتے تھے کیونکہ مولانا آزادؒ کے بقول "خدا کی محبت کی راہ اس کے بندوں کی محبت میں سے ہو کر گزرتی ہے جو انسان چاہتا ہے کہ خدا سے محبت کرے اسے چاہیے کہ خدا کے بندوں سے محبت کرنا سیکھے۔" (حوالہ بالا)

تصوف شریعت پر عمل کے علاوہ کچھ نہیں ابن جوزیؒ کہتے ہیں کہ "قدمائے صوفیہ قرآن،

کمانے لگے اس طرز عمل نے علم وفضل اور تربیت وارشاد کی بڑی بڑی مسندوں کو بے اثر ہی نہیں کرڈالا بلکہ انھیں انحراف وگمراہی تک کا ذریعہ بناڈالا اور بقول اقبال "عقابوں کے نشیمن زاغوں کے تصرف" میں آگئے۔

پہلے کے بزرگ اس معاملے میں بہت احتیاط سے کام لیتے تھے کہ ایسی ذمے داری کے منصب پر کوئی نااہل شخص فائز نہ ہونے پائے۔ شیخ نصیر الدینؒ چراغ دلی کا مشہور واقعہ ہے کہ انھوں نے وفات کے وقت کسی کو اپنا جانشین بنانے کے اہل نہیں سمجھا تو حکم دیا کہ کسی کو بھی اس منصب پر فائز نہ کیا جائے اور ان کا خرقہ وغیرہ انہیں کے ساتھ دفن کر دیا جائے۔

تصوف وطریقت کے تعلق سے ایک بڑی کمی یہ پائی جاتی ہے کہ ائمہ وفقہا نے جس طرح عبادات ومعاملات وغیرہ سے متعلق احکام کے سلسلے میں انتھک محنت کی اور بے مثال غور وخوض کے ساتھ ان موضوعات پر سیر حاصل بحثیں سامنے لائے اس طرح انسانی قلب اور نفسیات سے متعلق موضوعات کو اپنی توجہ کا مرکز نہیں بنایا۔ آپ کو احسان، توکل، صبر واستقامت، شکر وقناعت رضا بقضا، محبت، شوق، امید وخوف وغیرہ جیسے موضوعات پر گنی چنی کتابیں ہی مل سکیں گی۔ کچھ کتابیں جو بعض حضرات صوفیہ سے منسوب ہیں ان میں علمی اسلوب کی کمی ہے اور رطب ویابس کا مجموعہ بن کر رہ گئی ہیں جن سے صاف صاف رہنمائی حاصل کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔

یہ کتاب عالم اسلام کے مشہور صاحب قلم علامہ محمد غزالی مرحوم کی کتاب (الجانب العاطفی من الاسلام) کا ترجمہ ہے ــــ کہیں کہیں ضروری تلخیص کے ساتھ ــــ جس میں اسی خلا کو پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور جدید اسلوب میں مذکورہ موضوعات کو بحث کا مرکز بنایا گیا ہے چند موضوعات ان کی دوسری کتاب (رکائز الایمان) سے شامل کر دیے گئے ہیں۔

بارگاہِ الٰہی میں عاجزانہ التماس ہے کہ وہ اس کتاب کو شرف قبولیت سے نوازے اور اسے عام فائدہ کا ذریعہ بنائے۔ وَماتوفیقی الّا باللّٰہ وعلیہ التکلان

ابو مسعود اظہر ندوی
یکم جنوری ۱۹۹۹ء

جامعۃ الہدیٰ
سید احمد شہید نگر، نزد جگدیش پور
ضلع سلطانپور۔ یوپی

وغیرہ کیسے کریں اور حق تعالیٰ کے سامنے ننگے کیونکر ہوں۔ یہ انتہا ہے اور ان کو مجاہدات و ریاضات کی ضرورت نہ ہوتی تھی۔ اور یہ قوت بہ فیضِ نبوی صحابہؓ میں تھی مگر جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے کم۔ اور تابعینؒ میں بھی تھی، مگر صحابہؓ سے کم۔ لیکن تبع تابعینؒ میں یہ قوت بہت ہی کم ہوگئی۔ اور اس کمی کی تلافی کے لیے بزرگوں نے مجاہدات اور ریاضات ایجاد کیے جو ایک زمانہ تک تو محض وسائل غیر مقصودہ کے درجہ میں رہے۔ مگر جوں جوں خیر القرون کو بعد ہوتا گیا ان میں مقصودیت کی شان پیدا ہوتی رہی اور وقتاً فوقتاً ان میں اضافہ بھی ہوتا رہا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دین میں بے حد بدعات علمی وعملی و اعتقادی داخل ہوگئیں۔ محققین صوفیہ نے ان خرابیوں کی اصلاحیں بھی کیں مگر ان کا نتیجہ صرف اتنا ہوا کہ ان بدعات میں کچھ کمی ہوگئی لیکن بالکل ازالہ نہ ہوا۔ مجدد الف ثانی اور سید احمد صاحب قدست اسرارہم کا نام خصوصیت سے لیا اور فرمایا کہ ان حضرات نے بہت اصلاحیں کی ہیں مگر خاطر خواہ فائدہ نہیں ہوا۔ نیز یہ بھی فرمایا کہ حق تعالیٰ نے ان حضرات پر طریقِ سنت منکشف فرمایا تھا کہ طریقِ سنت میں یہ بڑی برکت ہے کہ شیطان کو اس میں رہزنی کا موقع بہت کم ملتا ہے۔ چنانچہ ایک کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ جن امور کا جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اہتمام فرمایا ہے جیسے نماز باجماعت وغیرہ۔ اگر کوئی سختی کے ساتھ ان کی پابندی کرے اور فرائض و واجبات وسنن کا پورا اہتمام کرے۔ تو نہ خود اس کو وسوسہ ہوتا ہے کہ میں کامل بزرگ ہوگیا اور نہ دوسرے اسے ولی اور بزرگ سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی ان امور کا اہتمام کرے جن کا جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اہتمام نہیں فرمایا مثلاً چاشت، صلوٰۃ اوابین وغیرہ کا پابند ہو تو وہ خود بھی سمجھتا ہے کہ اب میں بزرگ ہوگیا اور دوسرے بھی سمجھتے ہیں کہ اب یہ بزرگ ہوگیا۔ اسی تقریر کے دوران میں حضرت نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ شارع علیہ السلام نے احسان کو مطلوب قرار دیا تھا مگر صوفیہ نے بجائے اس کے استغراق کو مقصود بنالیا۔"

(ارواح ثلثہ ص ۲۷۹-۸۰)

تصوف وطریقت کے اس سلسلے کو برباد کرنے میں بڑی حد تک موروثیت کو دخل رہا ہے۔ یعنی جن مرشدینِ کرام نے سخت محنت و ریاضت سے علم حاصل کیا پھر بڑی مشقتوں سے تربیت حاصل کی اور اپنی بے مثال قربانیوں سے مقام حاصل کیا تھا ان کی جانشینی بعد میں بیشتر جگہوں پر وراثت کے طور پر منتقل ہونے لگی اور نااہل لوگ ان کے منصبوں پر فائز ہو کر دین کی خدمت کے بجائے دنیا

بلکہ شاید اپنے روحانی وجود ہی میں کمی محسوس کرنے لگیں جس سے بہت بڑے فتنہ کا دروازہ کھل سکتا ہے۔

تصوّف کی کتابوں میں انسان کے اپنے رب کے ساتھ تعلق اور خود اپنے نفس کے ساتھ تعلق پر کچھ گفتگو ملتی ہے لیکن علمی حقائق کی عکاسی سے زیادہ ان کی حیثیت شعرا کے جذبات اور ذاتی احساسات جیسی ہے اور یہ احساسات چاہے جتنے سچے ہوں۔ علمی خصوصیات کی کمی نے ان کی قیمت کم کر دی ہے کیونکہ علمی انداز عمومیت اور ٹھوس چیزوں پر مبنی ہوتا ہے ذاتی اور خاص احساسات پر نہیں۔ اسی لیے تصوف کی کتابوں میں بہت سی غلطیاں دراندازہو گئی ہیں اور عام آدمی کے لیے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں کیا صحیح ہے کیا غلط اور کیا عام حقیقت ہے اور کیا ذاتی ذوق کی ترجمانی۔ پھر بھی انصاف کی بات یہ ہے کہ ہم یہ اعتراف کریں کہ ان حضرات نے ان پہلوؤں پر توجّہ دی جنھیں دوسروں نے توجّہ کا مرکز نہیں بنایا تھا۔

اگر ان حضرات سے نفس کے باطنی حالات سے متعلق ایمان کے شعبوں پر گفتگو میں غلطیاں ہوئیں تو ان لوگوں کی غلطی اور زیادہ شدید ہے جنھوں نے انھیں نظر انداز ہی کر دیا۔

پھر یہ کہ غلطیاں صرف تصوّف کی کتابوں ہی میں نہیں ہیں ـــــ اگر چہ ان میں زیادہ ہیں ـــــ تفسیر، سیرت اور فقہ کی کتابوں میں بھی ایسی غلطیاں مل جائیں گی جو اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کو پسند نہیں آسکتیں اور جن سے آگاہ کرنے اور جن کا پردہ چاک کرنے کے لیے ائمہ و علماء کوششیں کرتے رہے ہیں۔

ہمارے علمی ورثہ کو ایک بڑے علمی جہاد کی ضرورت ہے جو اسے وہم و گمان کی چیزوں سے پاک کر کے احکام و مسائل میں کتاب و سنّت کی اصل چھاپ کے مطابق کر دے۔

○

تصوّف جن حقائق کو موضوع بناتا ہے انھیں اسلام کے دوسرے حقائق کی طرح کتاب و سنت کی روشنی میں واضح اور روشن کرنے کی ضرورت ہے۔ اور اس راہ میں جن حضرات نے رہنمائی فرمائی ہے ان سے بھی استفادہ کیا جانا چاہیے۔

دو طرح کے لوگوں پر مجھے افسوس ہوتا ہے۔

مقدمہ

ایمان کے بعض شعبوں پر اتنا کافی لکھا گیا ہے کہ انھیں کو پورا اسلام سمجھا جانے لگا جیسے فقہِ عبادات سے متعلق طہارت، نماز اور زکوٰۃ وغیرہ کے بارے میں۔ اور فقہِ معاملات سے متعلق خرید وفروخت اور معاشرہ کے افراد کے درمیان اور خاندان کے افراد کے درمیان تعلقات وغیرہ کے بارے میں۔

ہمارے عظیم دین کے بارے میں کافی علمی تحقیقات کی گئی ہیں اور ان میدانوں کو بہت سارے ائمہ نے اپنے غور وخوض کا مرکز بنایا ہے۔

لیکن نفسیاتی واخلاقی وجذباتی پہلوؤں پر اتنی توجہ نہیں دی گئی۔ وضو وطہارت پر تو آپ کو بے شمار کتابیں مل جائیں گی لیکن اللہ تعالیٰ کی محبت، اخلاص، توکل، تقویٰ اور صبر وشکر وغیرہ پر، جو ایمان کے شعبوں میں سرِ فہرست بلکہ اس کے اہم ارکان ہیں، بہت کم لکھا گیا ہے جبکہ ان معانی کی بہترین تشریح وتوضیح اسلام کی بہترین خدمت ہے۔

بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ عبادات ومعاملات جیسے ظاہری اعمال بھی اسی وقت مکمل ہوتے ہیں جب ان کے پیچھے اندرونی وقلبی جذبے پوری طرح کارفرما ہوں۔

آج جب عصری تعلیمات کی یلغار ہے اسلامی تربیت کے میدان میں ان نفسیاتی وقلبی تعلیمات کی انتہائی ضرورت ہے۔ اگر ہم دلوں کی بہترین تربیت نہ کرسکے اور ایمان کو تمام نظریاتی وقلبی ستونوں پر کھڑا نہ کرسکے تو نئی نسلیں عصری تعلیمات کی یلغار کے اثرات سے بچ نہیں سکیں گی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی اسلام عبادت کا دین بھی ہے جس کی بنیاد دل کی سلامتی، اخلاص، محبت اور ادب سے بہرہ مند ہونے اور خواہشِ نفس، خود غرضی اور خود پسندی سے پاک ہونے پر ہے۔ دونوں پہلوؤں کی ہم آہنگی اور امتزاج کا بہترین نمونہ خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے۔

انسان کے گرم جوشانہ جذبہ کے ساتھ جتنی علمی و نظریاتی کوتاہی ہوگی اسی قدر انسان کا دین ناقص ہوگا۔ بیوقوف مخلص تو ناک پر سے مکھی ہٹانے کے چکر میں خود ناک ہی توڑ ڈالے گا۔ ایمان کے لیے عقل اتنی ہی ضروری ہے جتنی کسی راستہ چلنے والے مسافر کے لیے نگاہ۔ اگر وہ نگاہ ہی سے محروم ہوگا تو کیسے سیدھی راہ پر چل سکے گا؟

اس طرح کے لوگوں نے جذبہ کی شدّت میں بہت سی بدعات ایجاد کرلیں جنھیں وہ نجات کا ذریعہ سمجھنے لگے اسی طرح متعدّد محدود قدر و قیمت کی اطاعتوں کو حد سے بڑھا ڈالا، جبکہ اسلام کے اہم مقاصد اور ذمّے داریاں ان کی نگاہوں سے اوجھل ہوگئیں اور مختلف چیزوں کے درمیان توازن کا انھیں احساس ہی نہیں رہا۔

نفس انسان کو کتنا بڑا دھوکہ دیتا ہے جب ایک عمل کو اس کی نگاہ میں اہم بنا دیتا ہے اور دوسرے عمل کو غیر اہم جبکہ دوسرا عمل زیادہ بہتر اور ضروری ہوتا ہے۔

میں ایک ایسے بڑے افسر کو جانتا ہوں جو ہر وقت ہاتھ میں تسبیح لیے ذکر کیا کرتا تھا۔ اور اسے تقویٰ کی علامت اور اپنے آپ کو اس کی بدولت واصلین میں سے سمجھتا تھا۔ ایک دن ایک جلسہ میں کئی مقررین نے تقریریں کیں وہ صاحب بھی مقررین میں تھے۔ اگلے دن اخباروں نے جب اس کی خبر شائع کی تو ان صاحب کا نام غائب تھا۔ وہ صاحب غصّہ سے ایسے لگتے تھے کہ پاگل ہو جائیں گے۔ نمود و نمائش کے اس شوق کے ساتھ تدین کی یہ شکل صحیح ایمان کے مطابق نہیں ہوسکتی۔ وہ صاحب اپنے نفس کی بیماریوں کا علاج کرنے کے بجائے ذکر واذکار سے غالباً انھیں مزید بڑھاوا دے رہے تھے۔

اس طرح کی بیماریوں کے ساتھ تو کسی عبادت سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔

اسلام کے اصول و فروع کو تفصیلی طور پر سمجھنے اور ان کے مطابق عمل کیے بغیر کوئی بھی جذبہ

ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنے دلوں میں پرجوش جذبہ اور اللہ تعالیٰ اور اس کے رسولؐ کی شدید محبت محسوس کرتے ہیں لیکن کتاب و سنّت کے احکام کے تعلق سے بہت کم علم رکھتے ہیں اور جو کچھ جانتے ہیں اس کے لیے شدید تعصّب رکھتے ہیں۔ مزید جاننے کی کوشش نہیں کرتے۔

دوسری قسم ان لوگوں کی ہے جن کے پاس ذہانت، علم میں وسعت اور بیان کی صلاحیت تو ہوتی ہے وہ بیشتر شرعی احکام میں صحیح اور غلط سمجھتے ہیں مطلوبہ عبادات بھی ادا کر لیتے ہیں لیکن سرد مہر ہوتے ہیں ان کے دلوں میں قساوت اور سختی و خشونت ہوتی ہے۔ دوسروں کی غلطیوں پر بھڑک اٹھتے ہیں اور پھاڑ کھانے کو دوڑتے ہیں اور اس طرح انھیں جو کچھ صحیح علم ہے اس پر تکبر کا اظہار کرتے ہیں۔

بعض جذبہ والے لوگوں پر جہالت و خرافات کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ واضح شرعی احکام کو بھی سمجھنا نہیں چاہتے جبکہ بعض دوسرے لوگ اپنے علم کی بنا پر تکبر کا شکار ہو جاتے ہیں وہ دل کی آفتوں پر توجہ دینے، اللہ تعالیٰ کی محبت میں گرمجوشی اور بندوں پر شفقت سے کام لینے کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے۔

امام ابن قیمؒ بہت پہلے اس کی شکایت کر چکے ہیں کہ بعض مدرس، مفتی اور قاضی ایسے ہیں جن کے علم کے بارے میں تو کوئی اعتراض نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کی طبیعت پر شدّت و خشونت اور دل کی قساوت کا غلبہ ہے۔

ایک کامل مسلمان کا ذہن اور قلب دونوں روشن ہونے چاہئیں اور اس کی نگاہ ظاہری و باطنی دونوں اعتبار سے تیز ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق اور لوگوں کے ساتھ معاملہ میں اس کے نظریہ اور جذبہ دونوں کو ہم آہنگ ہونا چاہیے یہاں تک کہ یہ پتہ لگنا مشکل ہو کہ اس کی عقل زیادہ تیز ہے یا اس کا دلی جذبہ زیادہ طاقتور ہے۔

یہ دونوں صفتیں خود اسلام ہی سے ماخوذ ہیں کیونکہ اسلام اپنے عقائد ذہنی صحت کے لحاظ سے ایسی فکری بنیادوں پر قائم کرتا ہے جو حساب اور انجینئرنگ کی بدیہی معلومات کی طرح واضح ہوں۔ عام معاملات اور نئے مسائل کے تعلق سے اس دین کے عقلی ستون بالکل ٹھوس ہیں۔

اسلام، ایمان اور احسان

حضرت عمرؓ سے ایک بہت مشہور روایت ہے۔

عَنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُ قَالَ: بَيْنَمَا نَحْنُ جُلُوسٌ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ ذَاتَ يَوْمٍ، إِذْ طَلَعَ عَلَيْنَا رَجُلٌ شَدِيْدُ بَيَاضِ الثِّيَابِ، شَدِيْدُ سَوَادِ الشَّعْرِ، لَا يُرٰى عَلَيْهِ أَثَرُ السَّفَرِ، وَلَا يَعْرِفُهُ مِنَّا أَحَدٌ، حَتّٰى جَلَسَ إِلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَأَسْنَدَ رُكْبَتَيْهِ إِلٰى رُكْبَتَيْهِ، وَوَضَعَ كَفَّيْهِ عَلٰى فَخِذَيْهِ، وَقَالَ: يَا مُحَمَّدُ أَخْبِرْنِيْ عَنِ الْإِسْلَامِ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ: اَلْإِسْلَامُ: أَنْ تَشْهَدَ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا اللّٰهُ، وَأَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ، وَتُقِيْمَ الصَّلٰوةَ، وَتُؤْتِيَ الزَّكٰوةَ

حضرت عمرؓ بن الخطاب سے روایت ہے کہ ایک دن ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے ہوئے تھے کہ ہمارے پاس ایک شخص آیا جس کے کپڑے انتہائی سفید اور بال انتہائی سیاہ تھے اس پر سفر کا کوئی اثر نہیں معلوم ہوتا تھا نہ ہم میں سے کوئی اسے جانتا تھا۔ یہاں تک کہ وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے گھٹنوں سے اپنے گھٹنے ملا کر بیٹھ گیا اور اپنی دونوں ہتھیلیاں اپنی دونوں رانوں پر رکھ لیں پھر کہا: "اے محمد! مجھے اسلام کے بارے میں بتائیے" رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اسلام یہ ہے کہ یہ گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اس کے رسول ہیں اور نماز قائم کرو، زکاۃ دو، رمضان کے روزے

بے وزن ہی رہے گا۔

جذبہ کی سچائی، علمی کوتاہی اور دین میں اپنی رائے اور خواہش نفس سے کوئی بات کہنے کا عذر نہیں بن سکتی۔ اسلام کے سرچشمے واضح ہیں۔ انھیں سے احکام لیے جا سکتے ہیں کسی بھی انسان کو ان میں کمی زیادتی کی اجازت نہیں۔

بعض متصوفین کو صحیح حدیث پر ضعیف یا باطل حدیث کو ترجیح دیتے دیکھا جاتا ہے کبھی وہ ایسے فقہی اصولوں کو مانتے ہیں جن کا اصولِ فقہ میں کہیں نام و نشان بھی نہیں۔ کبھی قرآن کریم کی عجیب وغریب تفسیر بیان کرتے ہیں جن کا حدیث میں دور دور نشان نہیں ملتا۔

اس طرح کی چیزیں ہرگز قابلِ قبول نہیں ہو سکتیں کیونکہ ان سے فتنوں کے دروازے کھلتے ہیں۔

دوسری طرف علماء جنھوں نے دینی احکام کو بخوبی پڑھ رکھا ہے، احکام کے مسائل اور تفصیلات تو بتاتے ہیں لیکن ان کی روح پر مشکل سے توجہ دیتے ہیں۔ مثلاً نماز کے فرائض، واجبات، سنن وغیرہ تو تفصیل سے بتائیں گے لیکن نماز کی روح پر زیادہ زور نہیں دیں گے۔

بعض حضرات قرآن کی تفسیر بھی کریں گے تو زبان کے قواعد، احکام، الفاظ کی بلاغت وغیرہ پر تو زیادہ زور دیں گے لیکن قرآن کریم کے پیغام کی روح کیا ہے اس پر کم ہی توجہ دیں گے جبکہ تفسیر کی بنیادی چیز وہی ہے

اس کتاب میں ہم نے اسلام کے بعض ایسے ہی پہلوؤں کی قرآن وسنّت کی روشنی میں تشریح کرنے کی کوشش کی ہے جن پر علمی انداز میں کم گفتگو کی گئی ہے۔

وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ اَوَّلًا وَّ آخِرًا

محمد غزالی

گیا۔ آپؐ کچھ دیر سوچنے کے انداز میں بیٹھے رہے
پھر فرمایا عمرؓ! تم پوچھنے والے کو جانتے ہو؟ میں نے عرض
کیا اللہ اور اس کے رسول بہتر جانتے ہیں آپؐ نے فرمایا
یہ جبریلؑ تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے (مسلم۔۱)

اس حدیث میں اسلام، ایمان اور احسان ایک ہی حقیقت کو مختلف پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں اور یہ پہلو اس حقیقت کو واضح و روشن کرنے میں ایک دوسرے کے مددگار ہیں اسی لیے حدیث کے آخر میں یہ الفاظ مذکور ہیں کہ "یہ جبریل تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے"۔

وہ دین کیا ہے جس کی وضاحت کرنے حضرت جبریلؑ آئے تھے؟

اگر ہم ظاہری سلوک اور عمل کے اعتبار سے دیکھیں تو وہ اسلام ہے۔

اگر دل کو آمادۂ کار کرنے والے یقین و عقیدہ کے اعتبار سے دیکھیں تو وہ ایمان ہے اور اگر واضح ایمان اور صالح عمل کے امتزاج و آمیزش کی صورت میں کمالِ ادائگی کے اعتبار سے دیکھیں تو وہ احسان ہے۔

یہ سارے مفہوم ایک دوسرے سے جدا نہیں کیے جا سکتے۔

ایک سرسبز و شاداب درخت کو دیکھیے۔

اس کا تنا قریب و دور کی شاخوں کو غذا پہنچاتا ہے۔

اس کے پتے سایہ فراہم کرتے ہیں اور ٹہنیاں پھل۔

پھر اس درخت کی شادابی خود کتنی دلآویز و خوشگوار ہوتی ہے۔

لیکن یہ مختلف مناظر ذہن میں اور اس کے باہر، درخت کی مکمل صورت اور اس کی وحدت پر اثر انداز نہیں ہوتے۔

جن عناصر سے دین کی حقیقت تشکیل پاتی ہے کبھی ان کے درمیان باہمی ربط کمزور پڑ جاتا ہے تو اسلام ایک گرد آلود عمل بن کر رہ جاتا ہے جس کے پیچھے ایمان کی قوت جلوہ گر نظر نہیں آتی، یا ایمان مریض ہو جاتا ہے اور ضمیر میں زندگی کی روح نہیں پھونک پاتا۔ یا احسان محض گمان بن کر رہ جاتا ہے۔ حق اور اس کی بالادستی اس سے نمایاں نہیں ہو پاتی۔

وَتَصُوْمَ رَمَضَانَ وَتَحُجَّ الْبَيْتَ إِنِ اسْتَطَعْتَ إِلَيْهِ سَبِيْلاً، قَالَ: صَدَقْتَ قَالَ: فَعَجِبْنَا لَهُ يَسْأَلُهُ وَيُصَدِّقُهُ قَالَ: فَأَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِيْمَانِ؟ قَالَ: اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُؤْمِنَ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ قَالَ: صَدَقْتَ: قَالَ فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ الْاِحْسَانِ. قَالَ اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ، فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ۔ قَالَ: صَدَقْتَ۔ قَالَ: فَاَخْبِرْنِيْ عَنِ السَّاعَةِ قَالَ مَالْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ، قَالَ: فَاَخْبِرْنِيْ عَنْ اَمَارَاتِهَا، قَالَ: اَنْ تَلِدَ الْاَمَةُ رَبَّتَهَا، وَاَنْ تَرَى الْحُفَاةَ الْعُرَاةَ الْعَالَةَ رِعَاءَ الشَّاءِ يَتَطَاوَلُوْنَ فِي الْبُنْيَانِ۔ ثُمَّ انْطَلَقَ۔ فَلَبِثْتُ مَلِيًّا ثُمَّ قَالَ لِيْ، يَا عُمَرُ، اَتَدْرِيْ مَنِ السَّائِلُ: قُلْتُ: اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ، قَالَ: هٰذَا جِبْرِيْلُ اَتَاكُمْ يُعَلِّمُكُمْ دِيْنَكُمْ۔ (مسلم۔ ۱)

رکھو اور حج بیت اللہ کرو اگر وہاں تک پہنچ سکتے ہو۔ اس نے کہا آپ نے سچ کہا، حضرت عمرؓ کہتے ہیں، ہمیں حیرت ہوئی کہ وہ شخص آپ سے پوچھ بھی رہا ہے اور آپ کی تصدیق بھی کر رہا ہے پھر اس شخص نے کہا اچّھا مجھے ایمان کے بارے میں بتائیے آپ نے فرمایا: یہ کہ ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور قیامت کے دن پر اور تقدیر پر اس کے خیر و شر کے ساتھ ایمان لاؤ، اس شخص نے کہا، آپ نے سچ فرمایا۔ پھر کہا اچھا مجھے احسان کے بارے میں بتائیے آپ نے فرمایا احسان یہ ہے، کہ اللہ کی عبادت اس طرح کرو گویا اسے دیکھ رہے ہو اور اگر ایسا ممکن نہ ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔ اس شخص نے کہا آپ نے سچ فرمایا۔ پھر کہا اچھا قیامت کے بارے میں بتائیے۔ آپؐ نے فرمایا جس سے پوچھا جا رہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ اس کے بارے میں نہیں جانتا اس نے کہا اچھا مجھے اس کی علامتوں کے بارے میں بتائیے آپ نے فرمایا قیامت کی علامتوں میں سے یہ ہیں، جب لونڈی اپنے مالکن کو جننے لگے۔ جب تم ننگے بھوکے لوگوں کے رحم و کرم پر جینے والوں اور بکریاں چرانے والوں کو دیکھو کہ (عالیشان) عمارتیں بنانے میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ پھر وہ شخص چلا

هُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۔ (النحل ۲ - ۳)

ہدایت اور بشارت ان ایمان لانے والوں کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور پھر وہ ایسے لوگ ہیں جو آخرت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔

محسنین کی صفت بیان فرماتا ہے:

تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ هُدًى وَّرَحْمَةً لِّلْمُحْسِنِيْنَ ۙ الَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ (لقمان ۲-۴)

یہ کتاب حکیم کی آیات ہیں۔ ہدایت اور رحمت نیکو کار لوگوں کے لیے جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

مومنین اور محسنین دونوں کی صفات وہی بیان کی گئیں۔

آپ جانتے ہیں کہ حدیث میں اسلام کے جو ارکان بتائے گئے ہیں نماز روزہ ان میں نمایاں ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ (الانعام ۱۶۲-۱۶۳)

کہو میری نماز، میرے تمام مراسم عبودیت، میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا ہوں۔

اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَاَنْ اَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ۚ (یونس ۱۰۴-۱۰۵)

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں ایمان لانے والوں میں سے ہوں۔ اور مجھ سے فرمایا گیا ہے کہ یکسو ہو کر اپنے آپ کو ٹھیک ٹھیک اس دین پر قائم کر دے۔

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۙ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ (الزمر ۱۱-۱۲)

ان سے کہو کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ دین کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی بندگی کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں خود مسلم بنوں۔

وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ ۔

اس شخص سے بہتر اور کس کا طریق زندگی ہو سکتا ہے جس نے اللہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا اور وہ

ہاں کبھی کبھی انسانی زندگی میں ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی خزاں رسیدہ درخت ہو جو بے برگ و بار کھڑا رہ جائے، نہ اس کی شادابی نگاہوں کو سرور بخشے نہ اس کے پھل اور پتے ہی کوئی فائدہ پہنچائیں۔

لیکن خزاں رسیدگی کی یہ حالت عام فطری حالت نہیں ہوا کرتی۔

یہ حدیث دین کی صحیح حقیقت واضح کرتی ہے۔

ایمان اگر صحیح ہے تو لازماً عمل پیدا کرے گا۔

عمل اگر صحیح ہوگا تو لازماً ایمان پر مرکوز ہوگا۔

اور احسان اگر صحیح ہوگا تو اس کا سرچشمہ یقیناً ایمان راسخ اور عملِ کامل ہوگا۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ حضرت جبریلؑ جو دین سکھانے آئے تھے وہی اسلام ہے۔

اور اسلام تبھی صحیح ہوسکتا ہے جب اس میں پوشیدہ روح یا اسے متحرک کرنے والا ایندھن سچا ایمان ہو۔ اگر یہ یقین و ایمان موجود ہے تو پھر اللہ تعالیٰ سے تعلق کی مضبوطی اور اس کی دائمی نگرانی و موجودگی کے احساس کی اعلیٰ مثال سامنے رہے گی اور یہ مقام احسان ہے۔

کچھ لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اسلام، ایمان اور احسان تین الگ الگ درجے ہیں جن کے درمیان فاصلے ہیں یعنی یہ کہ اسلام کبھی ایمان سے الگ بھی ہوسکتا ہے یا ایمان کبھی اسلام سے الگ بھی ہوسکتا ہے۔

پھر نئے دور میں کچھ لوگ مضحکہ خیز طور پر یہ بھی گمان کرنے لگے کہ احسان کے مرتبے تک مقررہ عقائد پر اعتقاد اور مشروع فرائض کی ادائیگی کے بغیر بھی پہنچا جاسکتا ہے۔

اس طرح یہ تینوں الفاظ ایک دین کے بجائے مختلف حقائق کی علامت تصور کیے جانے لگے۔ یہ بڑی گمراہی ہے۔

قرآن کریم تو یہ رہنمائی کرتا ہے کہ یہ مکمل دین کی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے لازم و ملزوم ہیں۔ مختلف الفاظ و عبارات سے محض اسی ایک حقیقت کے روشن پہلوؤں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

دسیوں آیات میں اس دین کی صفت اور اس کی تعلیمات بیان کی گئی ہیں۔ مومنین کی صفت بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَالْكِتَابِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا۔ (النساء ۱۳۶)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو ایمان لاؤ اللہ پر اور اس کے رسول پر اور اس کی کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے۔ اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روز آخرت سے کفر کیا وہ گمراہی میں بھٹک کر بہت دُور نکل گیا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيُرِيْدُوْنَ اَنْ يُّفَرِّقُوْا بَيْنَ اللّٰهِ وَرُسُلِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَكْفُرُ بِبَعْضٍ ۙ وَّيُرِيْدُوْنَ اَنْ يَّتَّخِذُوْا بَيْنَ ذٰلِكَ سَبِيْلًا ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ حَقًّا ۚ (النساء ۱۵۰)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسول سے کفر کرتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں ہم کسی کو مانیں گے کسی کو نہ مانیں گے اور کفر و ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ سب پکے کافر ہیں۔

ان آیات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ایمان سے متعلق چیزیں بہت سی ہیں اور ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ایمان کے عملی اثرات ـــــ جو دین کا مغز ہیں ـــــ کو بھی ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جاسکتا۔

ایک حصّہ پر ایمان اور دوسرے حصّہ سے انکار مکمل انکار سمجھا جائے گا۔

اسی طرح سرکشی کی نیت سے ایمان لانا اور اللہ تعالیٰ کے سامنے سپر اندازی سے انکار کرنا بھی مکمل کفر ہے۔

اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذَا دُعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُوْلُوْا سَمِعْنَا وَ

ایمان لانے والوں کا کام تو یہ ہے کہ جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف بلائے جائیں۔ تاکہ رسول ان کے مقدمے کا فیصلہ کرے تو وہ

(النساء ۱۲۵) نیکوکار ہے۔

وَمَنْ يُسْلِمْ وَجْهَهُ إِلَى اللّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى (لقمان ۲۲)

جو شخص اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دے اور عملاً وہ نیک ہو اس نے فی الواقع ایک بھروسے کے قابل سہارا تھام لیا۔

بَلٰى مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (البقرہ ۱۱۲)

حق یہ ہے کہ جو بھی اپنی ہستی کو اللہ کی اطاعت میں سونپ دے اور عملاً نیک روش پر چلے اس کے لیے اس کے رب کے پاس اس کا اجر ہے اور ایسے لوگوں کے لیے کسی خوف یا رنج کا کوئی موقع نہیں۔

ان ساری آیات میں اسلام و احسان کا ذکر اس طور پر آیا ہے کہ دل میں ایمان کا وجود لازماً مضمر ہے ورنہ نہ اسلام کا تصور کیا جا سکتا ہے نہ احسان کا۔ ان آیات میں جہاں اصل دین کے ظاہری پہلو کا ذکر کیا گیا ہے وہیں دوسری آیات میں دین کی روح و حقیقت نمایاں کی گئی ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا (الانفال ۲)

سچے اہل ایمان تو وہ لوگ ہیں جن کے دل اللہ کا ذکر سن کر لرز جاتے ہیں اور جب اللہ کی آیات ان کے سامنے پڑھی جاتی ہیں تو ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔

إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ آمَنُوا بِاللّٰهِ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ (الحجرات ۱۵)

حقیقت میں تو مومن وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے پھر انھوں نے کوئی شک نہ کیا اور اپنی جانوں اور مالوں سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔

وَالَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالَّذِينَ آوَوْا وَنَصَرُوا أُولٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا (الانفال ۷۴)

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے اللہ کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جدّوجہد کی اور جنھوں نے پناہ دی اور مدد کی وہی سچے مومن ہیں۔

بھی انھیں اپنی جگہ سے ایک انچ نہیں ہٹا سکتیں۔

اور ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں کا یقین اتنا پختہ نہیں ہوتا۔

ایمان جب معرفت و تصدیق کا نام ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ معرفت صحیح ہو ورنہ اس کی تصدیق کی بھی کوئی قیمت نہیں ہوگی۔

بہت سی انسانی نسلیں اللہ تعالیٰ کو جانتی ہی نہیں اور ایسے لوگ بھی ہیں جن کی معرفت غلطیوں اور کج فہمیوں سے پر ہوتی ہے۔

پہلی قسم کے لوگ الوہیت کی حقیقت ہی کے منکر ہیں جیسے اشتراکی وجود پرست اور اسی طرح کے دوسرے ملحد۔ دوسری قسم کے لوگ الوہیت کا اعتراف تو کرتے ہیں لیکن ان کا تصور حقیقت کے مخالف ہوتا ہے اور وہ اس کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو شایانِ شان نہیں ہوتیں۔ عام مشرکین بت پرست اور حق سے بھٹکے ہوئے اہلِ کتاب انھیں میں شامل ہیں۔

ہمارے نزدیک ایمان اللہ تعالیٰ کے بارے میں صحیح علم کو قابلِ قبول تصدیق کی روح قرار دیتا ہے۔

قرآن کریم میں ایسی آیات بھری ہوئی ہیں جو بندوں کے لیے ان کے پروردگار کی اس طرح صفت بیان کرتی ہیں کہ گمراہی و انحراف کی صورتیں ذہنوں سے نکل جائیں اور حق اپنے صحیح مقام پر جلوہ گر نظر آئے۔ مثلاً یہ آیت لیجیے:

اَللّٰہُ لَآ اِلٰـہَ اِلَّا ھُوَ ج اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ج لَا تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ط مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِہٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَلَا

اللہ وہ زندہ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اسے اونگھ لگتی ہے زمین اور آسمانوں میں جو کچھ ہے اسی کا ہے کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی واقف ہے اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفتِ ادراک میں نہیں آسکتی۔ اِلّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی

اَطَعۡنَا (النور ۵۱) کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

لہٰذا یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دین کی حقیقت ایک ہی ہے اور اسلام، ایمان اور احسان کی صفات اس کے مختلف پہلوؤں کی تشریح کی حیثیت رکھتی ہے الگ الگ مرتبے اور مرحلے نہیں ہیں اور اس دین بلکہ تمام ادیان اور انسانی فطرت سلیمہ کا نام و عنوان اسلام ہی ہے۔

ایمان کیا ہے؟

ایمان نام ہے یقین کی حد تک پہنچے ہوئے یقین یا قطعی علم کا۔

جب آپ یہ کہیں کہ میں مثلاً قاہرہ کے وجود پر یقین رکھتا ہوں تو اس کے دو مفہوم ہوں گے ایک مفہوم تو ذہنی ہے یعنی یہ کہ آپ اس شہر کے وجود سے آگاہ ہیں۔

دوسرا مفہوم دل سے تعلق رکھتا ہے یعنی یہ کہ آپ اپنے اس علم میں کسی شک و تردد کا شکار نہیں بلکہ اس کی مکمل تصدیق کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان کا مطلب بھی نظریاتی و قلبی دونوں ہے۔

جب آپ یہ کہتے ہیں کہ میں اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس برتر وجود کو جانتے ہیں اور اس میں کسی شک و تردد میں مبتلا نہیں، بلکہ آپ کا دل اس کی تصدیق سے بھرا ہوا ہے۔

ظاہر ہے دلوں میں ایمان کے حقائق اسی فرق کے ساتھ جاگزیں ہوں گے جتنا علم اور پہچان تنگی اور وسعت اور تصدیق کی گہرائی و گیرائی میں فرق ہوگا۔

ایسے عارفین بھی ہوئے ہیں جن کی معرفت نہایت روشن و تابناک ہوتی ہے جیسے انھوں نے بذات خود ذات پاک کو دیکھا اور پرکھا ہو۔

اَلرَّحۡمٰنُ فَسۡـَٔلۡ بِهٖ خَبِيۡرًا ○ (الفرقان - ۵۹) رحمٰن اس کی شان بس کسی جاننے والے سے پوچھو۔

لیکن معرفت اس سے کم تر درجے کی بھی ہوتی ہے۔

ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے دلوں میں ایمان و یقین اتنا پختہ ہوتا ہے کہ تیز آندھیاں

وَّلَا نَفْعًا وَّ لَا يَمْلِكُوْنَ مَوْتًا وَّلَا حَيٰوةً وَّلَا نُشُوْرًا۔ (الفرقان - ۳)

اختیار نہیں رکھتے جو نہ مار سکتے ہیں نہ جلا سکتے ہیں نہ مرے ہوئے کو پھر اٹھا سکتے ہیں۔

اسلام کے پیغمبرؐ جو انسانیت کی بلند ترین چوٹی کی حیثیت رکھتے ہیں جب اللہ تعالیٰ کو پکارتے ہیں تو اسی حقیقت کا اظہار کرتے ہیں۔

"میرے پروردگار! میں تیرا بندہ ہوں اور تیرے بندے اور تیری بندی کا فرزند ہوں۔ میں تیرے قبضے میں ہوں، میری پیشانی تیرے ہاتھ میں ہے میرے تعلق سے تیرا فیصلہ نافذ ہونے والا ہے اور میرے بارے میں تیرا فیصلہ سرتاسر عدل ہوگا۔" (ترمذی)

۲۔ حَیٌّ وَ قَیُّوْمٌ۔ زندہ مخلوقات میں کوئی ایسی چیز نہیں جو ان کے لیے زندگی لازم کرے زندگی تو انھیں باہر سے عطا کی جاتی ہے اور پھر ایک دن ان سے جدا ہو جاتی ہے اور دوبارہ تبھی لوٹ کر آئے گی جب اللہ تعالیٰ کی مشیئت ہوگی۔ اللہ تعالیٰ ایسا زندہ جاوید ہے جس کی زندگی کی کوئی ابتدا اور انتہا نہیں۔ زندگی اس کی ازلی و ابدی صفت ہے خالق اور مخلوق کی زندگی میں یہی فرق ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نبیؐ سے فرماتا ہے:

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّ اِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ۝ (الزمر ۳۰)

اے نبی تمہیں بھی مرنا ہے اور ان لوگوں کو بھی مرنا ہے۔

دائمی زندگی کی صفت تو اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہے۔

صفتِ قیومی کا مطلب یہ ہے کہ وہ تمام کائنات اور مخلوقات کو حرکات و سکنات عطا کرتا ہے اور ان کے معاملات کی مکمل نگرانی کرتا ہے اس لیے تمام کائنات و مخلوقات اس کی انتہائی محتاج ہیں جبکہ وہ ان سے بالکل بے نیاز ہے۔

آیات و احادیث سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ آسمانوں اور زمین اور ان میں موجود تمام چیزوں کی نگرانی کرتا ہے اور اس طرح کہ خالق کے ہاتھ سے معاملات کی باگ ڈور کا ادھر ادھر ہونا، یا اس کے فیصلے کے برخلاف کچھ ہونا ناممکن و محال ہے کیونکہ ہر چیز اپنے وجود و بقا اور اپنی نقل و حرکت میں اللہ تعالیٰ پر انحصار کرتی ہے۔

يَـئُودُهٗ حِفۡظُـهُمَا وَهُـوَ الۡـعَلِيُّ الۡـعَظِـيۡمُ ۝

(البقرہ ۲۵۵)

ان کو دینا چاہیے۔ اس کی حکومت آسمانوں زمینوں پر چھائی ہوئی ہے ان کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔

یہ آیت جو آیت الکرسی کے نام سے مشہور ہے اور جس کی فضیلت میں حدیثیں وارد ہیں

اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے متعلق دس مربوط جملوں پر مشتمل ہے۔

۱۔ اَللّٰهُ لَاۤ اِلٰـهَ اِلَّا هُـوَ: کائنات میں کوئی بھی بندگی کے مرتبے سے آگے نہیں بڑھ

سکتا اللہ تعالیٰ کے سوا ہر شے اس کی بندہ ہے آسمانوں اور زمین میں الوہیت تنہا اسی ذات

پاک کے ساتھ خاص ہے۔

اب جو خود اپنے آپ کو معبود سمجھے وہ جھوٹا ہے اور جسے لوگ معبود بنائیں وہ اس کے

بارے میں جھوٹ بولیں گے۔ ایسے دور بھی گزرے ہیں جب لوگوں نے جمادات اور جانوروں تک

کو معبود بنا لیا لیکن ذہنی و نفسیاتی انحطاط کے ان اثرات سے انسانیت کو نجات حاصل

کرنی چاہیے۔

آج تک یہ گمراہی جاری ہے کہ بعض نیک لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ معبود بنایا جاتا ہے

اور یہ دلیل دی جاتی ہے کہ ان کا سرچشمہ ذات الٰہی ہی ہے اور ذات الٰہی ان میں حلول کیے

ہوئے ہے۔

اسلام نے اس گمراہی کے خلاف شدید جنگ کی اور اس پر زور دیا کہ بندوں کے لیے

معبود کی سطح تک پہنچنا ناممکن ہے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ کے لیے یہ ممکن نہیں کہ وہ انسانوں کے درجے

تک اتر آئے۔

اللہ تعالیٰ تو وہ ہے جس نے باقی سب کو پیدا کیا، زندگی دی اور گود سے گور تک سارا

انتظام کیا۔

وَاتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِهٖۤ اٰوۡلِيَاۤءَ لَا يَخۡلُقُوۡنَ شَيۡـئًا وَّهُمۡ يُخۡلَقُوۡنَ وَلَا يَمۡلِكُوۡنَ لِاَنۡفُسِهِمۡ ضَرًّا

لوگوں نے اسے چھوڑ کر ایسے معبود بنا لیے جو کسی چیز کو پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے جاتے ہیں جو خود اپنے لیے بھی کسی نفع یا نقصان کا

اور اگر انسان ہیں تو یہ انسان اس کی ملکیت ہیں جس نے رحم مادر میں ان کی صورت گری کی اور ان کے دلوں کو زندگی کی دھڑکن بخشی اگر وہ روز و شب کے کسی لمحہ میں ان کے دلوں کی دھڑکنیں بند کر دینا چاہے تو اسے کون روکنے والا ہے۔

روئے زمین پر ملکیت کا تصوّر محض مجازی ہے کچھ لوگ ظاہری اور وقتی طور پر کچھ حصّے کے مالک بن جاتے ہیں اور اس پر سرکشی کرنے لگتے ہیں پھر اچانک موت کا فرشتہ آتا ہے اور وہ خالی ہاتھ چلے جاتے ہیں۔ اپنی نام نہاد ملکیت اس حقیقی مالک کے لیے چھوڑ دینی پڑتی ہے جو آسمانوں اور زمین کا مالک و وارث ہے۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُم مَّا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ۔ (الانعام ۹۴)

لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی بار اکیلا پیدا کیا تھا۔ جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو۔

۵۔ مَن ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِندَهُ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ

اسلام کا عام قاعدہ ہے کہ مشرک و ملحد کے لیے کوئی شفاعت نہیں ہو سکتی۔ کسی فرشتے یا رسول کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اسے اللہ تعالیٰ کے بارگاہ میں لے جا کر یہ سفارش کرے کہ فلاں کو معاف کر دیجئے۔

نجات کی بنیاد ایمان اور عملِ صالح ہی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُم مِّن قَبْلِ أَن يَأْتِيَ يَوْمٌ لَّا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ۝ (البقرہ ۲۵۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو جو کچھ مال و متاع ہم نے تم کو بخشا ہے اس میں سے خرچ کرو قبل اس کے کہ وہ دن آئے جس میں نہ خرید و فروخت ہوگی نہ دوستی کام آئے گی نہ سفارش چلے گی اور ظالم اصل میں وہی ہیں جو کفر کی روش اختیار کرتے ہیں۔

وہ مشرکین و مجرمین کے انجام کی خبر دیتے ہوئے فرماتا ہے:

إِنَّهُ مَن يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ

جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس

اِنَّ اللّٰہَ یُمْسِکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَاۚ وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَکَھُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِہٖ ؕ (فاطر ۴۱)

حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا تھامنے والا نہیں ہے۔

حی وقیوم وحدانیت کی صفات کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ شرک کی قطعی نفی ہو جائے اور یہ واضح ہو جائے کہ اس یگانہ ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں۔

۳۔ لَاتَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلَا نَوْمٌ ؕ

اونگھ نیند کے آغاز کے وقت پلکوں پر طاری ہوتی ہے اور سونا مکمل نیند کو کہتے ہیں۔

مراد یہ ہے کہ ہم انسانوں پر غفلت کی گھڑی طاری ہوتی ہے اور ہم اپنے آپ اور اپنے گرد و پیش سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔

بلکہ بیداری کی حالت میں بھی ہماری ذہنی چستی و بیداری محدود ہوتی ہے۔ تھکن کے وقت یہ بیداری اور بھی کمزور ہو جاتی ہے اور غلطیاں ہونے لگتی ہیں۔

لیکن پروردگار عالم کو کوئی چیز دوسری چیز سے مشغول و غافل نہیں کر سکتی زمین کے کسی معاملہ کے اہتمام سے آسمان کے کسی معاملے کے اہتمام پر کوئی اثر نہیں پڑتا اسے تھکن اور اکتاہٹ نہیں لاحق ہوتی نہ سہو و غفلت سے عرش و فرش کا ایک ذرہ بھی اس کی گرفت سے نکل سکتا ہے۔

۴۔ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ...

اللہ تعالیٰ کی ملکیت و بادشاہت بے حد وسیع ہے پوری کائنات اپنی تمام تر بلندیوں اور پستیوں کے ساتھ اسی کی ملکیت ہے آسمانوں کے افق اور زمین کی گہرائیاں اسی کی ملکیت کے حدود میں ہیں۔

جنھیں بے خبر لوگ اللہ کا شریک سمجھتے ہیں ان کا تو اس کائنات میں ایک ذرّہ بھی نہیں ہے۔ اگر وہ بت ہیں جنھیں نقاشوں نے انھیں گھڑ کر تیار کیا ہے تو یہ تو خود ان نقاشوں کے اختیار میں ہیں ان کے بھی مالک نہیں ہیں۔

لَہٗ قَوۡلًا۔ (طٰہٰ ۱۰۹) سُننا پسند کرے۔

کوئی شخص کہہ سکتا ہے کہ تب اس سفارش کی ضرورت یا اس کی قیمت کیا ہے؟

جواب یہ ہے کہ اس سفارش کی نوعیت آخرت میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان لوگوں کی ایک طرح سے عزت افزائی کی ہے جنھیں دنیا میں اللہ تعالیٰ کی راہ میں ذلیل کیا گیا تھا اور تکلیفیں پہنچائی گئی تھیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اتنی قدر افزائی فرمائے گا کہ اس کے یہ بندے محسوس کرلیں کہ ان کے پروردگار کے یہاں ان کا کتنا مرتبہ ومقام ہے۔ پھر لوگوں کو ان کے ذریعہ جو نعمت مل رہی ہے اس کی وجہ سے ان کی محبت ان کے دلوں میں اور بڑھ جائے۔

ظاہر ہے یہ شفاعت بھی عدل وانصاف کے اصولوں کو پامال نہیں کرتی نہ حساب کتاب کے ترازو کو معطل کرتی ہے۔ نہ ہی پہلے سے نیکو کار کو اس کی ضرورت ہوگی اور نہ ہی حق سے منحرف کو اس سے کوئی فائدہ پہنچے گا۔

۶۔ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ۔

اللہ تعالیٰ سے زمین وآسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں اس کے لیے ماضی وحال ومستقبل کا علم یکساں ہے گویا کائنات جب سے پیدا ہوئی ہے اور جب اپنے انجام تک پہنچے گی ایک ہی صفحہ ہے جس میں اول وآخر اور قریب ودور سب برابر ہیں۔

ظاہر ہے خالق نے جو کچھ پیدا کیا ہے اسے جانتا ہے۔ یہ گمان بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کسی شخص نے اس کے پیچھے کوئی چیز بنالی ہے اور وہ اس سے ناواقف ہے۔

کسی شئے کو عدم سے وجود میں لانا صرف اللہ تعالیٰ ہی کے بس میں ہے۔

انسانی جدوجہد کا دائرۂ کار مادہ ہے اور اس میں بھی جو تبدیلیاں ہوتی ہیں وہ بھی بغیر مشیئت الٰہیہ کے ممکن نہیں۔

اس لیے جب یہ کہا جائے کہ فلاں چیز کو اللہ تعالیٰ نہیں جانتا تو اس کا ضمنی مطلب یہی ہوتا کہ اس چیز کا وجود ہی نہیں۔

وَیَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَا یَضُرُّهُمۡ وَلَا یَنۡفَعُهُمۡ وَیَقُوۡلُوۡنَ	یہ لوگ اللہ کے سوا ان کی پرستش کررہے ہیں جو ان کو نہ نقصان پہنچاسکتے ہیں نہ نفع، اور

حَرَّمَ اللّٰہُ عَلَیْہِ الْجَنَّۃَ وَمَاْوٰہُ النَّارُ ط وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ہ (المائدہ ۷۲)

پر اللہ نے جنت حرام کردی اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہیں۔

وَاِنْ تَدْعُ مُثْقَلَۃٌ اِلٰی حِمْلِھَا لَا یُحْمَلْ مِنْہُ شَیْءٌ وَّلَوْ کَانَ ذَا قُرْبٰی ط (فاطر ۱۸)

اور اگر کوئی لدا ہوا نفس اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے پکارے گا تو اس کے بار کا ایک ادنیٰ حصہ بھی ہٹانے کے لیے کوئی نہ آئے گا۔ چاہے وہ قریب ترین رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

ایسا ہو سکتا ہے کہ جو لوگ اپنے اعمال کی بدولت نجات کے مستحق ہوں مزید فضل فرما کر ان کے درجے اور بلند کر دیے جائیں۔

یا جو لوگ نجات کے حصول کے قریب تک پہنچ جائیں لیکن پہنچ نہ سکیں انھیں کسی قدر معافی سے نواز دیا جائے اور اس طرح وہ کامیابیوں سے ہمکنار ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ اس سلسلے میں ظاہری سبب رسولوں اور صالحین کی سفارش کو بنا دے۔

لیکن اس شفاعت کی نوعیت یہ نہیں ہے کہ رسول یا صالحین اللہ تعالیٰ پر کوئی دباؤ ڈال سکتے ہیں۔ یا اللہ تعالیٰ جسے سزا دینا چاہے اسے بچا سکتے ہیں۔

ایسا ہرگز نہیں۔ کوئی فرشتہ یا نبی اس طرح کی جرأت بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو اللہ کی اجازت سے سفارش کریں گے اور وہ بھی اس شخص کے لیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ کی مرضی ہو۔

لَا یَسْبِقُوْنَہٗ بِالْقَوْلِ وَھُمْ بِاَمْرِہٖ یَعْمَلُوْنَ ہ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ وَلَا یَشْفَعُوْنَ لا اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی وَھُمْ مِّنْ خَشْیَتِہٖ مُشْفِقُوْنَ۔ (الانبیاء ۲۷-۲۸)

اس کے حضور بڑھ کر نہیں بولتے اور بس اس کے حکم پر عمل کرتے ہیں جو کچھ ان کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے جو کچھ ان سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ باخبر ہے وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اس کے جس کے حق میں سفارش سننے پر اللہ راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرتے رہتے ہیں۔

یَوْمَئِذٍ لَّا تَنْفَعُ الشَّفَاعَۃُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَہُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِیَ

اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی اِلّا یہ کہ کسی کو رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کی بات

جا سکتے ہیں۔

لیکن غیب کی باتوں کے علم کا سرچشمہ وحی الٰہی ہی ہے اور اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول منتخب فرمائے اور آخری رسالت پر اس کا خاتمہ فرمایا۔

غیب کی باتوں کا علم کسی بھی شخص کو اللہ تعالیٰ یا اس کے فرشتوں سے تعلق قائم کر کے نہیں ہو سکتا۔ جو ایسا گمان کرے وہ جھوٹا ہے۔

غیب کی باتوں کا علم مخلوق کے لیے عام نہیں کیا گیا ہے اور نبوت کے سلسلہ کے خاتمہ کے بعد اب وحی بھی نازل نہیں ہو سکتی۔

اس لیے اب کسی کا یہ قول قبول نہیں کیا جا سکتا کہ "اللہ تعالیٰ جس کو چاہے جو علم دے دے" کے ضمن میں اسے بھی غیب کا فلاں علم حاصل ہوا ہے۔

عام طور پر ذہن میں آتا ہے کہ آسمان و زمین اللہ تعالیٰ کی ملکیت کی حدود ہیں یہ بالکل غلط ہے۔ ان کی حیثیت صرف اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بعض نشانیوں کی ہے۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ (الشوریٰ ۲۹)

اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ زمین اور آسمانوں کی پیدائش اور یہ جاندار مخلوقات جو اس نے دونوں جگہ پھیلا رکھی ہیں۔

وَمِنْ اٰیٰتِهٖۤ اَنْ تَقُوْمَ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ بِاَمْرِهٖ ؕ (الروم ۲۵)

اور اس کی نشانیوں میں سے ہے یہ کہ آسمان اور زمین اس کے حکم سے قائم ہیں۔

آسمان و زمین اللہ تعالیٰ کی ان بے شمار نشانیوں میں سے ہیں جنھیں شمار نہیں کیا جا سکتا اور سب اللہ تعالیٰ کے مکمل دائرۂ اختیار میں ہیں اور وہ ساری کائنات و مخلوقات پر نگرانی کر رہا ہے۔

وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِیْطٌ۔ (البروج ۲۰) حالانکہ اللہ نے ان کو گھیرے میں لے رکھا ہے۔

۹۔ وَلَا یَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا۔

یعنی جس طرح پہلی بار آسمانوں اور زمین کو تخلیق کرنے میں اللہ تعالیٰ کو ادنیٰ مشقت نہیں ہوئی تھی اس طرح ان کی حفاظت و برقراری اور ان کا نظام چلانے میں بھی اسے کوئی ادنیٰ مشقت نہیں ہو سکتی جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

هٰؤُلَاۤءِ شُفَعَاۤؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا یَعْلَمُ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰی عَمَّا یُشْرِكُوْنَ ۝ (یونس ۱۸)

کہتے یہ ہیں کہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں اے نبیؐ ان سے کہو "کیا تم اللہ کو اس بات کی خبر دیتے ہو جسے نہ وہ آسمانوں میں جانتا ہے نہ زمین میں"، پاک ہے وہ اور بالاو برتر ہے اس شرک سے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔

سوچئے! دل میں جو خیال بھی پیدا ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اسے جانتا ہے۔

اور یہ کسی ایک شخص کے بارے میں بھی ہے اور کائنات میں پھیلے ہوئے اربوں اشخاص سے متعلق بھی جو نسلاً بعد نسلٍ پہلے بھی ہوتے چلے آئے ہیں، آج بھی ہیں، اور آئندہ بھی ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ کا علم ان سب کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

تب آپ یقیناً چیخ پڑیں گے:

رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ لِلَّذِیْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِیْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِیْمِ ۝ (المومن ۷)

وہ کہتے ہیں اے ہمارے رب تو اپنی رحمت اور اپنے علم کے ساتھ ہر چیز پر چھایا ہوا ہے پس معاف کردے اور عذابِ دوزخ سے بچالے۔ ان لوگوں کو جنھوں نے توبہ کی ہے اور تیرا راستہ اختیار کرلیا ہے۔

۷۔ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۔

معرفت کے سرچشمے بنیادی طور پر خالق کی مشیت سے نکلتے ہیں یہاں تک کہ آنکھ اور کان کے ذریعہ جو کچھ معلوم ہوتا ہے اگر وہ نہ ہو تو انسان اپنی عقل سے اپنے گردوپیش کو بھی نہ سمجھ سکے اس سے زیادہ گہری باتوں کا علم انسانی ذہانت کے درجات سے متعلق ہے۔ ہم جب ماں کے پیٹ میں ہوتے ہیں تبھی اس ذہانت سے ہمیں اپنا حصّہ مل جاتا ہے۔

علم کی پہنائیوں میں انسان اپنی عقل کی کھڑکیوں سے جھانکتا ہے اور مشیت الٰہیہ نے اس کے لیے جو معمولی و غیر معمولی اسباب فراہم کردیے ہیں انھیں کے دائرے میں محدود رہتا ہے۔

○

علم و معرفت کے عام ذرائع کائنات کی کھلی کتاب، زندگی کے ساتھ انسانوں کے تجربات میں پھیلے ہوئے ہیں اپنے شعور، غور و فکر اور تجربہ کے ذریعہ اس میدان میں ہم بلا قید و بند دُور تک

اسی لیے اللہ تعالیٰ پر ایمان تبھی پورا ہوگا جب اس کے فرشتوں، کتابوں اور رسولوں پر ایمان بھی ہو۔

ایمان کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ انسان مادہ سے ماورا ذات کا اعتراف کرے اور اس علم کو مانے جو آسمانی وحی کا سرچشمہ ہے۔

صرف زمینی زندگی کے علوم کو ماننا پروردگارِ عالم کے انکار کی دلیل ہے یہ انکار تبھی ختم ہوگا جب وحی کو مانا جائے، رسولوں کی تصدیق کی جائے اور یہ احساس کیا جائے کہ وہ جو کچھ لائے ہیں وہ حق ہے اور یہ کہ انھیں اللہ تعالیٰ نے اس لیے مبعوث کیا ہے کہ وہ ایک صحیح زندگی کی طرف لوگوں کی رہنمائی کریں تاکہ آخرت کے دن وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اچھے طریقے سے پیش ہونے کے لائق ہو سکیں۔

یہ ایمان کی بنیادیں ہیں جنھیں قرآن وسنت میں واضح کیا گیا ہے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ؕ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ ۟ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ ۟ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۟ غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ۝

(البقرہ ۲۸۵)

رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی طرف سے اس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں انھوں نے بھی اس ہدایت کو دل سے تسلیم کر لیا ہے یہ سب اللہ اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اس کے رسولوں کو مانتے ہیں اور ان کا قول یہ ہے کہ ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے ہم نے حکم سنا اور اطاعت قبول کی۔ مالک، ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔"

مسلمان تمام انبیاء کو بھائی بھائی سمجھتے ہیں اور آسمان سے نازل ہونے والی تمام کتابوں کو اصولِ دین کا شارح سمجھتے ہیں اور یہ تشریح ایک دوسرے کی تصدیق کرتی ہے۔

انسانی نسلوں کو متعدد انبیائے کرامؑ ملے اور قرآن کریم کی صورت میں اللہ تعالیٰ کا آخری کلام نازل ہونے کے بعد اب کسی نئی نبوت کا امکان باقی نہیں رہ گیا۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ ۝ آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں۔
(الذّاریات ۴۷)

یعنی اللہ تعالیٰ کی وسعت کے سامنے اس کا بنانا معمول چیز ہے جیسے کسی کے پاس سونے چاندی کے زبردست خزانے ہوں اور وہ کسی کو چند پیسے دے دے یقیناً اسے محسوس نہیں ہوگا کہ اس نے کوئی بڑی چیز دے دی۔ اللہ تعالیٰ کی مثال تو کہیں اعلیٰ و برتر ہے۔ کائنات کو بنانا اور پھر اس کو چلانا اس کی عظمت و قدرت کے آگے کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔

۱۰۔ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ۔

مذکورہ بالا معانی و مفاہیم کو سمیٹتے ہوئے دو اسمائے حسنیٰ ذکر کیے گئے جو اس جگہ سے مناسبت رکھتے ہیں یعنی بلندی و عظمت کو ظاہر کرتے ہیں۔

صحیح عقیدہ

ایسے خدا کے بارے میں، جو ہر عیب و نقص سے پاک اور ہر کمال سے متصف ہے، ایسا شریفانہ اعتقاد ہی دین کی بنیاد ہے۔

مادہ سے ماورا ایک برتر وجود ہے جس پر یقین رکھنا اور اسی سے مدد طلب کرنا ضروری ہے اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو ہدایت و نگرانی کے بغیر نہیں چھوڑا ہے بلکہ اسے وحی سے نوازا ہے۔ جو اس کا راستہ واضح اور روشن کرے اور اسے ابتدا و انتہا سے باخبر کرے۔

وحی کیا ہے؟

یہ دل کی گفتگو ہے نہ فکر کا ارتقار۔

یہ نوان تعلیمات کا نام ہے جنھیں فرشتہ لے آیا، کتابوں میں مدون ہوئیں اور انھیں لوگوں تک پہنچانے کے لیے انسان منتخب کئے گئے۔

ایسے انسان جن کے بارے میں ہر زمانہ میں لوگ پورے بھروسہ اور سچائی کے ساتھ جانتے تھے کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں تک اپنا پیغام پہنچانے کی ذمہ داری سونپی ہے۔

بَدِيۡعُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ اَنّٰى يَكُوۡنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمۡ تَكُنۡ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىۡءٍ وَهُوَ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ۝ ذٰ لِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمۡ ۚ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَىۡءٍ فَاعۡبُدُوۡهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ وَّكِيۡلٌ ۝ لَا تُدۡرِكُهُ الۡاَبۡصَارُ وَهُوَ يُدۡرِكُ الۡاَبۡصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيۡفُ الۡخَبِيۡرُ ۝ قَدۡ جَآءَكُمۡ بَصَآئِرُ مِنۡ رَّبِّكُمۡ ۚ فَمَنۡ اَبۡصَرَ فَلِنَفۡسِهٖ ۚ وَمَنۡ عَمِىَ فَعَلَيۡهَا ؕ وَمَاۤ اَنَا عَلَيۡكُمۡ بِحَفِيۡظٍ ۝ (الانعام ۱۰۱-۱۰۴)

وہ تو آسمانوں اور زمینوں کا موجد ہے اس کا کوئی بیٹا کیسے ہو سکتا ہے، جبکہ کوئی اس کا شریک زندگی ہی نہیں ہے اس نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ یہ ہے اللہ تمہارا رب کوئی خدا اس کے سوا نہیں ہے ہر چیز کا خالق لہٰذا تم اس کی بندگی کرو اور وہ ہر چیز کا کفیل ہے نگاہیں اس کو نہیں پا سکتیں اور وہ نگاہوں کو پالیتا ہے وہ نہایت باریک بیں اور باخبر ہے دیکھو تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں اب جو بینائی سے کام لے گا وہ اپنا ہی بھلا کرے گا جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں۔

الحاد خرافات ہے

ہم کہتے ہیں: ایمان نام ہے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا جو یقین کی حد تک پہنچی ہوئی ہو اور قابل قبول معرفت وہی ہے جو حق کے مطابق صحیح معرفت ہو۔

کچھ لوگ اللہ تعالیٰ کی معرفت کو غلطیوں سے آلودہ کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ایسے اوہام و خرافات وابستہ کر دیتے ہیں جو حقیقت سے دور ہوں جیسا کہ ابھی ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں۔

دوسری طرف ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ تعالیٰ کو بالکل ہی نہیں جانتے اور پوری طاقت سے اس کے وجود کا انکار کرتے ہیں۔

زمانۂ حاضر میں ان منکرین کو مغربی تہذیب نے بھی بڑی تقویت پہنچائی ہے مثلاً اشتراکیت کے فلسفہ کی بنیاد یہ ہے کہ کوئی خدا ہے ہی نہیں اور یہ کہ زندگی مادہ کا نام ہے وجودیت کے فلسفہ اور دین سے دوری کے رجحانات کو مغربی یورپ کے تعلیم یافتہ لوگوں کی بڑی تعداد میں مقبولیت حاصل ہے۔

تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا	بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل ہے
لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ وَهُوَ السَّمِيْعُ	کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے
الْعَلِيْمُ ۔ (الانعام ۱۱۵)	اور وہ سب کچھ سنتا ہے اور جانتا ہے۔

انبیائے کرامؑ نے اللہ تعالیٰ کا جو دین لوگوں تک پہنچایا اس کا خلاصہ اسلام اس طرح کرتا ہے:

۱۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ دوسرا نہ تیسرا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ ہر کمال کا حقدار اور اس سے متصف ہے اور ہر عیب و نقص سے پاک ہے۔

۳۔ انسان کی نجات اسی میں ہے کہ وہ اس خدائے واحد کی عبادت کرے اور اس کی ہدایات کی اسی طرح پیروی کرے جیسے وہ نازل ہوئی تھیں۔

۴۔ اللہ تعالیٰ سے نہ کوئی بچا سکتا ہے نہ اس کے فیصلے کو بدل سکتا ہے اس لیے کہ نہ کوئی اس کا شریک ہے اور نہ سفارشی۔

ان بنیادی باتوں سے دیگر آسمانی مذاہب کے پیروکاروں نے جو انحراف کیا اسلام ان کی نکیر کرتا ہے۔

مثلاً عیسائیت میں باپ، بیٹا، روح القدس کی صورت میں تین خداؤں کا تصوّر ہے پھر ان میں سے ایک خدا اولادِ آدم کی خطاؤں کے کفارے کے طور پر مصلوب ہو جاتا ہے گویا ایک خدا دوسرے خدا کو قتل کر دیتا ہے پھر ایک خدا دوسرے خدا سے جُدا نہیں ایک دوسرے میں حلول کیے ہوئے ہے۔

حق بات یہ ہے کہ انسانی عقل اس طرح کی گنجلک باتوں میں الجھ جاتی ہے اور اس کے سامنے دو ہی راستے رہ جاتے ہیں۔

یا تو وہ ان اوہام کو جوں کا توں تسلیم کرلے اور خود اپنا گلا گھونٹ دے۔

یا پھر انھیں مسترد کرکے اپنی مرضی کا راستہ اختیار کرلے۔

آج عیسائی وجود میں جو آتش فشاں بھڑک رہے ہیں ان کا راز یہی ہے وہ دنیا کے سامنے سرکشی اور گمراہی کے جو مختلف طریقے سامنے لاتا رہتا ہے مثلاً اشتراکیت، وجودیت اور اباحیت وغیرہ وہ اسی بے لگام انسانی کجی کی نمائندگی کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تاکہ ان پر جہاز رواں دواں ہوسکیں، مچھلیاں وغیرہ نشو ونما پاسکیں، کہیں سرکش موج بن جاتی ہے کہیں پرسکون سطح آب، اس مربوط و ہم آہنگ نظام کے تعلق سے کچھ ہی علم انسان اب تک حاصل کرسکا ہے اور غور و فکر اور جستجو سے اور بہت کچھ معلوم کرسکتا ہے۔

برّاعظموں میں پھیلی ہوئی سرسبز و شاداب اور بے آب وگیاہ زمین کے حصّے ایک دوسرے سے مربوط ہیں کہیں انسان آباد ہوتا ہے کہیں اس کے خزانے نکالتا ہے کہیں اس کی بلندیوں اور گہرائیوں سے کام لیتا ہے اور سب کچھ ایک ازلی منصوبہ کے تحت ہورہا ہے جو خالق کائنات نے تیار کر رکھا ہے اور پوری کائنات ادنیٰ انحراف کے بغیر اس کے مطابق چل رہی ہے۔

کائنات کی تمام حرکات و سکنات ایک جامع نظام کے تابع ہیں جب فرعون نے حضرت موسیٰ اور ان کے بھائی سے سوال کیا؛

مَنْ رَّبُّکُمَا یٰمُوْسٰی ؟ — پھر دونوں کا رب کون ہے اے موسیٰ !

تو آپ نے یہی جواب دیا۔

رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی۔ (طٰهٰ ۴۹-۵۰) — ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی ساخت بخشی، پھر اس کو راستہ بتایا۔

زندگی کی ہر شئے کو اس کے کام کی ہدایت دینا ہی تقدیر ہے جس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ زندگی کو بخوبی چلاتا ہے۔

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّکَ الْاَعْلَی الَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی (الاعلیٰ ۱-۳) — (اے نبی) اپنے رب برتر کے نام کی تسبیح کرو جس نے پیدا کیا اور تناسب قائم کیا، جس نے تقدیر بنائی پھر راہ دکھائی۔

اور یہی حق کا مطلب ہے جس کے ذریعے زمین و آسمان قائم ہیں۔ ایک پودا بھی اپنی مرضی کے مطابق نہیں اُگتا پورے عمل میں تقدیر الٰہی کارفرما ہوتی ہے۔

ایک ستارہ بھی فضا میں اپنی مرضی سے رفتار تیز اور سست نہیں کرسکتا تخلیق کے آغاز سے ہی ساری رہنمائی مہیا کردی گئی ہے اور اس میں کسی طرح انتشار اور گڑبڑ نہیں ہوسکتی۔

اسی حقیقت کو اُجاگر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یہ لوگ نظریہ ارتقار کو فروغ دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ زندگی بہت مبہم اور کمزور صورت میں شروع ہوئی تھی پھر ترقی کرتے کرتے موجودہ حالت تک پہنچی۔

زندگی ان کے لیے ایک پہیلی ہے۔

دنیا گویا بچوں کا کھلونا ہے جسے بچے بے سوچے سمجھے اِدھر اُدھر پھینک رہے ہوں۔ اور ان کی حرکات کے پیچھے کوئی سوچا سمجھا منصوبہ نہ ہو۔

کیا واقعی دنیا اسی طرح پیدا ہوئی ہے کہ بغیر کسی منصوبہ وارادہ کے اس کے اجزائے ترکیبی ایک دوسرے پر رکھ اٹھے ہوں پھر کسی نظام کے بغیر انھیں نیچے اوپر کیا گیا ہو؟

گویا خالق کوئی کھیل اور تماشا کر رہا ہو۔

ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں۔ اس دنیا کا خالق صاف کہہ چکا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ لَوْ اَرَدْنَا اَنْ نَّتَّخِذَ لَهْوًا لَّاتَّخَذْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا اِنْ كُنَّا فٰعِلِيْنَ ○ (الانبیاء ۱۶ - ۱۷)

ہم نے اس آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان میں ہے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنایا اگر ہم کوئی کھلونا بنانا چاہتے اور یہی کچھ ہمیں کرنا ہوتا تو اپنے ہی پاس سے کر لیتے۔

اس عالم کا وجود منصوبہ بندی کے ساتھ مربوط نظام اور طریقوں سے، معلوم مرحلوں کے ساتھ اور پوری ہم آہنگی کے ساتھ یہاں تک پہنچا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ ○ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ○ (الدخان ۳۸ - ۳۹)

یہ آسمان اور یہ زمین، ان کے درمیان کی چیزیں ہم نے کچھ کھیل کے طور پر نہیں بنادی ہیں ان کو ہم نے برحق پیدا کیا ہے مگر ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں۔

قرآن کریم میں حق کا لفظ دسیوں جگہ آیا ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ زندگی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہی ہے بلکہ کائنات کی تشکیل تیز نگاہ، شروع سے آخر تک حکیمانہ تیاری اور ٹھوس تنظیم پر مبنی ہے اس میں کوئی کجی یا خلل نہیں پیدا ہو سکتا۔

وسیع سمندروں کا ہر قطرۂ آب دوسرے قطروں کے ساتھ ایک خاص ڈگر پر چل رہا ہے

بِلِقَآیِٔ رَبِّهِمۡ لَکٰفِرُوۡنَ ○ (الروم - ۸) رب کی ملاقات کے منکر ہیں۔

چونکہ قرآن کریم وہ واحد آسمانی کتاب ہے جس نے زور دے کر اس کھلی ہوئی کائنات کی طرف توجہ دلائی ہے اور اس کے اسرار اور گہرائیوں کو سمجھنے پر آمادہ کیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ کا فرمانا کتنا بجا ہے کہ:

وَبِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيۡرًا (بنی اسرائیل)

اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا ہے۔ اور اے نبی ہم نے تمہیں اس کے سوا کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ (جو مان لے) اسے بشارت دو (جو نہ مانے) اسے متنبہ کر دو۔

ظاہر ہے کائنات کے بارے میں غور و فکر حقائقِ کائنات کی عظمت کے ادراک و شعور کی کنجی ہے۔ آپ بہترین نقش و نگار والی فنکارانہ خوبصورت تصویر دیکھتے ہیں تو مصور کے فن کی عظمت کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح تعمیر کے فن کا شاہکار کوئی محل دیکھتے ہی اس کے انجینئر و معمار کی ذہانت و مہارت کے قائل ہو جاتے ہیں۔

تب آسمان و زمین اور ان دونوں کے درمیان جو کچھ ہے اس پر غور و خوض کرنے سے لازماً اس ذات بے ہمتا کی عظمت دل و دماغ میں پیدا ہوگی جس نے آسمان کو ایک بے داغ و مستحکم ترین چھت بنایا، زمین کا حسین و مبارک فرش بچھایا اور ایسی ایسی انوکھی چیزیں پیدا کیں جنھیں دیکھ کر فرطِ حیرت سے گونگا بھی بول پڑے

وَالسَّمَآءَ بَنَيۡنٰهَا بِاَيۡٮدٍ وَّاِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ ○ وَالۡاَرۡضَ فَرَشۡنٰهَا فَنِعۡمَ الۡمٰهِدُوۡنَ ○ وَمِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَيۡنِ لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ ○

(الذاریات ۴۷ - ۴۹)

آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں۔ زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں۔ شاید کہ تم اس سے سبق لو۔

لیکن کچھ لوگ اس فطری منطق کے برخلاف الٹے دماغ سے کام لیتے ہیں اور کائنات کی تعمیر میں جن لازمی و دائمی قوانین کا لحاظ رکھا گیا ہے انھیں دیکھ کر بے سروپا باتیں کرنے لگ جاتے ہیں۔

ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَا اَتَيْنَا طَائِعِيْنَ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ۔ (حٰم السجدہ ۱۱-۱۲)

پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ ہوا جو محض اس وقت دھواں تھا اس نے آسمان اور زمین سے کہا وجود میں آجاؤ خواہ تم چاہو یا نہ چاہو" دونوں نے کہا ہم آگئے فرماں برداروں کی طرح تب اس نے دو دن کے اندر سات آسمان بنا دیے اور ہر آسمان میں اس کا قانون وحی کر دیا اور آسمانِ دنیا کو ہم نے چراغوں سے آراستہ کیا اور اسے خوب محفوظ کر لیا یہ سب کچھ ایک زبردست علیم ہستی کا منصوبہ ہے۔

یہی وہ حق ہے جو عالم کی رگوں میں اس طرح سرایت کیے ہوئے ہے جیسے روح بدن میں قرآن کریم کی سورتوں میں بار بار اس کا ذکر آتا ہے۔

مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَمَّا اُنْذِرُوْا مُعْرِضُوْنَ۔ (الاحقاف ۳)

ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدّتِ خاص کے تعین کے ساتھ پیدا کیا۔ مگر یہ کافر لوگ اس حقیقت سے منہ موڑے ہوئے ہیں جس کے بارے میں انھیں خبردار کیا گیا ہے۔

وَمَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيْلَ ○ (الحجر ۸۵)

ہم نے زمین اور آسمانوں کو اور ان کی سب موجودات کو حق کے سوا کسی اور بنیاد پر خلق نہیں کیا ہے اور فیصلے کی گھڑی یقیناً آنے والی ہے بس اے نبی تم (ان لوگوں کی بے ہودگیوں پر) شریفانہ درگزر سے کام لو۔

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا فِيْ اَنْفُسِهِمْ ۗ مَا خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ

کیا انھوں نے کبھی اپنے آپ میں غور و فکر نہیں کیا؟ اللہ نے زمین اور آسمانوں کو اور ان ساری چیزوں کو جو ان کے درمیان ہیں برحق اور ایک مدّت مقرر کے لیے پیدا کیا ہے مگر بہت سے لوگ اپنے

میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ عقل نام ہے ہر لمحۂ زندگی کے لیے سازگار موقف اختیار کرنے کی صلاحیت کا۔
سورج مکھی جب سورج کی طرف اپنے پتوں کا رخ کرتی ہے تو وہ اپنی زندگی کے لیے زیادہ مناسب موقف اختیار کرتی ہے۔ یعنی عاقلانہ حرکت کرتی ہے۔
اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں عقل کا ہونا کوئی نئی چیز نہیں۔ یہ تو ہر زندہ وجود کی فطرت میں ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ انسان کے پاس زیادہ وسائل ہیں جنھیں وہ اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لیے استعمال کرتا ہے انسان چونکہ ایک پیچیدہ مخلوق ہے اس کے پاس دو ہاتھ، بولنے والی زبان دیکھنے والی دو آنکھیں، سننے والے دو کان، حساس کھال اور سونگھنے والی ناک ہیں اور یہ ساری چیزیں اس کی عقل کی خدمت گار ہیں۔
انسان ایک ایسا جاگیردار ہے جس کے پاس صلاحیتوں کی ہزاروں ایکڑ اراضی اور اعصاب وحواس کی متعدد عمارتیں ہیں۔
اسی لیے اس نے اپنے آپ پر بھی ظلم کیا اور دوسری مخلوقات پر بھی ظلم کیا جب اس نے ساری مخلوقات میں اپنے آپ کو تنہا عقلمند سمجھا۔
جبکہ عقل ہر زندہ وجود کی فطرت میں پنہاں ہے۔
زندگی جب سے ایک خلیہ والے حقیر وجود میں پیدا ہوئی ہے اس میں احتیاط وخباثت وغیرہ موجود رہے ہیں۔ انسانوں میں کوئی چیز نئی نہیں ہے بلکہ صرف اس کا ارتقا ہوا ہے۔
آپ نے یہ عجیب وغریب تحریر پڑھی اور اس کے مقاصد کو سمجھا؟
گویا ہماری اس زمین کو اس کے باہر کی کسی طاقت نے نہیں بنایا ہے، اس کا ہر ذرّہ اپنی مخصوص عقل اور سیدھی رائے کے مطابق اپنا کردار انجام دے رہا ہے۔
اگر کسی جانور کے جسم سے کوئی کیڑا بھی نکلتا ہے تو وہ اپنی رائے سے نکلتا ہے اور خود اپنی مرضی سے جہاں لگنا ہوتا ہے جا کر لگ جاتا ہے۔
اسی طرح کسی مرض والا جرثومہ اگر حرکت میں آتا ہے تو خود اپنی رائے اور مرضی سے جسے چاہتا ہے جا کر لگ جاتا ہے۔
یہ کوئی لطیفہ نہیں بلکہ بعض کوتاہ فکر لوگوں کے نزدیک علمی نظریہ ہے۔

مثلاً اگر وہ ریل کی پٹری پہ کسی ٹرین کو ہواؤں کا سینہ چیرتے ہوئے چلتے دیکھتے ہیں تو انھیں بس یہ خیال آتا ہے کہ ٹرین کے ڈبے اور ان کے پہیے کتنے بہتر بن ہیں ایک ذہین انجن انھیں لے کر کس طرح راستے پر دوڑ رہا ہے۔

گویا ٹرین کوئی ذی ہوش چیز ہے جس نے خود اپنے آپ کو بنالیا ہے۔ اگر وہ بجلی کا بلب دیکھتے تو بس یہ خیال کرتے ہیں کہ کرنٹ بس بٹن دبانے گا منتظر ہوتا ہے کہ مختلف تار کس طرح پر جوش طریقے سے باہم مل جائیں اور روشنی پھیل جائے۔ گویا بجلی کو معلوم ہے کہ اسے کیا کرنا ہے۔

قارئین یہ خیال نہ کریں کہ یہ شاعرانہ خیال آرائی یا بچکانہ باتیں ہیں۔ حیرت تو جب ہوتی ہے جب انھیں بعض لوگ علمی نظریات قرار دیتے ہیں۔

اس طرح کی افسوسناک منطق زندگی کی پہیلیوں کو حل کرنے کی علمی کوشش قرار دی جاتی ہے کہ کائنات کے وجود کے مسئلہ کا یہی حل ہے اور یہ کہ دنیا صرف مادّہ کا نام ہے۔ اس کا کوئی خالق و معبود نہیں۔ گویا الوہیت کی خصوصیات خود مادہ سے منسوب کر دی جاتی ہیں اور کائنات کو چلانے والے قوانین کو حیوانات و جمادات کی قوتِ فکر و اختیار کی علامت قرار دیا جاتا ہے۔

ایک صاحبِ قلم لکھتے ہیں:

"گلاب کے پودے میں عقل ہوتی ہے"

شاہ بلوط کے درخت میں عقل ہوتی ہے چاہے وہ اس کے تنے کی طرح موٹی ہی کیوں نہ ہو۔
سورج مکھی کا پھول جب سورج کی طرف رُخ کرنے کے لیے گردن گھماتا ہے تو اس کی حرکت شہد کی مکھی کی حرکت سے مختلف نہیں ہوتی جب وہ شہد جمع کرنے کے لیے کھیتوں اور باغوں میں اڑتی پھرتی ہے نہ انسان کی اس ہوشمندانہ حرکت سے مختلف ہوتی ہے جو وہ اپنے بلند پیغام کو ادا کرنے کے لیے پُرخطر جدّ و جہد کی صورت میں کرتا ہے۔

تینوں حرکتیں مربوط ہوتی ہیں فرق صرف درجہ و مرتبہ کا ہوتا ہے۔
سورج مکھی کے پھول کی حرکت اپنی سادگی کے باوجود عقل کی نمائندگی کرتی ہے۔
تب عقل ہے کیا؟
ماحول کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کرنے اور تصرّف کرنے کی صلاحیت کا نام عقل ہے سادہ الفاظ

لیکن بہت بڑے بڑے ہزاروں سیارے جو خلا میں موجود ہیں ان کی تخلیق وصلاحیت کے لیے کسی صلاحیت کی ضرورت نہیں !!

ایک موچی بھی ان کا نظام چلا سکتا ہے !!

ایک چھوٹے سے مکان کے لیے تو انجینئرنگ اور فنی مہارت کی ضرورت ہے لیکن اس وسیع و کائنات کے نظام کے لیے کسی مہارت کی ضرورت نہیں !!

کائنات کی ایجاد و تخلیق اور نظام و انتظام ایک زبردست کام ہے اور بغیر بہترین ارادہ، بہترین صلاحیت وقدرت، بہترین حکمت اور بہترین علم کے اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اور یہ صفات اس ذات ہی کی ہو سکتی ہیں جو زبردست قدرت وحکمت اور علم والی ہے جو آسمان وزمین کو تخلیق کرنے والی اور انتہائی جلال وعظمت والی ہے۔

اتنی واضح بات کو سمجھنے کے لیے ذہن پر زور دینے اور فکری تگ ودو کی بھی ضرورت نہیں پھر بھی ایک قلمکار "زندگی کی پہیلیوں" کا حل تلاش کرنے لگتا ہے تاکہ وہ یہ حل پیش کر سکے کہ مثلاً ایک موچی) نے سیارہ چھوڑا، یا کسی خچر والے نے اہرام تعمیر کیے یا یہ کہ مٹی میں پنہاں کوئی چیز ہی گیہوں کی بالیاں پیدا کرتی ہے اور ہر دانے کو غلاف میں بند کرتی ہے، انھیں ترتیب سے پروتی ہے اور ان میں غذائی اہمیت کے اجزا پیدا کرتی ہے۔

مٹی میں پنہاں عقل واحساس اور اختیار وتدابیر سے محروم کوئی چیز ہی سب کچھ کر ڈالتی ہے۔

پھر قلمکار یہ چاہتا ہے کہ ہم اس کی بات کی تصدیق کریں۔

درختوں کی شاخوں پر جو پھل پھول لگتے ہیں ان پھلوں میں انسانی زندگی کے لیے جو فائدہ بخش اجزا ہوتے ہیں یہ سب مٹی خود بخود پیدا کر دیتی ہے نہ کوئی خدا ہے نہ کوئی برتر وجود !!

خدا کا کوئی وجود نہیں۔ زندگی صرف مادّہ ہے۔

یہ ہے زندگی کی پہیلیوں کا حل جو قلمکار ہمیں سکھانا چاہتا ہے

سنئے وہ مزید کیا فرماتا ہے

"چوزے کو کیا چیز یہ سکھاتی ہے کہ وہ انڈے کو اس کے کمزور ترین حصّہ کی طرف سے توڑ کر باہر نکل آتے۔

فطری طور پر اس نے اپنی ذاتی عقل سے ایسا سیکھا۔

اللہ تعالیٰ کے نام سے چڑنے والے جنونیوں کے نزدیک زندگی کی پہیلی کا یہی حل ہے۔ اور جنون کی قسمیں تو بے شمار ہوتی ہی ہیں۔

○

اللہ تعالیٰ واضح و روشن حق ہے۔

کچھ لوگ بلند حقائق کو مسخرہ پن والے انداز میں چھیڑتے ہیں اس لیے ہم اگر ان کے جواب میں کچھ عجیب و غریب مثالیں اور دلیلیں بیان کریں تو قارئین کو حیرت نہیں ہونی چاہیے۔

اگر یہ کہا جائے کہ قاہرہ کے ایک موچی نے اپنے علم کے ذریعہ فضا میں میزائل داغنے اور سیارے چھوڑنے میں ایک کردار ادا کیا تھا تو آپ کیا کہیں گے؟

یقیناً آپ یہی کہیں گے: کیا مضحکہ خیز بات ہے!

کیوں؟ اس لیے کہ ان سیّاروں کا سارا انتظام ایسے ماہرین کرتے ہیں جنھوں نے کائناتی مطالعہ میں عمریں کھپائی ہیں۔

فضائے بسیط کے قانونِ کشش میں دخل دیتے ہوئے اور نامعلوم حالات و خطرات کا بال بال اندازہ کرنے کے لیے بڑی مہارت و ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے کوتاہ فہم اور بے علم لوگ تو اس میدان میں شرکت تو کیا پَر بھی نہیں مار سکتے ایک موچی کی کیا مجال ہو سکتی ہے۔

اگر آپ سے کہا جائے: اس زبردست، عالیشان محل کو دیکھئے اسے ایک گدھے نے تعمیر کیا ہے۔

ظاہر ہے آپ یہی سمجھیں گے کہ کہنے والا پاگل ہو گیا ہے۔

کیوں؟ اس لیے کہ آپ جانتے ہیں کہ کچھ روشن دماغ اور باصلاحیت لوگوں نے ہی اس کا منصوبہ بنایا ہوگا پھر اس کی تعمیر اور صورت گری کی ہوگی۔

ایک گدھا یہ سب کچھ کیسے کر سکتا ہے؟

لیکن انسانی عقل جو اس طرح کی فرضی باتوں کو فوراً مسترد کر دیتی ہے وہی بعض لوگوں کے نزدیک ایسی ہو جاتی ہے کہ اس طرح کی فرضی باتیں انھیں قابلِ احترام حقائق نظر آنے لگتی ہیں۔

ایک چھوٹے سیّارہ کے لیے تو بڑی ذہانت، وسیع علم، گہری نگاہ اور باریک منصوبہ بندی ضروری ہے۔

کتنی مضحکہ خیز بات ہو گی اگر ہم یہ تصوّر کریں کہ روٹی کے اس ٹکڑے نے ایک انسان کی تخلیق کے لیے یا روئے زمین پر چلنے والے انسان کا روپ اختیار کرنے کے لیے خود ایک مکمل منصوبہ بنایا تھا۔

پھر مادہ منویہ میں اس زندہ وجود کو کس نے پیدا کیا اور اس کے باریک جسم میں ایک انسان کی تشکیل کا منصوبہ رکھ دیا؟

کیا اللہ تعالیٰ کے علاوہ کوئی اور ذات ہوسکتی ہے؟

اَفَرَءَیْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ ۝ ءَاَنْتُمْ تَخْلُقُوْنَهٗ اَمْ نَحْنُ الْخٰلِقُوْنَ ۝ (الواقعہ ۵۸-۵۹)

کبھی تم نے غور کیا یہ نطفہ جو تم ڈالتے ہو اس سے بچہ تم بناتے ہو یا اس کے بنانے والے ہم ہیں؟

اسباب پر اس عظیم الشان خالق کی حکمرانی ہے۔ اسباب اس پر اثر انداز نہیں ہوتے۔ وہ دوسرے ذرائع سے بھی انسان کی تخلیق کرسکتا ہے جیسا کہ پہلے انسان (حضرت آدمؑ) اور حضرت حوا کی تخلیق سے ثابت ہے اسی لیے وہ فرماتا ہے:

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَیْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ۝ عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ وَنُنْشِئَكُمْ فِیْ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝

(الواقعہ ۶۰-۶۱)

ہم نے تمہارے درمیان موت کو تقسیم کیا ہے اور ہم اس سے عاجز نہیں ہیں کہ تمہاری شکلیں بدل ڈالیں اور کسی ایسی شکل میں تمہیں پیدا کردیں جس کو تم نہیں جانتے۔

نطفہ کے بعد انسانی تخلیق کے اگلے مراحل پر نگاہ ڈالیے۔ کس طرح وہ رحم کی گہرائیوں میں درجۂ کمال تک پہنچنے کے راستے پر چلتا ہے اس کی تشکیل اور صورت گری کون کرتا ہے باپ یا ماں؟ باپ کا کام تو پہلے ہی ختم ہو چکا۔ اس جنین کے تعلّق سے ماں بھی کیا کرسکتی ہے؟

کون اس میں آنکھیں اور کان بناتا ہے جن سے وہ دیکھ اور سن سکے وغیرہ وغیرہ۔

جنین تو ماں کے پیٹ میں غذا وغیرہ سے بھری ہوئی آنتوں کے نیچے ہوتا ہے اس کے ارد گرد کی چیزیں صرف وہی کچھ جانتی ہیں جن کے لیے انھیں پیدا کیا گیا ہے۔ کیا یہ سمجھا جائے کہ آنکھ، کان اور دل و دماغ کو خون یا پیشاب وغیرہ کی رگیں پیدا کرتی ہیں۔

یہ تو ہوسکتا ہے کہ مان لیا جائے کہ کسی گدھے نے اہرام تعمیر کردیے لیکن منکرین خدا کے معروضات

پرندوں کو کس نے یہ سکھایا کہ وہ سمندروں اور صحراؤں کو پار کر کے ایسی جگہ پہنچیں جہاں انھیں کافی غذا اور خوشگوار فضا مل سکے اور ہزار ہا میل کے اس سفر میں ان کی صحیح رہنمائی کون کرتا ہے؟

فطری طور پر وہ اپنی ذاتی ذہانت سے ایسا کرتے ہیں۔

ریشم کے کیڑے کو کس نے سکھایا کہ وہ اپنا خول بنائے اور پھر ان میں آرام کرے یہ سارا مرحلہ کیسے طے ہوتا ہے۔

ان سب کو سکھانے والی چیز فطرت ہوئی جو ہر زندہ وجود میں پنہاں ہوتی ہے۔ کس طرح؟ یہ کوئی نہیں جانتا۔"

اور جو چیز کوئی نہیں جانتا وہی اس قلمکار کے یہاں زندگی کی پہیلیوں کا قابلِ احترام حل ہے۔ اپنے پروردگار کے ساتھ موجودات کا تعلق کاٹنے والی کوئی بات بھی کہہ دیجئے وہ قابلِ لحاظ اور ترقی پسندانہ علم سمجھی جائے گی چاہے وہ بات کتنی ہی بے تکی کیوں نہ ہو۔

نطفہ بدل کر مکمل اعضاء کامل حواس اور روشن عقل والا انسان ہو جاتا ہے اس لیے نہیں کہ ایک خالق نے اس کے اس عمل کی نگرانی و تدبیر کی ہے بلکہ اس لیے کہ یہ نطفہ خود بخود اس راستے پر گامزن ہو جاتا ہے اور پھر اسی طرح درجۂ کمال تک پہنچ جاتا ہے جیسے ایک مفلس شخص اپنی جدوجہد سے مالدار ہو جاتا ہے۔

یہ سائنس کی منطق ہے۔ آیئے انسانی تخلیق کے مختلف مراحل میں اس کی تطبیق دیکھتے چلیں۔

انسانی وجود مرد کے مادہ منویہ کے عورت کے رحم کے بیضہ سے اختلاط سے شروع ہوتا ہے۔ مادہ منویہ میں مرد کی جسمانی و معنوی خصوصیات موجود رہتی ہیں اسی وجہ سے اولاد میں قد و قامت جلد اور بال کے رنگ، ذہانت اور مزاج وغیرہ کی مشابہت پیدا ہوتی ہے۔

مادہ منویہ میں موجود اس وجود کو کس نے بنایا، کیا ہم نے یا آپ نے اسے تخلیق کیا اور اس میں یہ ساری خصوصیات رکھ دیں؟

ہم میں سے کسی شخص کو یاد نہیں کہ اس نے ایسا کیا ہے۔

کیا روٹی کا کوئی ٹکڑا دانتوں کے درمیان سے پھسل کر ارتقار کی جدّوجہد کرنے لگا تھا پھر خود بخود خون اور پھر منی بن گیا تھا؟

الْعَلَقَةَ مُضْغَةً فَخَلَقْنَا الْمُضْغَةَ عِظٰمًا فَكَسَوْنَا الْعِظٰمَ لَحْمًا ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِيْنَ۔ (المومنون ۱۲-۱۴)

بوٹی بنایا، پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھایا، پھر اسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا کر کھڑا کر دیا بس بڑا ہی بابرکت ہے اللہ، سب کاریگروں سے اچھا کاریگر۔

آپ ایک بنے ہوئے محل کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ گارے اور لکڑی وغیرہ کی فطری خصوصیات نے اسے بنایا ہے جبکہ میں کہتا ہوں: نہیں بلکہ کسی ایسے انجینئر نے بنایا ہے جس کے پاس منصوبہ سازی اور عملدرآمد کے ذرائع و آلات تھے۔

اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ يَسْمَعُوْنَ اَوْ يَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا ع (الفرقان ۴۴)

کیا تمہارا گمان ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے اور سمجھتے ہیں یہ تو جانوروں کی طرح ہیں، بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

اسلام کیا ہے

ایمان کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کے لیے خشوع وخضوع کا احساس ہے۔ ایسا خشوع وخضوع جس میں شوق اور ڈر دونوں شامل ہوں۔ اور اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں۔ انسانوں میں بھی جسے عظیم سمجھا جاتا ہے اس کی عزت اور پیروی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اب جو اللہ تعالیٰ کو اس کے بہترین ناموں اور عظیم ترین صفات کے ساتھ جان لے گا اس کا حال کیا ہوگا؟

ظاہر ہے مطلق سپردگی اور جھکاؤ کا جذبہ اس کے دل میں بھر جائے گا اور وہ اطاعت و پیروی ہی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے تعلق کی بنیاد بنائے گا۔

دین سرکشی و نافرمانی کا نام نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے سامنے مکمل سپردگی اور اس کے حکم کے مکمل نفاذ کا نام ہے۔

فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰى يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ (النساء ۶۵)

اے محمد تمہارے رب کی قسم یہ لوگ کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ اپنے باہمی اختلافات میں تم کو یہ فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں بلکہ سر بسر تسلیم کر لیں۔

کو ماننا ناممکن ہے۔

دانش ورو! تخلیق کے کام کے لیے خصوصی اہلیت درکار ہے عدم سے کسی چیز کو وجود میں لانے کے لیے کچھ امتیازی صلاحیتیں ناگزیر ہیں۔ کوئی جانور ریڈیو کے آلات نہیں جوڑ سکتا۔ اس کے لیے کسی ذی عقل اور تجربہ کار انسان کی ضرورت ہوگی۔

جو لوگ یہ تصور کرتے ہیں کہ اس منظم و مربوط عالم کو بے روح و بے شعور مادہ نے تشکیل دیا ہے۔ وہ اپنی کوتاہ فہمی کو لوگوں میں پھیلانا چاہتے ہیں۔

ایسے ہی ایک شخص نے مجھ سے کہا: کیا آپ نظریۂ ارتقار کو نہیں مانتے۔ میں نے کہا: بحث کے لیے فرض کر لیا جائے کہ نظریۂ ارتقا ایک ثابت شدہ علمی حقیقت بن چکا ہے تو بھی اس سے نتیجہ کیا نکلتا ہے؟

یہ انسان پہلے بندر تھا پھر ترقی کرتے کرتے آج کا انسان بن گیا تو کیا اس کا مطلب یہ ہوا کہ کوئی خدا نہیں ہے؟

یہ گمان کہ یہ تدریجی ارتقار اپنے آپ ہو گیا کیونکہ چیزوں میں اوپر سے نیچے گرنے یا نیچے سے اوپر اٹھنے کی صلاحتیں ہوتی ہیں اور اس کے لیے کوئی خارجی عامل مؤثر نہیں ہوتا، علم و منطق دونوں سے بعید ہے۔

آپ مانتے ہیں کہ کھیتوں کی مٹی میں پھل پھول پیدا کرنے والی تخلیقی ذہانت ہوتی ہے جبکہ میں ایسا نہیں سمجھتا بلکہ یہ مانتا ہوں کہ پھلوں اور پھولوں کا وجود ایک برتر وجود کا رہینِ منت ہے جسے خالق اور صورت گر کہنا چاہیے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو آپ سمجھتے ہیں کہ ماں کے جسم میں گوشت اور ہڈیاں پیدا کرنے اور دل و دماغ بنانے کے کارخانے ہیں جبکہ میں سمجھتا ہوں ماں کا جسم ایک مدبّر حقیقی کی کارگہ ہے جو کہتا ہے:

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ طِيْنٍ ۝ ثُمَّ جَعَلْنٰهُ نُطْفَةً فِيْ قَرَارٍ مَّكِيْنٍ ۝ ثُمَّ خَلَقْنَا النُّطْفَةَ عَلَقَةً فَخَلَقْنَا

ہم نے انسان کو مٹی کے ست سے بنایا، پھر اسے ایک محفوظ جگہ ٹپکی ہوئی بوند میں تبدیل کیا۔ پھر اس بوند کو لوتھڑے کی شکل دی۔ پھر لوتھڑے کو

حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی کا مطلب ہے تمام انبیائے کرام پر ایمان کا اعلان۔

اگر کوئی ایک نبی کو مانے اور دوسرے کو نہ مانے تو سارے انبیاءؑ کا منکر بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا منکر ہوگا۔ حضرت محمدؐ اور حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ یا دیگر تمام انبیاءؑ کے درمیان کوئی امتیاز نہیں کیا جا سکتا۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّفَرِّقُوْا بَیْنَ اللّٰہِ وَرُسُلِہٖ وَیَقُوْلُوْنَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَّنَکْفُرُ بِبَعْضٍ وَّیُرِیْدُوْنَ اَنْ یَّتَّخِذُوْا بَیْنَ ذٰلِکَ سَبِیْلًا ۙ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ حَقًّا (النساء ۱۵۰-۱۵۱)

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے کفر کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کریں اور کہتے ہیں کہ ہم کسی کو مانیں گے کسی کو نہ مانیں گے اور کفر اور ایمان کے بیچ میں ایک راہ نکالنے کا ارادہ رکھتے ہیں وہ سب پکے کافر ہیں۔

حضرت محمدؐ کی رسالت کی گواہی کا مطلب ہے مختلف زمانوں میں مبعوث ہونے والے تمام انبیاءؑ بھی حق تھے کیونکہ حضرت محمدؐ تمام سابق انبیاء کی تصدیق، ان کی تعلیمات کی تجدید اور ان کا نام بلند کرنے کے لیے آئے تھے۔

پھر رسالت کی گواہی کا مطلب یہ ہے کہ میں عہد کرتا ہوں کہ آپؐ کی زندگی کو نمونہ بناؤں گا اور آپؐ کی سنّت اور طریق کار کو اپناؤں گا۔

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ یہ عہد کہاں سے آیا؟

جواب ہے کہ حضرت محمدؐ کی زندگی کی عظمت کا راز یہی ہے کہ آپ مکمل انسان ہیں اور اللہ تعالیٰ کی صحیح بندگی کے ذریعہ آپ انسانی سربلندی کی بلند ترین چوٹی تک پہنچے۔ آپؐ نے کبھی یہ دعویٰ نہیں کیا کہ اللہ تعالیٰ آپ کی ذات میں حلول کر گیا ہے۔

یا آپؐ کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان کوئی نسبی تعلق ہے۔

آپؐ انسانوں میں سے ایک فرد تھے جسے اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اپنا پیغام پہنچانے اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع ہونے والوں کی قیادت و رہنمائی کے لیے منتخب فرمایا تھا۔

جزئی مشروط یا جبری سپردگی کا نام اسلام نہیں ہے۔

اسلام کے لغوی معنی بھی یہی ہیں اور شرعی اصطلاحی معنی بھی یہی۔

بلکہ وہ ایسی مکمل سپردگی کا نام ہے جو دل میں پنہاں ایمان کو اعضائے جسم کی حرکات و سکنات پر غالب کردے اور مخفی یقین کو پرائیویٹ و پبلک زندگی میں نمایاں اطاعت کی صورت دے دے۔

یہی حقیقت اسلام کے ارکان اور سارے شرعی احکام میں جلوہ گر ہے۔

شہادت کا مطلب

مسلمان کی پہلی گواہی یہی ہوتی ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔

یہ عظیم کلمہ کوئی عام اور معمولی چیز نہیں بلکہ ایک سنجیدہ فیصلہ کا اعلان ہے جس کا مقصد حق کو ثابت کرنا اور باطل کو مسترد کرنا ہے۔

اس گواہی کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے یہ فیصلہ کرلیا کہ ایسے راستے پر چلنا ہے جو اللہ تعالیٰ کی وحدت ثابت کرتا ہے اور اس کی خدائی میں کسی طرح کی شرکت کو چیلنج کرتا ہے۔

گویا آپ نے یہ کلمہ پڑھ کر ان بہت سے مسائل کے تعلق سے اپنا نقطہ نظر واضح کردیا جن میں لوگ دن رات غلطاں ہیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ لوگ مختلف معبودوں کے سامنے جھکے ہوئے ہیں اور مال و دولت اور جاہ و اقتدار وغیرہ نہ جانے کتنے بتوں کے اردگرد طواف کر رہے ہیں۔ دنیا میں کتنے ہی لوگ ایسے ہیں جو جاننے کے باوجود اپنی خواہشاتِ نفس کو معبود بنائے ہوئے ہیں۔ جو جانتے اور مانتے ہی نہیں ان کی تو بات ہی دوسری ہے۔

ایسے سخت حالات میں لا الٰہ الا اللہ کی گواہی دینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ زندگی کے میدان میں اپنے عمل کے ذریعہ مذکورہ لوگوں کے باطل اور گمراہی کا مقابلہ کر رہے ہیں اور یہ اعلان کر رہے ہیں کہ آپ حق کا دامن تھامے ہوئے ہیں اور اس بات کو چھپا کر نہیں رکھنا چاہتے بلکہ علی الاعلان واضح کرنا چاہتے ہیں۔

محض گواہی ایمان کی دلیل نہیں بلکہ لائحہ عمل کا اعلان اور طرزِ عمل کا آغاز ہے۔ اب یہ گواہی فیصلہ کے مرحلہ سے زندگی میں عمل درآمد کے مرحلے میں داخل ہوگی اور ایک مخصوص راستہ کا سنگ میل بنے گی۔

مَلَكًا رَّسُوْلًا ۝ (بنی اسرائیل ۹۴-۹۵) کے لیے پیغمبر بنا کر بھیجتے۔

بے شک روئے ارض پر بسنے والے انسانوں کے وجود میں جسمانی تقاضے اور نفس کی خواہشات کام کرتی رہتی ہیں۔ وہ تنگی و کشادگی، سختی و خوشحالی، رنج و راحت، اتحاد و انتشار وغیرہ بہت سے محسوسات سے دوچار ہوتے ہیں ان کے لیے یہی مناسب تھا کہ ان کے پاس ایسا نبی بھیجا جائے جو انھیں کی طرح ان سارے مسائل سے دوچار ہو پھر بہترین طرزِ عمل اختیار کر کے دکھائے۔

اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی میں نبیؐ کی سرگرمیوں کو ہی سنت کہتے ہیں اور جو اس سنّت سے روگردانی کرے اس کا تعلّق اسلام سے نہیں ہو سکتا۔

کلمۂ توحید کو مسلمان کی زندگی اور اسلامی معاشرے میں رہنمائی کا مقام حاصل ہے اور اس پر ساری اطاعتوں کا دار و مدار ہے۔

چونکہ اسلام اللہ تعالیٰ کے سامنے مکمل سپردگی کا نام ہے اس لیے ایسا گمان ہو سکتا ہے کہ مسلمان سے کوئی خلاف ورزی یا گناہ سرزد نہیں ہونا چاہیے لیکن یہ مسئلہ ذرا تشریح طلب ہے۔

انسانی زندگی میں خطاکاری

انسانی طبیعت میں غلطی اور بھول چوک داخل ہے۔

بہت سی غلطیاں بغیر ارادہ سرزد ہو جاتی ہیں۔

مثلاً کمپوزیٹر یا ٹائپسٹ کو لیجیے۔ کوئی کتاب اس وقت تک نہیں چھپ سکتی جب تک ہر صفحہ کئی مرحلوں سے نہ گزر جائے۔ پہلی بار ٹائپ یا کمپوز کرنے کے بعد متعدد غلطیاں نکل آتی ہیں پھر تصحیح کے بعد غلطیاں ختم ہو جاتی ہیں۔ کام کرنے والا تو یہی کوشش کرتا ہے کہ پہلی بار ہی میں کوئی غلطی نہ رہ جائے لیکن اس کے ارادہ و خواہش کے باوجود غیر ارادی طور پر غلطی ہو جاتی ہے۔

درزی ایک بار ناپ لینے کے بعد پوری کوشش کرتا ہے کہ لباس بالکل فٹ آجائے لیکن ایسا نہیں ہوتا جسم پر پہنا کر دیکھنے سے ہی کسر سمجھ میں آتی ہے۔ ظاہر ہے اس طرح کی کسی خامی میں انسانی ارادہ کا دخل نہیں ہوتا بلکہ خود بخود پیدا ہو جاتی ہے۔

اسی طرح ایک مسلمان اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کر سکتا ہے نہ ایسا چاہ سکتا ہے اگر اس سے

قُلْ اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰى اِلَيَّ اَنَّمَا اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ج
(الکهف ۱۰)

اے نبی کہو کہ میں تو ایک انسان ہوں تم ہی جیسا میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ تمہارا خدا بس ایک ہی خدا ہے۔

فَاسْتَقِمْ كَمَا اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ
(هود ۱۱۲)

تم اور تمہارے ساتھی جو (کفر و بغاوت سے ایمان واطاعت کی طرف) پلٹ آئے ہیں ٹھیک راہ راست پر ثابت قدم رہو۔ جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔

ذہنی و قلبی اعتبار سے بھی آپ بے عیب تھے اور جسمانی اعتبار سے بھی۔ اس لیے کسی نفسیاتی پیچیدگی کا شکار بھی نہیں ہو سکتے تھے۔

آپ شوہر و باپ بھی تھے اور شہ سوار و تاجر بھی۔ فتح و شکست، کشادگی و تنگدستی، مسرّت و غضب اور غم و خوشی کے حالات سے آپ دوچار ہوتے رہتے تھے۔

لیکن ان ساری انسانی خصوصیات و حالات کے ساتھ ساتھ آپؐ نے اپنے ظاہر و باطن کو اللہ تعالیٰ کے سامنے مکمل سپردگی اور جانثاری میں ڈھال لیا تھا اور اپنے دل کی سچّی ترجمانی کرتے ہوئے فرماتے تھے کہ "میں تم میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرتا بھی ہوں اور سب سے زیادہ اسے جانتا بھی ہوں"۔

اور یہیں سے نمونہ ملتا ہے:

قُلْ سُبْحَانَ رَبِّيْ هَلْ كُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰى اِلَّا اَنْ قَالُوْا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ

اے نبی ان سے کہو پاک ہے میرا پروردگار کیا میں ایک پیغام لانے والے انسان کے سوا اور بھی کچھ ہوں لوگوں کے سامنے جب کبھی ہدایت آئی تو اس پر ایمان لانے سے ان کو کسی چیز نے نہیں روکا مگر ان کے اسی قول نے کہ "کیا اللہ نے بشر کو پیغمبر بنا کر بھیج دیا ہے" ان سے کہو کہ اگر زمین میں فرشتے اطمینان سے چل پھر رہے ہوتے تو ہم ضرور آسمان سے کسی فرشتے ہی کو ان

ہوتا۔ مے نوش جب شراب پیتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔" (بخاری)

وقتی طور پر ایمان کی اس نفی کے ہولناک نتائج نکلتے ہیں یعنی یہ کہ اس گناہ کی حالت کے بعد کیا پھر ایمان مکمل طور پر واپس مل پائے گا؟

اور اگر گناہ گار بار بار وہی گناہ کرتا رہے تو کیا ایمان واپس مل بھی سکے گا؟

تجربات کی روشنی میں ہم گناہ کو نفسیاتی حالات یا خارجی حالات سے الگ نہیں کر سکتے۔ لیکن یہی حالات اس بات کا فیصلہ بھی کریں گے کہ ایک شخص دین سے کتنا دور ہوا۔ کسی معمولی بھول چوک پر معافی کی امید کی جاتی ہے جان بوجھ کر نظر انداز کرنا قابلِ ملامت ٹھہرتا ہے۔ پھر ایسی زیادتی بھی ہوتی ہے جو سزا واجب کر دے پھر یکسر برگشتگی کا نمبر آتا ہے جسے ارتداد کہا جاتا ہے اور اسلام سے رشتہ بالکل منقطع کر دیتا ہے۔

مثلاً شراب پی لینے کے جرم کی ایک سزا ہے۔ بعض دفعہ جاہلیت کے دور کے عادی شراب نوش اپنی کمزور قوت ارادی کی وجہ سے پھر شراب پی لیتے تھے لیکن ہنسی خوشی سزا بھی قبول کر لیتے تھے۔

اس طرح کے جرم کو ارتداد نہیں قرار دیا جا سکتا بس گناہ ہے اور بس۔

لیکن اگر کوئی شراب بنانے کا کارخانہ ہی کھول لے یا دکان کھول کر بیچنا شروع کر دے تو اسے بلاشبہ اسلام سے بیگانہ قرار دیا جائے گا کیونکہ برائی کے لیے وہ پختہ ارادہ کیے ہوئے ہے۔

فرمانبرداری کے ساتھ خطا ہو جانا اور بالکل سرکشی اختیار کرنا دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، خطا کار اسلام کے دائرے سے نہیں نکل جاتا لیکن نافرمانی کو اسلام نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اسی طرح کے سرکشوں اور گناہ پر مصر رہنے والوں کے لیے جہنم کے دوامی عذاب کی بات کہی گئی ہے۔

وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۝ (الجن ۲۳)

اب جو بھی اللہ اور اس کے رسول کی بات نہ مانے گا اس کے لیے جہنم کی آگ ہے اور ایسے لوگ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔

ایک دوسری مثال لیجیے:

ایک جج کبھی کسی با اثر شخص کی سفارش کی وجہ سے یا کبھی کسی ذاتی خواہش یا مصلحت کی وجہ

کوئی غلطی سرزد ہو جائے تو اس پر قائم نہیں رہتا بلکہ کسی خطا کے بعد اس کے دل میں جو ندامت پیدا ہوتی ہے وہ اس کے لیے مصیبت بن جاتی ہے۔ کسی غفلت یا کسی خواہش سے مغلوبیت کی وجہ سے اگر کوئی خطا سرزد ہو جاتی ہے تو وہ اس کی تلافی کرنا چاہتا ہے۔

ایک کسان جب فصل بوتا ہے اور اس میں گھاس پھوس پیدا ہو جاتی ہے تو وہ حتی المقدور پوری کوشش کرتا ہے کہ اسے صاف کر دے۔

اگر مسلمان زندگی بھر اپنی خطاؤں کی تلافی کرنے اور اپنے آپ کو پاک کرنے کی کوشش کرتا رہے تو وہ نہ اسلام کے دائرے سے خارج ہوتا ہے نہ اللہ تعالیٰ کی بخشش سے محروم ہوتا ہے۔

شاید یہی اس حدیث قدسی کا مقصد ہے کہ:

" اے ابن آدم! جب تک تم مجھے پکارتے رہو گے اور مجھ سے آس لگائے رکھو گے میں تمہاری خطائیں معاف کرتا رہوں گا اور پرواہ بھی نہیں کروں گا۔

اے ابن آدم! اگر تمہارے گناہ آسمان کو چھونے لگیں اور تب بھی تم مجھ سے بخشش طلب کرو گے تو میں تمہیں بخش دوں گا اور پرواہ بھی نہیں کروں گا۔

اے ابن آدم! اگر تم زمین بھر گناہ لے کر بھی آؤ گے اور پھر مجھ سے اس حال میں ملو گے کہ تم نے میرے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہرایا ہوگا تو میں تمہیں اسی کے بقدر معافی عنایت کر دوں گا"

(ترمذی)

بعض کم فہم اس طرح کی حدیثوں سے یہ گمان کرنے لگتے ہیں کہ نافرمانی کی عام اجازت ہے جبکہ اس طرح کا گمان نرا اندھاپن ہے اور اس طرح کا گمان کرنے والے بخشش سے سب سے زیادہ دور ہیں۔

نافرمانی بہت اہم چیز ہے اور پھر اس کے ساتھ ارادہ بھی شامل ہو جائے تو ایمان ڈگمگا جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی معرفت پر پردہ پڑ جاتا ہے۔

اور پھر اس طرح کا اندھاپن اطاعت و فرمانبرداری کے اصولوں سے کہیں دور پہنچا دیتا ہے اسی لیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

"زانی جب زنا کرتا ہے تو وہ مومن نہیں ہوتا۔ چور جب چوری کرتا ہے تو وہ مومن نہیں

اب یہی اصول ہر چیز کے لیے فیصلہ کن ہے۔ جہاں بھی اللہ تعالیٰ کے سامنے خود سپردگی نظر آئے وہاں اسلام موجود ہے ورنہ نہیں۔

جب فرائض مسترد کیے جائیں، احکام کو پسِ پشت ڈال دیا جائے خواہشاتِ نفس ہی کا دور دورہ ہو اور آسمانی ہدایت کی پرواہ ہی نہ کی جائے تو اسلام کہاں باقی رہے گا۔؟

خود سپردگی کا دائرہ

اللہ تعالیٰ نے توحید کی شہادت کے ساتھ کچھ فرائض مقرر کیے ہیں جنھیں ارکانِ اسلام کہا جاتا ہے۔ ان ارکان کے قیام میں حکمت یہی ہے کہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی اطاعت، بہترین خود سپردگی اور رذیل باتوں سے دُور رہنے کی تربیت دی جائے۔

ان ارکان کے دور رس نفسیاتی و معاشرتی اثرات ہوتے ہیں۔ اب جو انھیں ادا تو کرتا ہے لیکن اس میں اللہ تعالیٰ کے لیے مطلوبہ خود سپردگی کے آثار پیدا نہیں ہوتے تو گویا وہ ان ارکان کو ادا ہی نہیں کرتا۔

اگر انسان قلب و دماغ اور اعضاء و جوارح کے تعلق سے پاکیزگی نہیں سیکھتا تو نماز روزہ سے اسے کتنا فائدہ پہنچ رہا ہے؟

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے خادم حضرت ثوبانؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت کے کچھ لوگ قیامت کے دن اس طرح پیش ہوں گے کہ ان کے پاس تہامہ پہاڑ جیسے روشن اعمال ہوں گے لیکن اللہ تعالیٰ انھیں راکھ کی طرح اڑا دے گا حضرت ثوبانؓ نے وضاحت کی درخواست کی تو آپؐ نے فرمایا وہ لوگ تمہارے ہی بھائی ہوں گے۔ راتوں کو اسی طرح عبادت کرتے ہوں گے لیکن ان کا حال یہ ہوگا کہ تنہائی میں اللہ تعالیٰ کی حرمات کو پامال کرتے رہے ہوں گے۔

اس طرح کے لوگ ظاہری ارکان تو ادا کرتے ہیں لیکن اس کی بدولت ان میں مطلوبہ خشوع و خضوع پیدا نہیں ہوتا نہ ظاہر و باطن میں اللہ تعالیٰ کو نگراں سمجھنے والا بیدار قلب حاصل ہوتا ہے۔ نہ خدا کے ہر امر و نہی کے تعلق سے ان کے دلوں میں عام خود سپردگی پیدا ہوتی ہے۔

سے مقدمہ میں کسی فریق کی حمایت کر بیٹھا ہے۔

بلا شبہ یہ گناہ ہے جو شدید عذاب تک پہنچا سکتا ہے لیکن کیا اسے کفر یا ارتداد قرار دیا جا سکتا ہے؟ یا دوسرے الفاظ میں کیا اس گناہ گار کو ان گناہ گاروں میں شمار کیا جا سکتا ہے جو خدا کے حکم کو مانتے ہی نہیں اور انسانی عقل و قانون کو خدا کے حکم سے بالاتر سمجھتے ہیں؟

پہلے گناہ گار نے تو کسی ذاتی مفاد سے مغلوب ہو کر ایک غلطی کر لی لیکن دوسری قسم کے لوگ تو خدا کے حکم کو ہی چیلنج کر رہے ہیں۔

غفلت کی حالت میں سرزد ہونے والے کسی جرم اور پورے احساس و شعور کے ساتھ کیے جانے والے جرم میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

پہلے گناہ پر شرمندگی ہوتی ہے دوسرے گناہ پر فخر کیا جاتا ہے اور فخر کرنے والے سرکش فرد یا معاشرے کو حدود سے باہر سمجھنا ہی ہوگا۔

دین تو اس یقین کا نام ہے کہ اللہ حق ہے اور اس کا ہر حکم واجب العمل ہے پھر جسمانی و قلبی طور پر اس کے سامنے مکمل سپردگی چاہیے۔

اب جو اس کے برعکس موقف اختیار کرتا ہے وہ مومن کیسے ہوگا۔

اَفَمَنْ كَانَ مُؤْمِنًا كَمَنْ كَانَ فَاسِقًا ؕ لَا يَسْتَوٗنَ ۝ اَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَلَهُمْ جَنّٰتُ الْمَاْوٰى نُزُلًا بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ فَسَقُوْا فَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ؕ كُلَّمَاۤ اَرَادُوْۤا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَاۤ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَقِيْلَ لَهُمْ ذُوْقُوْا عَذَابَ النَّارِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝ (السجدہ ۱۸-۲۰)

بھلا کہیں یہ ہو سکتا ہے کہ جو شخص مومن ہو وہ اس شخص کی طرح ہو جائے جو فاسق ہو یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ جو لوگ ایمان لائے ہیں جنھوں نے نیک عمل کیے ہیں ان کے لیے تو جنتوں کی قیام گاہیں ہیں ضیافت کے طور پر ان کے اعمال کے بدلے ہیں اور جنھوں نے فسق اختیار کیا ہے ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے جب کبھی وہ اس سے نکلنا چاہیں گے اسی میں دھکیل دیے جائیں گے اور ان سے کہا جائے گا چکھو اب اسی آگ کے عذاب کا مزہ جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

عبادات جو اسلامی ارکان ہیں وہ تو اخلاق و کردار کی تربیت اور طبیعت کو سلامت روی کے راستے پر ڈالنے کی بہت مؤثر ریاضت و مشق ہیں۔

ان کی فرضیت کی بنیاد یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حق کی ادائیگی، بندگی کے فرائض کی تکمیل اور انسان کے اس اعتراف کا ذریعہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہی اسے پیدا کیا اور روزی دی ہے اور اس کی بندگی اور شکر واجب ہے۔

آج کے مادی دور میں بیشتر لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی اسی پچاس ساٹھ برسوں کا نام ہے۔ جو وہ زمین پر گزارتے ہیں۔ وہ اس طرف سے بالکل غفلت اور اندھیرے میں رہتے ہیں کہ وہ دنیا میں کیوں آئے ہیں اور انجام کار کہاں جانا ہے۔ وہ اس طرح زندگی کے دن کاٹتے ہیں کہ ان کی ساری تگ و دو کا محور روزی حاصل کرنا اور معیار زندگی بلند کرنا ہوتا ہے۔

لیکن جو لوگ اللہ تعالیٰ کو پہچانتے ہیں وہ زندگی کو اتنی محدود نگاہوں سے نہیں دیکھتے بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ زندگی ایک دوسری زندگی کا پل ہے جو آخرت کی زندگی ہوگی پھر وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول اور اس کی ہدایت کی پابندی کی بنیاد پر اپنا طرز عمل استوار کرتے ہیں۔

اسی لیے وہ عبادت کو مقصود بالذات چیز سمجھتے ہیں جس کے ذریعہ وہ اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق مضبوط کرتے ہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ ہی اس لائق ہے کہ اس کی الوہیت کی تعظیم، اس کے فضل و کرم کے اقرار، اس کی جزا کے حصول اور اس کی سزا سے بچنے کے لیے اس سے تعلق مضبوط کیا جائے۔

توحید کی گواہی جو اسلام کا پہلا رکن ہے انسان کی طرف سے اللہ تعالیٰ کی پاکیزگی کے اقرار کا اعلان ہے اس اعلان میں کائنات کی تمام چیزیں شریک ہیں۔

وَاِنْ مِنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ (الاسراء ۴۴)

کوئی ایسی چیز نہیں جو اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح نہ کر رہی ہو مگر تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔

اللہ کا نام ہی سب سے زیادہ حقدار ہے کہ اسے پکارا جائے اور اس کی بزرگی بیان کی جائے
اگر ہونٹ اس گواہی سے قاصر رہتے ہیں اور لوگ اس عظمت کے اعتراف سے کتراتے ہیں
تو آخر کہاں جائیں گے اور کیسے زندہ رہیں گے؟

اب چاہے ان کے اعمال پہاڑوں کی بلندیوں تک پہنچ جائیں، بے وزن رہیں گے۔ یہاں نماز روزہ وغیرہ فرض عبادتوں کی ظاہری ادائیگی کی اہمیت کو کم کرنا مقصود نہیں کیونکہ ان کی حیثیت تو انسان کو صیقل کرنے اور اس کے طرزِ عمل کو اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری کے سانچے میں ڈھالنے والی ہی ہے۔

یہاں صرف اس طبعی فرق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے جو حقیقی عمل اور اداکاری کے درمیان ہوتا ہے۔

جب آپ کہتے ہیں کہ آپ نے زمین پر کوئی گھر بنایا ہے تو آپ کی بات ایسی سچی ہونی چاہیے کہ لوگوں کو اپنی آنکھوں سے وہ گھر نظر آئے۔

اسی طرح جب کہتے ہیں کہ میں نے اس کپڑے کو دھویا ہے تو لوگوں کو نظر آنا چاہیے کہ اس میں کوئی گندگی باقی نہیں رہ گئی ہے۔

اسلامی ارکان لوگوں کو بھلائی کے سانچے میں ڈھالنے اور آلائشوں سے پاک کرنے کے حقیقی عمل کی نمائندگی کرتے ہیں یہی اللہ تعالیٰ کے اس قول کا مفہوم ہے:

اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَ الْمُنْکَرِ ط (العنکبوت ۴۵) — یقیناً نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے۔

اب اگر آپ کسی نمازی کو دیکھتے ہیں کہ وہ باز نہیں آیا تو اس کی وجہ یہ نہیں کہ خبرِ الٰہی مشکوک ہے۔ بلکہ وجہ صرف یہ ہے کہ وہ شخص حقیقی نمازی نہیں بلکہ نماز کی اداکاری کرتا ہے۔

اسی طرح رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب فرماتے ہیں کہ "جس نے ایمان اور ثواب کی نیت کے ساتھ رمضان کے روزے رکھے اس کے پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں"۔ (بخاری)

تو یہ سچی خبر ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ روزہ برے ماضی کے اثرات مٹا دیتا ہے اور دل کا آئینہ پھر سے صاف شفاف کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ماضی کی آلائشوں سے پاک صاف ہو کر روزہ دار نئی زندگی شروع کرتا ہے۔ اب اگر آپ دیکھتے ہیں کہ کسی روزہ دار میں رمضان کے نتیجہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تو جان لیجئے کہ وہ اداکار تھا اور روزے کے نام پر کچھ وقت اس لیے کھانا پینا چھوڑے رہتا تھا کہ بعد میں پھر اسی میں غرق ہو جائے۔

اوراگر تم میں سے پہلا اور آخری، زندہ و مُردہ اورجوان و بوڑھا آدمی (سب کے سب) تم میں سے سب سے متقی شخص کے دل کی طرح ہوجائیں تب بھی میری بادشاہت میں مچھر کے پَر کے برابر بھی اضافہ نہیں ہوگا۔

اور اگر تم میں سے پہلا اور آخری، زندہ و مُردہ اورجوان و بوڑھا آدمی (سب کے سب) مجھ سے مانگنے لگیں یہاں تک ہر آدمی کی مانگ ختم ہوجائے اور میں وہ سب مانگیں پوری کردوں تب بھی میرے خزانے میں اتنی ہی کمی ہوگی جیسے تم میں سے کوئی سمندر میں سوئی کی نوک ڈبو کر نکال لے۔

کیونکہ میں سخاوت اور بڑائی والا ہوں، میں جو چاہتا ہوں کرتا ہوں۔ میری نوازش بھی بات ہے اور میرا عذاب بھی بات (یعنی بس منھ سے نکالنے کی دیر ہے)

میرا معاملہ تو یہ ہے کہ جب (کسی چیز کا) ارادہ کرتا ہوں تو اس سے کہہ دیتا ہوں ہوجا تو وہ ہوجاتی ہے۔" (مسلم)

○

اسلامی ارکان انفرادی طور پر مشروع نہیں کیے گئے ہیں کہ کوئی شخص اگر چاہے تو انھیں ادا کرلے اور اگر نہ چاہے تو نظر انداز کردے۔

بلکہ پوری ایک امت کے لیے مشروع کیے گئے ہیں کہ امت کے لوگ ایک دوسرے کی مدد سے انھیں قائم کریں، دل سے ان کے وفادار رہیں اور جماعتی طور پر ان شعائر کو سینے سے لگائے رکھیں اور نسلاً بعد نسلٍ یہ سلسلہ چلتا رہے۔

نماز کی مثال لیجیے۔ نماز اپنے مغز کے اعتبار سے بندے کی اپنے پروردگار سے سرگوشی کا نام ہے۔ لیکن اسلام نے اسے انفرادی عمل نہیں بنایا بلکہ اجتماعی نظام کی صورت دی۔

قرآن و سنت میں نماز پڑھنے کا لفظ نہیں استعمال کیا گیا بلکہ نماز قائم کرنے کی ہدایت کی گئی۔

هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ۔ (البقرہ ۲-۳)	ہدایت ہے ان پرہیزگار لوگوں کے لیے جو غیب پر ایمان لاتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں۔

علماء نماز قائم کرنے کا مطلب جماعت کے ساتھ ادائیگی لیتے ہیں کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "اپنی صفیں سیدھی کیا کرو کیونکہ ایسا کرنا نماز قائم کرنے کا حصہ ہے" (بخاری)

اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗۤ اَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝ (آل عمران - ۸۳)

اب کیا یہ لوگ اللہ کی اطاعت کا طریقہ (دین اللہ) کوئی اور چاہتے ہیں حالانکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں چار و ناچار اللہ ہی کی تابع فرمان ہیں۔ اور اسی کی طرف سب کو پلٹنا ہے۔

لوگوں سے یہی تو مطالبہ ہے کہ وہ اس کام کی ادائیگی کو پوری اہمیت دیں جس کے لیے انھیں پیدا کیا گیا ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی عبادت، اس کی نعمتوں کا احساس، اس کے سامنے پیشی کی تیاری اس کے عذاب سے ڈر اور اس کے انعام کی رغبت۔

اگر دنیا اس راہ پر نہیں چلتی تو اسے کوئی خیر و برکت نہیں مل سکتی۔

جب تک لوگوں کی ہتھیلیاں اس کی طرف پھیلی ہوئی ہیں اللہ تعالیٰ لوگوں کو اپنے فضل سے محروم نہیں کرسکتا، ہاں اگر لوگ اسے بھولنے ہی پر مصر رہیں گے تو خود بے چینی و پریشانی کا شکار رہیں گے اللہ تعالیٰ کو کیا نقصان ہوگا۔ اللہ تعالیٰ تو ان سے بے نیاز ہے ہی۔ اور وہ اللہ تعالیٰ کے انتہائی محتاج ہیں۔

حضرت ابوذرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے بنی آدم! تم میں سے ہر ایک گناہ گار ہے سوائے اس کے جسے میں بچالوں تو تم مجھ سے بخشش طلب کرو میں تمہیں بخش دوں گا۔

اور تم میں سے ہر ایک محتاج ہے سوائے اس کے جسے میں تونگر بنادوں تو مجھ سے مانگو میں نہیں دوں گا۔

اور تم میں سے ہر ایک گمراہ ہے سوائے اس کے جسے میں راستہ دکھادوں تو مجھ سے ہدایت مانگو میں تمہیں ہدایت دوں گا۔

اور جس نے مجھ سے بخشش مانگی ــــــ اور وہ یہ جانتا ہے کہ میں اسے بخش دینے کی قدرت رکھتا ہوں ــــــ میں اسے بخش دوں گا اور پرواہ بھی نہیں کروں گا۔

اگر تم میں سے پہلا اور آخری زندہ و مردہ اور بوڑھا و جوان آدمی (سب کے سب) تم میں سے سب سے بُرے آدمی کے دل کی طرح ہوجائیں تو میری بادشاہت میں مچھر کے پر کے برابر بھی کوئی کمی نہیں آئیگی۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَلِلّٰہِ عَاقِبَۃُ الْاُمُوْرِ ○ (الحج ۔ ۴۱)

یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اگر ہم زمین میں اقتدار بخشیں تو وہ نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے نیکی کا حکم کریں گے اور برائی سے منع کریں گے اور تمام معاملات کا انجام کار اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

کوئی بھی اسلامی حکومت جس طرح پولیس کے ذریعہ امن و امان کا تحفظ فراہم کرے گی، مختلف اسکیموں کے ذریعہ اقتصادی معیار بہتر بنائے گی۔ اسی طرح روحانی معیار بہتر بنانے کی تدبیریں بھی اختیار کرے گی اور نماز قائم کرنا ان میں شامل ہوگا۔

کوئی ناسمجھ ایسا گمان نہ کرلے کہ اسلام نہ ماننے والوں پر بھی اپنے شعار لادنا ہے ایسا ہرگز نہیں اسلام میں کوئی زبردستی نہیں۔

علماء کہتے ہیں کہ اگر کسی مسلمان کی بیوی عیسائی ہے تو وہ اسے اتوار کے دن گرجا گھر بھیجے گا تاکہ وہ اپنے مذہب کے مطابق عبادت کرسکے۔

اسلامی توانین وہدایات بہت ہیں اور پانچوں ارکان ان کا حصہ ہیں پورا اسلام انھیں پانچ ارکان کا نام نہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اسلام نام ہے وحی کے ذریعہ آنے والی ہر بڑی چھوٹی ہدایت کے سامنے مکمل سپردگی کا۔ اس وقت تک کسی شخص کا اسلام مکمّل نہیں ہوسکتا جب تک وہ ہر الٰہی ہدایت کے تعلّق سے اپنے قلب کی گہرائیوں سے یہ نہ کہہ اٹھے کہ:

سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَکَ رَبَّنَا وَاِلَیْکَ الْمَصِیْرُ ○ (البقرہ ۲۸۵)

ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی بلکہ ہم تجھ سے خطا بخشی کے طالب ہیں اور ہمیں تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔

احسان

سچّے ایمان اور مکمل اسلام کا لازمی نتیجہ احسان کی شکل میں نکلتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ○ (الکہف ۳۰)

رہے وہ لوگ جو مان لیں اور نیک عمل کریں یقیناً ہم نیکو کار لوگوں کا اجر ضائع نہیں کیا کرتے۔

آپ نے یہ جان لیا کہ ایمان نام ہے اللہ تعالیٰ کو بخوبی پہچاننے اور اس پر روزافزوں اعتماد کا اور اسلام نام ہے اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے سامنے مکمّل خودسپردگی اور اس کی رضا جوئی کا۔ توجب

حقیقت بھی یہی ہے کہ نماز کے لیے جمع ہونا نماز قائم کرنے کا حصہ ہے اور نماز پوری طرح قائم کرنے میں اس پر متوجہ ہونا، پورے ماحول کو اس سے آگاہ کرانا، اوقات کی پابندی، رکوع و سجود، قرآت و تسبیح کا اہتمام اور نماز ختم ہونے کے بعد اس کے معانی و مطالب کو زندہ کرنا شامل ہے۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا ۝ (النساء ۱۰۳)

پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو اور جب اطمینان نصیب ہو جائے تو پوری نماز پڑھو۔ نماز درحقیقت ایسا فرض ہے جو پابندیِ وقت کے ساتھ اہلِ ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔

دین کا تقاضا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سپردگی ایک عام اجتماعی مظاہرہ کی صورت میں ہو۔ خاص انفرادی مسلک کے طور پر نہیں۔

اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے نماز سب سے نمایاں عمل ہے اور اسی لیے مسجدیں تعمیر کی جاتی ہیں کہ ان میں لوگ صف در صف ہو کر ایک امام کے پیچھے کھڑے ہوں جو قرآن کریم کی تلاوت کرے اور پروردگار کی بزرگی بیان کرے۔

پھر ہر نماز سے پہلے مؤذن کی صدا خاموشی کے پردے کو چیرتی ہوئی یا زندگی کے شور و شغف کے اوپر غالب آتی ہوئی بلند ہوتی ہے اور لوگوں کو آگاہ کرتی ہے کہ وہ جو بھی کام کر رہے ہوں اسے چھوڑ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہونے کے لیے تیاری شروع کر دیں۔

زمان و مکان کی قید سے بلند ہو کر بار بار اٹھنے والی اذان کی یہ صدا ہر مسلم معاشرے کا نہایت اہم شعار ہے۔

خلیفۂ اول حضرت ابوبکرؓ کے دور میں جب فتنۂ ارتداد پھیلا تو مجاہدین کو یہی ہدایت کی گئی تھی کہ جب وہ کسی علاقہ میں پہنچیں اور بستی سے اذان کی آواز سنائی دے تو سمجھ لیں کہ وہ مسلمانوں کی بستی ہے اور اگر آواز نہ سنائی دے تو سمجھ لیں کہ مرتدین کا سامنا ہے۔

مسجد سے محبت اور اذان سے انسیت اسلام کی علامت ہے۔

کوئی سوال کر سکتا ہے کہ ان عام کاموں کا دین سے کیا تعلق ہے ؟

جواب یہ ہے کہ یہ سب عین عبادت ہیں اسی لیے فرض کفایہ کہلاتے ہیں، انجینئرنگ، طب، زراعت صنعت اور آباد کاری کے مختلف ذریعے اور پیشے اسلام کے ارکان ہیں اور لازماً احسان کے دائرے میں شامل ہیں۔ کیونکہ انسان ہی دینی سرگرمیوں کا محور اور آسمانی ہدایات کا مرکز ہے اور اس کی زندگی اور وجود اس وقت تک صحیح ڈھنگ سے برقرار نہیں رہ سکتے جب تک اس کی معاشی کفالت کا انتظام نہ ہو اور ماحول اس کی ضمانت فراہم کرنے میں تعاون نہ کرے۔

گویا پہلے انسانی وجود قائم ہوتا ہے پھر اس پر ذمّے داریاں آتی ہیں۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّيْلَ لِتَسْكُنُوْا فِيْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ؕ (یونس - ۶۷)

وہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی کہ اس میں سکون حاصل کرو اور دن کو روشن بنایا۔

وَجَعَلَ الَّيْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا ۝ (النبا ۱۰ - ۱۱)

اور رات کو پردہ پوش اور دن کو معاش کا وقت بنایا۔

لیل و نہار کی گردش ہی عمرانی سرگرمیوں کا دائرہ ہے جس سے دنیاوی زندگی استوار ہوتی ہے ساتھ ہی وہی دینی سرگرمیوں کا دائرہ بھی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اخروی زندگی کی ضمانت ملتی ہے۔

وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝ (الفرقان ۶۲)

اور وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن کو ایک دوسرے کا جانشین بنایا ہر اس شخص کے لیے جو سبق لینا چاہے یا شکر گزار ہونا چاہے۔

اس لیے ناگزیر ہے کہ انسان اپنی صلاحیت کے مطابق کوئی بھی کام کرے اور جس معاشرے میں وہ زندگی گزارتا ہے وہ اسے وہ کام کرنے پر مجبور کرے۔

کاموں کے اس بکھرے ہوئے جال سے ہی عام زندگی کی لہر رواں دواں ہوتی ہے اور لوگوں کی معیشت کا انتظام ہوتا ہے اگر معاش حاصل نہ ہو تو کوئی شخص بھی روزہ نماز نہ کر سکے گا۔

دوسرے الفاظ میں فرائض کفایہ کی تکمیل کے بعد ہی فرائض عین کا وجود ممکن ہے ہو سکتا ہے کہ ابتدائی دور میں کوئی قوم اس طرح زندہ رہی ہو کہ اس کے افراد کو بہت معمولی کوشش سے معاش حاصل ہو جاتی ہو۔

یہ عناصر اکٹھا ہو جائیں گے اور مکمل یقین اور نیک اعمال ظاہر ہونے لگیں گے تو انسان لامحالہ احسان کے مرتبے پر فائز ہو جائے گا۔

حدیث میں احسان کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ "آپ اللہ کی عبادت اس طرح کریں گو یا آپ اسے دیکھ رہے ہیں اور اگر آپ اسے نہیں دیکھ رہے ہیں تو وہ تو آپ کو دیکھ ہی رہا ہے"۔

عمل میں اللہ تعالیٰ کے سامنے حضوری کا تصوّر اسے پورے اہتمام اور خوبی کے ساتھ انجام دینے پر ابھارے گا۔ یہ کسی موہوم طاقت کا تصوّر نہیں ہوگا بلکہ ایسے وجود کا تصوّر ہوگا جو قائم وموجود ہے۔ پھر یہ تصوّر اس کے حق کو سمجھنے پر آمادہ کرے گا۔

اب اگر آدمی میں احساس کا یہ مرتبہ پیدا نہیں ہوتا تو دوسرے مرتبے سے نیچے تو جائے گا نہیں یعنی یہ احساس کہ اللہ تعالیٰ اس کی اور اس کے آس پاس کی ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔

عبادت میں دو قسم کے اعمال شامل ہوتے ہیں۔

۱۔ عین فرائض، جو ہر مکلف شخص پر عائد ہوتے ہیں اور ہر ہر فرد ان کی ادائیگی کے سلسلے میں جوابدہ ہوتا ہے۔

۲۔ وہ فرائض جن کے سلسلے میں معاشرے کو اجتماعی طور پر جوابدہی کرنی ہوگی اور اگر معاشرہ انھیں ادا نہیں کرتا تو اس کے تمام افراد قابلِ ملامت ہوں گے۔ فقہار کی اصطلاح میں انھیں فرض کفایہ کہا جاتا ہے۔

عین فرائض میں تمام انسان برابر ذمّے دار ہوتے ہیں روئے زمین پر کسی بھی انسان سے نہ تو نماز ساقط ہو سکتی ہے نہ اسے مثلاً زنا کی اجازت دی جا سکتی ہے۔

کیونکہ فرائض کا مقصد ہر نفس کا تزکیہ ہے ان کے بغیر کسی نفس کا تزکیہ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے وہ فرض عین ہوئے۔

فرض کفایہ کا تعلق بنیادی طور پر ان صلاحیتوں سے ہوتا ہے جو مختلف افراد میں مختلف درجے کی ہوتی ہیں پھر مختلف افراد کے رجحانات مختلف ہوتے ہیں۔ معاشرہ تبھی قائم رہ سکتا ہے جب ہر فرد وہ فریضہ انجام دے جسے وہ بخوبی انجام دے سکتا ہے۔ اگر سب لوگ کسان ہو جائیں تو تجارت کون کرے گا؟ اسی طرح سب لوگ صنعت کار ہو جائیں تو کھیتی کون کرے گا۔ ہر کام ہر شخص کے لیے دشوار ہے۔ فرد کی صلاحیت و رجحان کے لحاظ ہی سے کام بھی سپرد کیے جاتے ہیں۔

کاموں کی یہ تقسیم خود بخود ہوتی ہے اور معاشرے کی مصلحتیں اسی طرح پوری ہوتی ہیں۔ اگر کوئی معاشرہ اس کا انتظام نہیں کرتا تو وہ نقصان کے سلسلے میں جوابدہ ہوگا۔

اور نماز۔ بس فرق اتنا ہے کہ نماز روزہ کی ادائیگی ہر شخص کے لیے لازمی ہے اور فرض کفایہ کی ادائیگی ان لوگوں کے ساتھ خاص ہو گی جو اس کی اہلیت رکھتے ہوں۔

کوئی شخص اگر ایک پیشہ کے لیے ناموزوں ہے تو کسی دوسرے پیشے کے لیے موزوں ہوگا اور اسے اس کا مکلّف بنایا جائے گا۔

اور جب کسی شخص کو کسی اجتماعی فرض کے لیے چن لیا جائے تو وہ فوراً ہی اس کا ویسا ہی جوابدہ ہو جاتا ہے جیسے روزہ نماز کے لیے جوابدہ ہے۔ اس پیشہ میں احسان ویسا ہی ہوگا جیسا نماز میں احسان۔

اللہ تعالیٰ کی عبادت کھیت میں بھی وہی حیثیت رکھتی ہے جو مسجد میں۔ کارخانہ میں بھی اس کی عبادت اسی طرح کا درجہ رکھے گی جیسا سعی و طواف میں۔

میدان جدّ و جہد کے لیے طاقت حاصل کرنے کی غرض سے پیٹ بھر کھانا ویسا ہی ثواب رکھتا ہے جیسا روزہ کے لیے کھانا نہ کھانا۔ اطاعتوں کی شکلیں بہت سی ہیں اور احسان کا مقام بے حد و بے انتہا ہے۔

تمام کاموں کو حسن و خوبی کے ساتھ انجام دینا روئے زمین پر انسانی وجود کا مقصد ہے۔

تَبَارَكَ الَّذِي بِيَدِهِ الْمُلْكُ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ الَّذِي خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيَاةَ لِيَبْلُوَكُمْ أَيُّكُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۔ (الملك ۱-۲)

نہایت بزرگ و برتر ہے وہ جس کے ہاتھ میں (کائنات کی) سلطنت ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے جس نے موت اور زندگی کو ایجاد کیا تاکہ تم لوگوں کو آزما کر دیکھے کہ تم میں سے بہتر عمل کرنیوالا کون ہے

چونکہ انسان روئے زمین پر اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے اور اس کے تصرفات میں اس روحِ اعلیٰ کا اثر ہونا چاہیے جو اس میں پھونکی گئی تھی۔ اس لیے احسان کا تعلق اس کی اس آسمانی نسبت سے ہے جس کے مطابق:

الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ (السجدہ ۷)

جس نے ہر چیز کو بہترین انداز پر پیدا کیا۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ انسان سے جو کچھ صادر ہو وہ حسن و خوبی سے بہرہ مند ہو اس میں کوئی عیب و نقص نہ ہو۔

اگر وہ کھانے کے لیے کوئی جانور بھی ذبح کرتا ہے تو خوبصورتی اور نرمی کے ساتھ ذبح کرنا چاہیے۔ حضرت عمرؓ بن الخطاب نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ ذبح کرنے کے لیے ایک بکری کو پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے جا رہا ہے تو آپ نے فرمایا۔ تمہارا بُرا ہو اسے موت کی منزل تک خوبصورتی کے ساتھ لے جاؤ۔

اور لوگ محدود دائرے میں عمرانی جدوجہد کے بعد نماز روزہ جیسے عین فرائض میں مشغول ہو جاتے رہے ہوں۔ اور گروہوں کے مقابلہ میں افراد کی زندگی میں اس کا تصور زیادہ آسان رہا ہو۔

احسان ہر چیز میں لازمی ہے

ایک آدمی ایسا کر سکتا ہے کہ چند روٹیاں کھا کر اور معمولی کپڑے پہن کر کسی ویران یا آباد جگہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرے کہ گویا اسے دیکھ رہا ہے۔

جس ماحول میں اس طرح کے لوگ پائے جا سکتے ہیں اس کی ضروریات اس سے زیادہ نہیں ہو سکتیں کہ آٹے کی ایک چکی ہو، سوت کاتنے کا ایک چرخہ ہو اور ایک سادہ معاشرے کی ضروریات پوری کرنے والے بعض معمولی کام ہوں۔

لیکن اسلام اس ماحول کے لیے سازگار نہیں ہے بلکہ اس کا وجود بھی باقی نہیں رہ سکتا۔

اسلام اگر خانقاہی رہبانیت کا مذہب ہوتا تو کسی گوشہ میں پڑے رہ کر اور کسی طرح کی زندگی پر قناعت کر لیتا لیکن اسلام زندگی پر غالب آنا چاہتا ہے اور اس کی کجی کو دور کرنا اور سرکشوں سے پنجہ آزمائی کرنا چاہتا ہے۔ اس جدوجہد کے لیے بہت سی سرگرمیوں، تجربوں اور زندگی سے متعلق بہت سے علوم و فنون میں مہارتوں کی ضرورت ہے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اسلامی معاشرے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ اس میں ہر طرف انسانی نسلوں کے درمیان تمام علوم و فنون کا چرچا اور بول بالا ہو۔ پھر ان سارے میدانوں میں مسلمانوں کو مہارت کے اعتبار سے برتری حاصل ہو اور دوسروں کے مقابلے میں وہ فائق ہوں۔

ان شعبوں میں مہارت درجۂ احسان سے اوّلین تعلق رکھتی ہے۔ مثال کے طور پر دیکھئے اگر مسلمان دوا سازی کے میدان میں کمیونسٹوں اور صلیبیوں سے پیچھے ہیں بلکہ ان پر انحصار کرنے پر مجبور ہیں تو کیا وہ اس پسماندگی کے ذریعہ خود اپنے ساتھ یا اپنے دین کے ساتھ اچھا سلوک کر رہے ہیں؟

کیا وہ اپنے اعلیٰ اصولوں کو اپنی پسماندگی کے ذریعہ خود ہی شکست سے دوچار نہیں کر رہے ہیں۔

طباعت کے میدان کو لیجئے اگر وہ اس فن میں پسماندہ ہیں تو کیا وہ ذرائعِ ابلاغ پر قابو پا سکتے ہیں اور ہزارہا قارئین کے سامنے حقائق کو واضح کر سکتے ہیں۔

دوا سازی یا طباعت کے پیشے بھی اسلامی معاشرے پر اسی طرح فرض ہیں جس طرح روزہ۔

کلام کے لیے کچھ قواعد مقرر ہیں۔ کلام تبھی صحیح ہو سکتا ہے جب ان قواعد کے مطابق ہو پھر کلام کو محض قواعد کی مطابقت کی بنا پر بلیغ نہیں قرار دیا جا سکتا جب تک اس پر بلاغت کا چھاپہ نہ ہو۔

نماز کے ارکان اور سنتیں ہیں جنھیں ہر نمازی کو بحسن و خوبی جاننا چاہیے۔ نماز ان کے مطابق ہو تو صحیح ہو جائے گی لیکن تب بھی درجۂ احسان تک نہیں پہنچے گی۔ ایسا تبھی ہوگا جب تمام حرکات و سکنات میں خشوع و خضوع کی رُوح غالب ہو اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دل پورے خلوص کے ساتھ حاضر ہو۔

موٹر ڈرائیونگ کے لیے کچھ قواعد اور شرطیں ہوتی ہیں۔ ڈرائیونگ کی صلاحیت بہت سے لوگوں میں ہوتی ہے لیکن ایسی مہارت جو کار دوڑ کے مقابلوں میں حصّہ لینے کے لائق بنا دے بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔

احسان کوئی عام علم یا عام عمل نہیں ہے یہ تو نام ہے کسی چیز کو کمال کے درجہ میں پہنچا دینے کا اور مسلمان جو کام بھی ہاتھ میں لے اس سے اسی درجۂ کمال کا مطالبہ کیا جاتا ہے۔

عادات و عبادات میں بس اتنا ہی فرق ہے کہ نیک نیتی کے ساتھ عادتیں عبادتوں میں بدل جاتی ہیں بس فرق صرف اتنا ہے کہ عبادات کے لیے شریعت نے طریقے مقرر کر دیے ہیں جبکہ عادتیں لوگوں نے مرورِ زمانہ کے ساتھ اپنے علم و تجربہ سے اختیار کی ہیں۔

شریعت نے نمازوں کی تعداد اور ان کی ہیئت مقرر کر دی ہے جبکہ زراعت و مزروعات وغیرہ کی حد بندی نہیں کی۔ نمازوں کو اس نے فرض عین قرار دیا، جبکہ زراعت وغیرہ فرض کفایہ ہیں۔

لیکن ہر چیز کے تعلق سے احسان کے ضروری ہونے میں اس حد بندی کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔

بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے دنیاوی امور میں جدت و اختراع کا دروازہ کھلا رکھا ہے اور انسانوں کو یہ آزادی دی ہے کہ وہ جیسے چاہیں ان امور میں تصرف کریں۔

البتہ عبادات کو مسنون طریقوں کے ساتھ پابند کر دیا ہے ان میں کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں رکھی۔ اور اسی میں بھلائی ہے۔

○

وہ سارے کام جن سے ہر میدان میں قوم کی گاڑی چلتی ہے ان کے لیے مناسب صلاحیتوں والے افراد تیار کرنا ضروری ہے تاکہ ہر کام بخوبی انجام پا سکے۔

جناب مسیب بن دار کی روایت ہے کہ میں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ نے ایک اونٹ والے کو سرزنش کی اور فرمایا کہ تم نے اونٹ پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ کیوں لادا۔

جناب عاصم بن عبید اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ ایک شخص نے ذبح کرنے کے لیے بکری پکڑی اور چھرا تیز کرنے لگا تو حضرت عمرؓ نے اسے درّہ لگایا اور فرمایا کہ تم روح کو تکلیف پہنچا رہے ہو۔ بکری کو پکڑنے سے پہلے چھرا کیوں نہ تیز کرلیا؟

جناب وہب بن کیسان کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے ایک چرواہے کو کسی گندی جگہ مویشی چراتے دیکھا جبکہ اس کے قریب ہی اچھی جگہ تھی آپ نے فرمایا: تمہارا بُرا ہو تم مویشیوں کو یہاں سے ہٹاؤ۔ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ "ہر ذمّے دار اپنی رعیت کے بارے میں جوابدہ ہوگا"۔ (مسند احمد)

اگر کسی قاتل سے قصاص بھی لینا ہو تو ایسا نہیں کیا جاسکتا کہ مجرم ہونے کی وجہ سے کسی بھی طرح اس کی جان لے لی جائے، بلکہ حسن وخوبی کے ساتھ حکم خداوندی نافذ کیا جائے گا۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ نے ہر چیز کے لیے احسان واجب قرار دیا ہے اگر تم کو قتل کرنا پڑے تو اچھی طرح قتل کرو اور اگر ذبح کرنا ہو تو اچھی طرح ذبح کرو (جب تم میں سے کسی کو جانور ذبح کرنا ہو تو) اپنا چُھرا تیز کرلے اور اپنے ذبیحہ کو (جلد) نجات دے دے"۔ (بخاری)

"اللہ تعالیٰ کو یہ بات پسند ہے کہ تم میں سے کوئی شخص جب کوئی کام کرے تو اسے حسن وخوبی کے ساتھ انجام دے۔" (مسلم)

اور حسن وخوبی اور مہارت محض دعویٰ اور ناواقفیت سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر کام کے لیے چاہے وہ آسمانی ہو یا زمینی، کچھ قواعد مقرر کر رکھے ہیں جنھیں سیکھ کر اور مشق بہم پہنچا کر ہی وہ کام صحیح طور پر انجام دیا جاسکتا ہے۔

احسان کے قواعد

کوئی بھی شخص درجۂ احسان تک نہیں پہنچ سکتا جب تک ان قواعد کو اچھی طرح سمجھ نہ لے اور پوری مہارت کے ساتھ انجام دینے کی صلاحیت بہم نہ پہنچالے۔

اس کا مظلوم کی داد رسی، حق کی مدد اور ظلم و ستم کے استیصال کے لیے ایک گھنٹہ بیٹھنا برسوں کی نفلی عبادات سے بہتر ہے۔

جس پر شہوت کا غلبہ ہو اس کے لیے روزہ رکھنا دیگر نفلی عبادتوں سے بہتر ہے۔

دیکھیے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک طرف حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت عمروؓ بن العاص وغیرہ کو تو حکومتی ذمے داریاں سونپتے ہیں اور حضرت ابو ذرؓ سے فرماتے ہیں: "میں تمہیں کمزور پاتا ہوں اس لیے تمہارے لیے بھی وہی پسند کرتا ہوں جو خود اپنے لیے پسند کرتا ہوں کسی دو آدمیوں کی سرداری بھی قبول نہ کرنا نہ کسی یتیم کے مال کی ذمے داری قبول کرنا۔"

پھر انھیں روزہ رکھنے کی ہدایت فرمائی اور کہا کہ اس کا کوئی بدل نہیں۔

ایک دوسرے شخص کو ہدایت فرمائی کہ غصّہ نہ کیا کرو۔

ایک تیسرے شخص کو ہدایت دی کہ اس کی زبان برابر ذکرِ الٰہی سے تر رہا کرے۔

اور جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو درجۂ کمال تک پہنچانا چاہتا ہے تو اس کی فطری صلاحیت کے مطابق اس کے لیے آگے بڑھنے کا موقع فراہم کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ درجہ امتیاز تک پہنچ جاتا ہے۔

جیسے کسی مریض کو پیٹ کے درد کی شکایت ہو اور اس کی دوا دے دی جائے تو اسے فائدہ ہوگا اور سر کے درد کی دوا دے دی جائے تو فائدہ نہیں ہوگا۔

بخل مہلک بیماری ہے اسے سو سال کا روزہ، نماز بھی دُور نہیں کر سکتا۔

اسی طرح خواہشِ نفس کی پیروی اور خود پسندی کا مرض کثرتِ ذکر سے نہیں جا سکتا۔ یہ بیماری تو اسی وقت دُور ہو گی جب دل میں اس کی مخالف چیز داخل کی جائے۔ اگر دریافت کیا جائے کہ روٹی زیادہ اہم ہے یا پانی؟ تو جواب یہی ہو گا کہ روٹی اپنی جگہ زیادہ اہم ہو گی اور پانی اپنی جگہ۔

یہی حال مختلف عبادات کا ہے۔

○

ذاتی و اجتماعی بھلائی

عام لوگ زندگی کی عام ضرورتوں اور ظاہری چیزوں میں پھنسے رہتے ہیں وہ عام طور پر اپنے حال کو بہتر بنانے یا برقرار رکھنے کی فکر میں رہتے ہیں ان کا دائرۂ فکر محدود ہوتا ہے۔

امام شاطبیؒ کہتے ہیں کہ اس کے لیے دو مرحلے ضروری ہیں۔ ایک عام تعلیم کا، دوسرا خاص تیاری کا۔ اللہ تعالیٰ مخلوق کو اس حال میں پیدا کرتا ہے کہ وہ دنیا و آخرت کی اپنی مصلحتوں سے واقف نہیں ہوتی۔

وَاللّٰہُ اَخْرَجَکُمْ مِنْ بُطُوْنِ اُمَّھَاتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا۔ (النحل - ۷۸)

اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے نکالا اس حالت میں کہ تم کچھ نہ جانتے تھے۔

پھر تدریجی طور پر لوگوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کرتا ہے۔ کبھی الہام کے ذریعہ، جیسے نوزائیدہ بچے کو دودھ پینے کا طریقہ سکھانا، کبھی تعلیم کے ذریعہ کہ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ تمام ایسی چیزیں سیکھیں جن سے اپنی ضرورتیں پوری کرسکیں اور نقصانات سے بچ سکیں اور اس کے لیے ان میں فطری صلاحیتیں رکھی گئی ہیں۔

پھر جیسے جیسے علم سیکھنے کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے انسان اپنے طبعی رجحان کے مطابق مختلف علوم و فنون میں اپنی توجہ خاص کرلیتا ہے اور ان میں مہارت حاصل کرتا ہے، کوئی ادب میں کوئی سائنس میں، کوئی ٹکنیکل کاموں میں کوئی کھیل کود میں، کوئی سیاست و قیادت میں وغیرہ وغیرہ۔

صحیح تربیت کا تقاضا ہے کہ انسانوں کے رجحانات کے مطابق ان کی صلاحیتوں کو پروان چڑھایا جائے تبھی وہ درجہ کمال تک پہنچ سکیں گے اور مختلف ذمّے داریاں سنبھال سکیں گے اور ہر کام اور پیشہ کے لیے کچھ لوگ انجام دینے والے فراہم ہوں گے۔ اور یہ فرض کفایہ ہے۔

یہی حال انسان کی ذہنی و معنوی تربیت کا بھی ہے۔

علامہ ابن قیمؒ فرماتے ہیں:

ایک مالدار جو کافی دولت رکھنے کے باوجود بخل کی وجہ سے خرچ نہیں کرنا چاہتا، اس کا صدقہ و ایثار کرنا، رات دن نفلی نماز روزہ کرنے سے بہتر ہے۔

وہ بہادر جس کی شجاعت سے دشمن خوف کھاتا ہو، اس کا جہاد کرنا اور میدانِ جنگ میں کھڑا ہونا نفلی حج، روزہ اور صدقہ کرنے سے بہتر ہے۔

جو عالم سنت، حرام و حلال اور نیکی و بدی کی چیزوں سے واقف ہو اس کا لوگوں میں مل جل کر انھیں سکھانا عزلت نشینی اور نفلی عبادات سے بہتر ہے۔

وہ حاکم جسے اللہ تعالیٰ نے بندوں کے درمیان فیصلے کرنے کے لیے ذمّہ دار بنایا ہے،

ذکر انسان کی ذات سے دُور کوئی نفسیاتی تاثر یا دنیاوی زندگی سے بے تعلق کسی وہم و تخیل کا نام نہیں۔

اللہ تعالیٰ ایک لمحہ کے لیے بھی انسانوں سے دُور نہیں وہ جہاں بھی ہوں ان کے ساتھ رہتا ہے۔ اس لیے یہی مناسب ہے کہ اس کے وجود کو محسوس کیا جائے، لوگ جو چاہیں کریں مگر اس یقین کے ساتھ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے ہی ہیں کبھی اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہو سکتے۔

فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيْهِم بِعِلْمٍ وَمَا كُنَّا غَائِبِينَ ۝ (الاعراف ۷)

پھر ہم خود پورے علم کے ساتھ ساری سرگذشت ان کے سامنے پیش کر دیں گے، آخر ہم کہیں غائب تو نہیں تھے۔

اللہ تعالیٰ کی یاد بہترین عبادت ہے زبان پر جاری ہونے والے بہترین کلمات ذکر کے ہی ہوتے ہیں، دلوں میں جاگزیں ہونے والی سب سے پاک چیز ذکر ہی ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ سے براہ راست تعلق کی کنجی ہے۔ انسان کے دل میں جیسے ہی ذکر جلوہ نما ہوتا ہے اور اس کے ہونٹ ذکر سے ہلتے ہیں اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت کا دروازہ کھل جاتا ہے جیسا کہ حضرت ابوذرؓ کی روایت میں ہے کہ:

"میں اپنے بندے کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے یاد کرتا ہے اور میرے ذکر سے اس کے ہونٹ ہلتے ہیں۔" (ابن ماجہ)

حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جسے چار چیزیں مل گئیں اسے دنیا و آخرت کی بھلائی مل گئی۔" شکر گزار دل، ذکر کرنے والی زبان، آزمائش و مصیبت پر صبر کرنے والا بدن اور ایسی بیوی جو اس کے لیے خود اپنے بدن اور اس کے مالی کے تعلق سے کوئی برائی نہ چاہے۔ (طبرانی)

ذکر الٰہی کے سلسلہ میں، صالحین، زبردست کوشش کرتے رہے ہیں اور اس سے اپنے دل و دماغ کو اس طرح مربوط کرتے رہے ہیں کہ نہ تو زندگی کے ہنگاموں میں کبھی اس سے کنارہ کشی کی اور نہ بڑی سی بڑی نعمت یا آزمائش نے انھیں اس سے غافل کیا۔ انھوں نے ذکر الٰہی کو احسان کے مرتبہ تک پہنچانے والا تیز راستہ سمجھا جو زندگی کی تمام تر مفید و مضر سرگرمیوں اور خلوت و جلوت میں اسے اپنے سے منحرف نہیں ہونے دیتا۔

آپ دنیا کے مختلف حصّوں میں جاری ہنگاموں اور مسائل کا جائزہ لیجیے تو ان کی پُشت پر ذاتی خواہشات کی تکمیل کے لیے تگ و دو ہی کارفرما نظر آئے گی۔

اس شور ہنگامہ میں ایمان کی منطق دب کر رہ گئی۔

منکرِ خدا لوگوں کا معاملہ تو ظاہر ہی ہے عام مسلمانوں میں بھی خدا کی معرفت مخفی سی رہتی ہے جو کبھی کبھی انھیں مسجدوں تک پہنچا دیتی ہے یا کبھی کبھی حرام چیزوں سے روک دیتی ہے لیکن پوری زندگی میں اس کی نمایاں چھاپ نظر نہیں آتی۔

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو اس بات پر اُبھارا ہے کہ وہ اس عام ذہنی خفتگی کی مزاحمت کریں اور دنیا کی بھلوانے والی چیزوں کے باوجود اسے یاد کرنے اور دنیا کی پریشانیوں اور تاریکیوں میں اس کی ذات سے روشنی حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

جی ہاں! یہ ضروری ہے کہ لوگ اپنے آپ کو ڈوبنے سے بچائیں اور اس کے لیے سوائے اس کے کوئی راستہ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کا زیادہ سے زیادہ ذکر کیا جائے، اس کے اسمائے حسنیٰ کو ذہن نشین رکھا جائے اور ہر وقت اور ہر حال میں اس سے گہرا تعلق رکھا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر برابر کرتے رہنے کی ہدایتوں میں یہی راز پنہاں ہے۔

وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ (الاعراف ۲۰۵)

اے نبی اپنے رب کو صبح و شام یاد کرو دل ہی دل میں زاری اور خوف کے ساتھ اور زبان سے بھی ہلکی آواز کے ساتھ تم ان لوگوں میں سے نہ ہو جاؤ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيْرًا ۝ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ (الاحزاب ۴۱-۴۲)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو، اللہ کو کثرت سے یاد کرو اور صبح و شام اس کی تسبیح کرتے رہو۔

فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۔ (النساء ۱۰۳)

پھر جب نماز سے فارغ ہو جاؤ تو کھڑے اور بیٹھے اور لیٹے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے رہو۔

لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۔ (الانفال۔ ۴۵)

کثرت سے یاد کرو تو توقع ہے کہ تمہیں کامیابی نصیب ہوگی۔

اللہ تعالیٰ کی یاد اسے معرکہ کے تمام مراحل میں خاص طور پر جنگ کی شدت، دشمن کے چڑھے آنے، فتح کے آثار کی دوری اور دوستوں کے شہید ہوکر گرنے اور زخموں سے چور چور ہونے کے اوقات ہیں۔

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ إِلَّا أَنْ قَالُوا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَإِسْرَافَنَا فِي أَمْرِنَا وَثَبِّتْ أَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ○ فَآتَاهُمُ اللَّهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْآخِرَةِ ۗ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ۔ (آل عمران ۱۴۷۔ ۱۴۸)

ان کی دُعا بس یہ تھی کہ "اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما ہمارے کام میں تیرے حدود سے جو کچھ تجاوز ہوگیا اسے معاف کردے اور ہمارے قدم جمادے اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد کر آخر کار اللہ نے ان کو دنیا کا ثواب بھی دیا اور اس سے بہتر ثوابِ آخرت بھی عطا کیا اللہ کو ایسے ہی نیک عمل لوگ پسند ہیں۔

جی ہاں! اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے پامردی کے ساتھ کیا جانے والا یہ جہاد احسان ہے اور وہی حدیث کے ان الفاظ کا سب سے زیادہ مصداق ہے کہ "تم اپنے رب کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہیں دیکھ رہے تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے"۔

کون کہتا ہے کہ اللہ کی راہ میں انفاق ذکرِ الٰہی نہیں ہے۔ یہ تو عملِ ذکر ہے جس کا اپنا مقام ہے اور زبان کے ذکر سے ـــــ چاہے وہ حضورِ قلب کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو ـــــ زیادہ بلند مرتبہ ہے۔

ہزار ہا لوگ مال کی محبت میں کیا کیا نہیں کر گزرتے۔

بسا اوقات وہ اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اس کی قائم کردہ حدود و ہدایات کو بھی فراموش کر بیٹھتے ہیں اور بسا اوقات وہ زیادہ سے زیادہ مال کی طلب میں عزت و بھلائی کی بہت سی باتوں کو پامال کر ڈالتے ہیں۔

یہاں ہم ذرا رک کر ایک شبہ کا ازالہ کرنا چاہیں گے جس سے بہت سے لوگ دھوکہ کھاتے رہے ہیں۔ ذکرِ الٰہی اور اس کے اعلیٰ معانی سے انسیت اور اس کے نتیجہ میں پیدا ہونے والے صفائے قلب نے کچھ صالحین کو یہ سمجھنے پر آمادہ کر دیا کہ ذکرِ الٰہی ذریعہ نہیں بلکہ خود مقصود بالذات ہے چنانچہ وہ دیگر چیزوں سے بے نیاز ہو گئے اور انھیں یہ گمان ہونے لگا کہ احسان کا مرتبہ اسی سے حاصل ہوتا ہے۔ ان کی اس غلط فہمی کو شاید حضرت ابوالدرداءؓ کی اس روایت سے بھی تقویت ملی ہو کہ:

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: کیا میں تمہیں اس عمل سے آگاہ نہ کر دوں جو تمہارے اعمال میں سب سے بہتر، تمہارے پروردگار کے نزدیک سب سے پاکیزہ، تمہارے درجات کو سب سے زیادہ بلند کرنے والا، سونے چاندی کو خرچ کرنے سے زیادہ اچھا اور اس سے بھی بہتر ہے کہ دشمنوں سے تمہارا سامنا ہو اور تم ان کی گردن مارو اور وہ تمہاری گردن ماریں؟

لوگوں نے عرض کیا : کیوں نہیں یا رسول اللہ!

آپؐ نے فرمایا : اللہ تعالیٰ کا ذکر۔

حضرت معاذؓ کہتے ہیں جس نے اللہ تعالیٰ کا ذکر کیا وہ کوئی عذاب الٰہی نہ چکھے گا (مسند احمد بن حنبل)

اس حدیث کی تکذیب مقصد نہیں بلکہ اس کو گہرائی سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

کون کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے مجاہدین ذاکرین کے مقابلہ میں ایک دوسرا گروہ ہیں اور انھیں میزان کے دوسرے پلڑے میں رکھا جائے گا اور یہ کہ یہ پلڑا دوسرے پلڑے سے بھاری ہے؟

اللہ کی راہ میں جہاد تو ذکر کا اعلیٰ ترین درجہ ہے۔ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا شخص نہ یہ کہ خود اپنے رب کو جانتا ہے بلکہ وہ اس معرفت کو زندگی میں بو کر اس وقت تک اپنے خون سے اس کی آبیاری کرنا چاہتا ہے جب تک وہ بیج پروان نہ چڑھ جائے۔

مجاہد تو ایڑی چوٹی تک ذکرِ الٰہی میں ڈوب کر دوسروں کو اللہ تعالیٰ کی یاد دلاتا ہے۔

اسے دونوں لشکروں کے مڈبھیڑ کے وقت اپنے رب کی یاد آتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

یَآ اَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِذَا لَقِیْتُمْ	اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب کسی گروہ سے
فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا	تمہارا مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو

ہوسکتا ہے چاہے وہ گوشہ گیر خانقاہوں میں ہو یا بھری مجلسوں میں۔ اسی لیے اذکار کی کثرت اور زیادہ سے زیادہ تسبیحات کو ترجیح دینے لگے۔

ہم کسی قابلِ احترام عبادت کی قدر و منزلت گھٹانے سے خدا کی پناہ چاہتے ہیں اور اس سے دُعا مانگتے ہیں جیسا کہ اس نے اپنے نبیؐ کی زبان میں ہمیں سکھایا ہے کہ :

"اے اللہ اپنے ذکر و شکر اور بہترین عبادت کے سلسلے میں ہماری مدد فرما۔"

تاہم ان بزرگوں کے مسلک کو پسند کرنے والوں کو ہم اس طرف متوجہ کرنا ضرور چاہیں گے کہ احسان کا مرتبہ اس سے زیادہ صحیح اور صراطِ مستقیم سے قریب تر مسلک کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

ابن عطاء اللہ سکندریؒ جو اکابر صوفیائے اولین میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ذکر کا شوق دلاتے ہوئے فرماتے ہیں کہ حضوریٔ قلب نہ حاصل ہونے کی صورت میں بھی ذکر نہ چھوڑو کیونکہ یہ غفلت زیادہ سنگین ہو گی۔ ہو سکتا ہے اللہ تعالیٰ غفلتِ قلب کے ساتھ ذکر کی وجہ سے بیداریٔ قلب کے ساتھ ذکر کے مرتبہ تک، بیداریٔ قلب کے ساتھ ذکر سے حضوریٔ قلب کے ساتھ ذکر کے مرتبہ تک اور حضوریٔ قلب کے ساتھ ذکر کے مرتبہ سے ذوق و شوق کے ساتھ ذکر کے مرتبہ تک پہنچا دے اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ بھی دشوار نہیں۔

ابن عطاء اللہ کا خیال ہے کہ آدمی کو ذکر ترک نہیں کرنا چاہیے چاہے اس کا دل کسی اور چیز میں مشغول کیوں نہ ہو کیونکہ ذکر پر مداومت اسے اعلیٰ مراتب تک پہنچا دے گی۔

جب اللہ تعالیٰ کی عنایت ہر وقت انسان پر سایہ فگن ہے تو یہ کتنی بری بات ہو گی کہ وہ اسے فراموش کر دے یا اس کی یاد سے اکتاہٹ محسوس کرے۔

کبھی انسان محض زبان سے ذکر کو بے فائدہ سمجھ کر اسے چھوڑ بیٹھتا ہے جبکہ اسے برابر ذکر پر قائم رہنا چاہیے کیونکہ اس کا انجام بہتر ہے اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ ایسا نہیں ہے تو بھی چپ رہنے سے ذکر بہر حال بہتر ہے کیونکہ ایک عضو کا بھی اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں مشغول رہنا اس کی نافرمانی سے روکنے کا ذریعہ ہے۔ پھر جب ذکر کی مداومت دل سے غفلت کے پردے چاک کر دے اور انسان کے شعور و احساس کو بیدار کر دے تب تو وہ زبان و دل دونوں سے ذکرِ الٰہی میں منہمک ہو جائے گا۔

ابن عطاء اللہ انسان کو غفلت کی حالت سے بچانا چاہتے ہیں کہ کہیں وہ محض زبان سے ذکر کو بے نتیجہ

اگر مالداروں میں کوئی ایسا ملتا ہے جو مال کے حصول اور اس کے خرچ کے سلسلہ میں اپنے رب کو یاد کرتا ہے اور بھلائی کے کاموں میں خرچ کرتا ہے تو کیا وہ ذاکرین کی صفِ اول میں نہیں ہوگا۔

قرآن نے انفاق کو ہی اس آیت میں ذکر قرار دیا ہے:

يَآ اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ٥ وَاَنْفِقُوْا مِنْ مَّا رَزَقْنٰكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ فَيَقُوْلَ رَبِّ لَوْلَآ اَخَّرْتَنِيْٓ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ فَاَصَّدَّقَ وَاَكُنْ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ٥

(المنافقون ۹ - ۱۰)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو تمہارے مال اور تمہاری اولادیں تم کو اللہ کی یاد سے غافل نہ کردیں جو لوگ ایسا کریں گے وہی خسارے میں رہنے والے ہیں جو رزق ہم نے تم کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ قبل اس کے کہ تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور اس وقت وہ کہے کہ "اے میرے رب کیوں نہ تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت اور دیدی کہ میں صدقہ دیتا اور صالح لوگوں میں شامل ہوجاتا۔

مذکورہ حدیث کا واحد مطلب یہ ہے کہ مجرد ذکر اس جہاد سے افضل ہے جس میں مالِ غنیمت کی محبت اور شہرت کی طلب بھی شامل ہو اسی طرح اس انفاق سے بھی افضل ہے جس میں احسان جتانا اور ریاکاری بھی شامل ہوں۔

یعنی حدیث کا مقصد ہے اللہ تعالیٰ کے ذکر اور اللہ تعالیٰ سے طلب کے ذریعہ نفس کا تزکیہ۔ وہ پاکیزہ نیت کو گندے عمل سے بہتر قرار دیتی ہے اور یہ صحیح اور حق ہے کیونکہ نیک اعمال میں جو آفتیں شامل ہوجاتی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی قدر و قیمت ختم کردیتی ہیں اور معاشرہ کے لیے اس کے فوائد ختم ہوجاتے ہیں۔

مطلوب ذکر کی حقیقت

پچھلی صدیوں میں بہت سے مسلمانوں نے ایسا سمجھا کہ ذکر ــــ کسی دوسرے عمل کے مقابلہ میں ــــ اللہ تعالیٰ کو زیادہ راضی کرنے والا ہے یا یہ کہ احسان کا درجہ طویل ذکر سے ہی حاصل

ساتھ فرد اور معاشرہ کا وجود مربوط ہے۔

کوئی جذبہ بھڑک سکتا ہے لیکن اسے حدود کے اندر رہنا چاہیے۔

ہم اس حالت کو فنا کا نام دینا بھی پسند نہیں کرتے کیونکہ یہ تعبیر بعض لوگوں کے لیے اپنی ذات سے کنارہ کشی کا ذریعہ بن چکی ہے۔

کچھ لوگ اسے وحدتِ شہود کا نام دیتے ہیں تاکہ وحدتِ وجود کی خرافات کی نفی کر سکیں۔

ابن عطاء اللہ کی تعبیر، صحیح ہونے کے باوجود، اسی طرح کی ممنوع چیزوں کا راستہ ہموار کرتی ہے چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ان کی عبارت کی تشریح کرتے ہوئے ابن عجیبہ لکھتے ہیں: کہ

اگر تم حضوری قلب کے ساتھ ذکر پر مداومت کرو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں مذکور کے علاوہ ہر ذکر سے دُور کر دے گا کیونکہ تمہارے دل پر نور چھا جائے گا اور بسا اوقات مذکور کا نور اتنا قریب ہو جائے گا کہ ذاکر نور میں ڈوب جائے گا اور ہر ماسوا سے دُور ہو جائے گا۔ یہاں تک کہ ذاکر مذکور، طالب مطلوب اور واصل موصول ہو جائے گا اور یہ اللہ تعالیٰ کے لیے دشوار نہیں۔ آگے لکھتے ہیں:

"دلوں سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والے اپنی زبانوں سے اللہ تعالیٰ کے ذکر کی حالت میں تارکینِ ذکر سے زیادہ غفلت کا شکار ہوتے ہیں کیونکہ زبان سے ذکر وجودِ نفس کا متقاضی ہوتا ہے اور یہ شرک ہے اور شرک غفلت سے زیادہ بُرا ہے"۔

ہم اس پورے کلام کو یکسر مسترد کرتے ہیں بلکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ابن عطاء اللہ کی مراد ہرگز یہ نہیں تھی، ذاکر قطعی طور پر مذکور نہیں ہو سکتا۔

اور مخلوق جب یہ محسوس کرے کہ وہ خالق نہیں ہے تو یہ توحید نہیں شرک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ صوفیہ کی عبارتوں میں اس طرح کی گنجلک باتوں نے ہی یہ رائے قائم کرنے پر مجبور کیا ہے کہ ایسی عبارتوں کی چاہے جتنی تشریح کی جائے اور حقیقت کے بجائے مجاز پر محمول کرنے کی بات کی جائے انھیں تعلیم و تربیت کے میدان سے دُور ہی رکھنا چاہیے۔

کتاب و سنت میں جس احسان کا ذکر آیا ہے وہ اس ذاتی استغراق اور اس گہرے غور و فکر جس میں کبھی کبھی انسان اپنے آپ سے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے ـــــ سے الگ اور ہی چیز ہے۔

مسلمان ـــــ اگر اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہے ـــــ تو کسی محدود

سمجھ کر زندگی کے ہنگاموں میں بالکل ہی کھو کر نہ رہ جائے اور اس کے دل میں کبھی ذکرِ الٰہی کا خیال بھی نہ آئے۔

یہ ذہین صوفی ہمیں حالتِ استغراق کی طرف مائل کرنا چاہتے ہیں۔ استغراق کی حالت ہوتی کیا ہے؟

عام زندگی میں بھی استغراق کی کیفیت اثر انداز ہوتی ہے۔

ایک آدمی آپ سے قریب راستہ پر جارہا ہوتا ہے آپ اُسے بلند آواز سے پکارتے ہیں پھر بھی وہ متوجہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ کسی اور ہی فکر میں غرق ہوتا ہے وہ اپنے آس پاس سے بے فکر آگے بڑھ رہا ہوتا ہے۔

میں نے خود اپنے آپ پر اس کا تجربہ کیا ہے۔ جامع ازہر میں جمعہ کے روز میں منبر کے قریب بیٹھا تھا ہزاروں لوگ جمع تھے میں اپنے ذہن میں خطبہ کے مضامین ترتیب دے رہا تھا جو کچھ ہی دیر بعد مجھے دینا تھا۔ مسجد میں قاری لاؤڈ اسپیکر سے تلاوت کر رہا تھا، جب میں اپنے ذہنی استغراق سے نکلا تو مجھے کچھ خبر نہیں تھی کہ قاری نے کہاں سے تلاوت شروع کی تھی۔ گویا میں نے اس کی آواز سنی نہیں تھی۔

صالحین میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جن کے دل مزکّٰی ہو چکے ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی محبّت ان میں اس طرح جاگزیں ہو چکی ہوتی ہے کہ انھیں دیر دیر تک کسی اور طرف ملتفت ہی نہیں ہونے دیتی۔

اس میں تعجب کی بات بھی کیا ہے۔ ایمان کبھی سمندر کی موجوں کی طرح لہریں مارتا ہے کبھی بالکل پُرسکون ہو جاتا ہے۔

اہلِ ایمان کی زندگی میں یہ لمحے عام ہیں۔

میں اسے فنا یا جذب کا نام دینا پسند نہیں کرتا کیونکہ اس طرح کی اصطلاحات ناقص ہیں سوال یہ ہے کہ کیا یہ لمحے بجائے خود مقصود ہیں؟

جواب ہے کہ نہیں۔ یہ حالتیں گزر جانے کی ہیں منزلِ مقصود نہیں۔

ان حالتوں کو ان عظیم کاموں میں بدل جانا چاہیے جنھیں شریعت نے بتایا ہے اور جن کے

اس کپڑے سے لے کر جو تم ستر پوشی اور زینت کے لیے پہنتے ہو۔ اس کفن تک جو ایک خاص طریقے سے میت کو لپیٹنے اور زمین میں دفن کرنے کے لیے اختیار کرتے ہو۔

احسان تمام احوال و اعمال کو اپنے دائرے میں لیتا ہے۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَمَا تَتْلُو مِنْهُ مِنْ قُرْآنٍ وَلَا تَعْمَلُونَ مِنْ عَمَلٍ إِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُودًا إِذْ تُفِيضُونَ فِيهِ (یونس ۶۱)

اے نبی تم جس حال میں بھی ہوتے ہو اور قرآن میں سے جو کچھ سناتے ہو اور لوگو تم بھی جو کچھ کرتے ہو اس سب کے دوران ہم تم کو دیکھتے رہتے ہیں۔

ذکر اجتماعی عبادت ہے

بہت سی آیات کا خاتمہ اللہ تعالیٰ کے ایسے اسمائے حسنیٰ پر ہوتا ہے جن کے معانی بندوں کے افعال سے مناسبت رکھتے ہوں اور ان سے قریب ہوں۔

اس میں یہ راز پنہاں ہے کہ لوگوں کو یہ محسوس کرایا جائے کہ وہ چاہے جس میدان میں سرگرم عمل ہوں اللہ تعالیٰ کی نگرانی ان سے نہیں ہٹتی۔

معرفت الٰہیہ کے جلوہ فگن ہونے کے لیے کسی دور دراز گوشہ کی خانقاہ یا مسجد کی محراب ہی لازمی نہیں بلکہ مومن روزانہ جو دسیوں کام کرتا ہے ان سب میں یہ معرفت اس کے ساتھ ہوتی ہے۔

وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ٥ (البقرہ ۲۱۱)

(اور پھر یہ بھی انہیں سے پوچھ لو کہ) اللہ کی نعمت پانے کے بعد جو قوم اس کو شقاوت سے بدلتی ہے اسے اللہ کیسی سخت سزا دیتا ہے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ کی (سزا دینے والی) صفت مومن کو یہ احساس دلاتی ہے کہ اس پر اللہ تعالیٰ کی نگرانی مسلسل ہے اس لیے اس سے ڈرتے رہنا چاہیے۔

وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ۔ (الانفال ۔ ۴۹)

اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے تو یقیناً اللہ بڑا زبردست اور دانا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ کی (عزیز و حکیم) کی صفات یہ اطمینان و اعتماد پیدا کرتی ہیں کہ مومن کو ہر حال

خانقاہ کے اندر بند نہیں ہو سکتا۔ اس کی خانقاہ تو یہ لمبی چوڑی دنیا ہے جسے وہ مطلوبہ ذمّے داریاں ادا کر کے اور ماہرانہ عمل سے سنوارتا ہے۔

احسان اس کا نام نہیں کہ عبادات کے کسی ایک جزو کو خوب سنوارا جائے اور دوسرے ان اجزاء کو نظر انداز کر دیا جائے جو ہو سکتا ہے زیادہ اہم اور برتر ہوں۔ احسان تو نام ہے فرائضِ عین اور فرائضِ کفایہ کو ساتھ ساتھ ادا کرنے اور دنیا و آخرت کے معاملات کے ساتھ ساتھ عہدہ برآ ہونے کا۔

احسان یہ ہے کہ انسانی زندگی میں امرِ الٰہی کے حقائق کو مرتسم کیا جائے اور زمین کے حالات پر آسمانی رنگ چڑھایا جائے۔

احسان محض ذکرِ الٰہی کے نام پر کاموں سے فرار کا نام نہیں بلکہ ہر کام کو ذکرِ الٰہی کے ساتھ سنوارنے کا نام ہے۔

حضرت معاذ بن جبل کی روایت ہے کہ ایک شخص آیا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مجاہدین میں سب سے زیادہ اجر کس کو ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ ذکر کرنے والا ہے اس نے پھر دریافت کیا صالحین میں سب سے زیادہ اجر کسے ملے گا؟ آپؐ نے فرمایا: جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ ذکر کرنے والا ہے۔ اس نے پھر نماز، زکوٰۃ، حج اور صدقہ کے تعلق سے بھی وہی سوال دہرایا۔ آپ نے ہر بار یہی فرمایا کہ جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ ذکر کرنے والا ہے۔

حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ سے فرمایا: ذکر کرنے والے ہی سب بھلائی لے گئے۔
رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں۔ (مسند احمد بن حنبل)

یہ وہ ذکر ہے جو اعمال کے ساتھ ملا ہوتا ہے اور جس میں استغراق دل کے خلوص، ہاتھ کی مہارت اور انتہائی شرافت میں بدل جاتا ہے۔

احسان نگرانی و مشاہدہ کا نام ہے اور ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نگرانی ایک کام کو اپنے دائرے میں لے اور دوسرے عمل کو چھوڑ دے۔ وہ تمام اعمال کا احاطہ کرتی ہے۔

اس لقمہ سے لے کر جو تم اپنی بیوی کو کھلاتے ہو کہ گھر محبت کی بنیاد پر قائم رہے اس گولی تک جو تم میدانِ جنگ میں اپنے دشمن پر چلاتے ہو کہ دنیا میں عدل و انصاف قائم ہو۔

صفات یاد دلائی گئی ہے تاکہ پوری ذمّے داری سے فیصلہ کیا جائے کیونکہ اللہ تعالیٰ دُور نہیں وہ بخوبی واقف ہے کہ شوہر اور بیوی کیا کر رہے ہیں۔

قرآن کریم میں سیکڑوں اور ہزاروں ایسی آیات ہیں جو دلوں میں احسان کے بیج بوتی ہیں اور زندگی میں جو کام در پیش آتے ہیں ان سب میں رہنمائی کرتی ہیں۔

مختصر یہ کہ حدیث شریف "تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تمہیں دیکھ ہی رہا ہے" صرف ایسے شخص کی صفت نہیں بیان کرتی جو نماز یا زبان سے ذکر الٰہی میں مشغول ہو بلکہ یہ ایسے انسان کی صفت ہے جو زندگی کے تمام معاملات میں اللہ تعالیٰ کے تمام احکام نافذ کر رہا ہو۔

احسان کا میدان بہت وسیع ہے اور انسانی زندگی میں اس کا دائرہ گود سے گور تک پھیلا ہوا ہے۔

میں اس پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

احسان یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔ اس طرح عبادت کرو تو تم چوری کی حد بھی نافذ کر رہے ہو گے تو تمہیں یہ احساس ہو گا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں میں امن و امان پھیلانا اور مجرموں کو سزا دینا چاہتا ہے کہ یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے۔

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوا أَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالًا مِنَ اللَّهِ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ (المائدہ ۳۸ ۵)

اور چور خواہ عورت ہو یا مرد دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ ان کی کمائی کا بدلہ ہے اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا۔ اور اللہ کی قدرت سب پر غالب ہے اور وہ دانا بینا ہے۔

عدالت کے میدان میں، جہاں یہ حد نافذ کی جا رہی ہو اللہ تعالیٰ کی رویت ویسی ہی ہے جیسے نماز کے قیام کے دوران مسجد میں اس کی رویت۔

ان بعض خاندانی مسائل کے تعلق سے نازل ہونے والی آیات کے اختتام پر اسمائے حسنیٰ کے ذکر پر غور کرو۔

لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ (البقرہ ۲۲۶ - ۲۲۷)

جو لوگ اپنی عورتوں سے تعلق نہ رکھنے کی قسم کھا بیٹھتے ہیں ان کے لیے چار مہینے کی مہلت ہے اگر انھوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا ہے اور رحیم ہے اگر انھوں نے طلاق ہی کی ٹھان لی تو جانے رہیں اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

کبھی آدمی اپنی بیوی سے تنگ آجاتا ہے اور ناراضگی اس سے کنارہ کشی پر آمادہ کرتی ہے قرآن اس کا جو حل بتاتا ہے وہ نرمی سے شروع ہوتا ہے اور فیصلہ کن موڑ پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ وہ شوہر سے کہتا ہے کہ اگر تم اپنی بیوی کو معاف کر دو تو اللہ تعالیٰ غفور و رحیم ہے اللہ تعالیٰ کے ان ناموں سے مسائل کے شکار گھر میں برداشت، رواداری اور شفقت کی فضا قائم کرنے کے جذبات ابھارے گئے ہیں۔ پھر جب دوسری صورت تک نوبت پہنچ جائے تو اللہ تعالیٰ کے سمیع و علیم ہونے کی

لیکن دوسری قسم کے علم کو آسمان نے ہمارے لیے اور ہیں اس کے لیے آزاد چھوڑ دیا ہے۔ ایسی کوئی وحی نازل نہیں ہوئی جو ہمیں مختلف قسم کے صنعتیں اور ہنر سکھائے۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں آزاد چھوڑ دیا ہے کہ اس میدان میں ہم خود اپنی جدّ وجہد کریں اور زندگی کے معاملات میں ہم جو کچھ تسخیر کریں اسے صحیح رُخ دے کر اس پیغام کی تقویت کے لیے استعمال کریں جس کے لیے ہمیں منتخب کیا گیا ہے۔

افسوس ہے کہ ان دونوں میدانوں میں مسلمانوں کے پیر لڑکھڑا گئے۔ کتاب وسنّت سے ان کی واقفیت بہت کمزور ہے۔ زندگی کے ظاہری وباطنی مظاہر کے تعلق سے ان کی سمجھ کمزور تر ہے۔ اور اپنی زندگی، اس کے تجربات اور صلاحیتوں کو اپنے دین کی خدمت کے لیے استعمال کرنا کمزور ترین ہے۔

یہ عبادت نہیں کہ حالات کو بدلنے کے لیے آسمانی مدد کا انتظار کیا جائے۔ ہم ۔ عام پہلو سے۔ تمام دیگر انسانوں ہی کی طرح انسان ہیں اور انھیں کی طرح ہمیں بھی کان، آنکھ اور دل ملے ہوئے ہیں۔

تب ایسا کیوں ہے کہ ہمارے حواس اور خیالات تو معطّل رہیں اور دیگر لوگوں کے حواس و خیالات ہر میدان میں سرگرم ہوں۔

ایسا کیوں ہے کہ ہماری انگلیاں جن چیزوں کو چھولیں ان میں خلفشار پیدا ہو جائے اور ان کی انگلیاں جن چیزوں کو چھولیں وہ سنور جائیں۔؟

دیگر لوگ تمام مادی ومعنوی پہلوؤں سے ہمارے آباء واجداد پر انحصار کرتے تھے اور ہمیں کیا ہوا کہ ہم خود اپنی زمینوں سے معدنیات نکالنا جانتے ہیں نہ اپنے دریاؤں پر بند اور پُل بنا پاتے ہیں اور نہ اپنے کارخانوں میں ایسے آلات اور مشینیں تیار کر پاتے ہیں جو امن وجنگ کے مقاصد پورے کر سکیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ احسان کی صلاحیت ہی ہم سے دُور ہو گئی ہے جبکہ اگر ہم چاہیں تو یہ صلاحیت ہماری دسترس میں ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اس زمین پر مسلمانوں کو بھی اسی طرح زندگی سے نوازا ہے جیسے دوسری قوموں کو۔ اس نے مسلمانوں کو جلیل القدر اور دور رس آسمانی وحی سے نوازا ہے لیکن زمینی علم ان کے لیے مخصوص نہیں کیا ہے کہ دوسروں پر ان کا پلڑا بھاری ہو جائے۔

دوسرے لوگ جس طرح زمینی علوم میں جدّ وجہد کرتے ہیں اسی طرح مسلمانوں کو بھی کرنی ہوگی۔

امّتِ اسلامیہ
احسان اور بدسلوکی کے درمیان

اپنے دین اور خود اپنے آپ کے تعلق سے مسلمانوں کی بدسلوکی نہایت شدید ہے۔ گذشتہ صدیوں میں مسلسل یہ بدسلوکیاں جاری رہی ہیں بلکہ ان کا دائرہ وسیع ہوتا چلا گیا ہے خواص و عوام دونوں ہیں دین سے ناواقفیت عام ہے۔ عام زندگی کے تعلق سے یہ ناواقفیت اور زیادہ عجیب و غریب ہے۔ چنانچہ جو امّت ایک زمانہ تک سب سے آگے رہ چکی تھی پیچھے ہٹنے لگی اور پے در پے شکستوں نے اس کے وجود ہی کو بے وزن کر ڈالا۔

اُمّت نے نہ ہی اپنے دین کے حقائق پر حسن وخوبی کے ساتھ عمل کیا اور نہ اپنے دنیاوی امور میں حسن وخوبی سے کام لیا۔ لہٰذا اس انجام تک پہنچنے کے علاوہ کوئی چارہ کار ہی نہیں تھا۔

جو شخص زبان کے قواعد سے ناواقف ہو وہ بیان پر اچھی قدرت نہیں رکھ سکتا۔ جو نماز کے ارکان ہی سے آگاہ نہ ہو وہ اچھی طرح عبادت کیسے کرے گا؟ اس طرح جو زندگی کے معاملات سے واقف نہیں وہ ان سے اچھی طرح کیسے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور کیسے کوئی نمایاں حیثیت حاصل کر سکتا ہے؟

علم کی دو قسمیں ہیں. ایک علم کا سرچشمہ وحی الٰہی ہے جس کا دائرہ محدود اور جس کے حدود بالکل واضح ہیں۔

دوسرے علم کا سرچشمہ انسانی سرگرمیاں، زندگی سے عہدہ برآئی۔ اور اس کے اسرار و رموز سے واقفیت ہے۔ اس علم کا دائرہ بہت وسیع ہے۔

پہلی قسم کے علم کے سلسلہ میں آدمی کے لیے اتنا کافی ہے کہ آسمان سے جو کچھ نازل ہوا ہے اسے پڑھ لے تاکہ اس پر صحیح طور پر عمل کر سکے۔

هَلْ جَزَاءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ — احسان کا بدلہ احسان کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

(الرحمٰن ۶۰)

احسان، جیسا کہ ہم واضح کر چکے ہیں اجزاء میں تقسیم نہیں ہو سکتا۔ جیسے مثلاً سچائی تقسیم نہیں ہو سکتی جو شخص کچھ باتیں جھوٹ بولے اور کچھ باتیں سچ، اسے سچا نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بلکہ یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا کہ اس شخص میں سچائی کی خاصیت پائی جاتی ہے۔

آپ اس شخص کو حسن و خوبی سے کام انجام دینے والا نہیں قرار دے سکتے جسے بعض کاموں کو بھونڈے پن اور ناقص انداز میں اور بعض کاموں کو ٹھیک ٹھاک انجام دیتے دیکھیں۔ اس طرح کی مخلوط صفت پانا ہی مشکل ہے کیونکہ خوبیاں تقسیم نہیں ہوتیں۔

کسی بھی عام کام کی حُسن و خوبی سے انجام دہی کی ایک ہی صورت ہوتی ہے جسے مومن و کافر دونوں جانتے ہیں۔ ایسے کاموں میں احسان یہی ہے کہ دنیا میں مقررہ قوانین کے مطابق انھیں انجام دیا جائے۔

ایک مسلمان ڈاکٹر جو آپریشن کرتا ہے وہی ایک کمیونسٹ، ملحد یا کسی اور دین کو ماننے والا ڈاکٹر بھی کرتا ہے اس کے تعلّق سے فیصلہ خالص سائنسی اعتبار سے ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس آپریشن کی خوبی یا برائی انھیں فنّی اصولوں کی بنیاد پر طے کی جائے گی جو بنی نوع انسان کے درمیان رائج ہیں۔ ان مقررہ قواعد کے سلسلہ میں کسی بھی نظریہ کے ماننے والے ڈاکٹر کی کوتاہی قابلِ قبول نہ ہوگی۔

فرق صرف اتنا ہوگا کہ ایک مسلمان ڈاکٹر جب آپریشن کرے گا تو اس کی نیت بھی نیک ہونی چاہیے اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا مقصد بھی سامنے ہونا چاہیے۔ یعنی عمل کی مشترک صورت میں کوئی فرق نہیں ہوگا فرق صرف نفسیاتی و معنوی صورت میں ہوگا۔

دینی اعتبار سے مسلمان کو مُحسن اسی وقت قرار دیا جائے گا جب اس میں کسی کام کی انجام دہی میں ظاہری کمال اور صفائے قلب (یعنی خدا کی خوشنودی) دونوں باتیں پائی جائیں۔

اس کی نیت چاہے جتنی نیک ہو یہ بات ہرگز قابلِ قبول نہ ہوگی کہ وہ محض نیت پر بھروسہ کر کے اس کام کی انجام دہی میں کوتاہی اور غفلت سے کام لے۔

زندگی کے دنیاوی امور میں جہاں مذکورہ قواعد کے مطابق مسلمان اور غیر مسلم برابر ہیں وہیں

اور دوسروں کے تجربات سے فائدہ بھی اٹھانا ہوگا۔

اس میدان میں ہر کوتاہی کا پہلا مطلب فکری ومادّی معیار میں گراوٹ اور دوسرا مطلب ان وسائل کے تعلق سے کوتاہی ومحرومی ہوگا جو ان کے پیغام کو کامیاب بنا سکتے ہیں اور ان کے مقصد کو پورا کر سکتے ہیں۔

پھر جب اس کوتاہی ودرماندگی کے ساتھ خود دین میں کجی اور دین کے تقاضے پورے کرنے میں ڈھیل بھی شامل ہو جائے تب تو تباہی ہی تباہی ہے۔

احسان کے دو جز ہیں ایک آخرت پر موقوف ہے اور یہاں اس پر ہمیں کچھ گفتگو نہیں کرنی ہے دوسرا اس دنیا سے متعلق ہے جس کے تعلق سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ ۖ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوهَهُمْ قَتَرٌ وَلَا ذِلَّةٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ - وَالَّذِينَ كَسَبُوا السَّيِّئَاتِ جَزَاءُ سَيِّئَةٍ بِمِثْلِهَا وَتَرْهَقُهُمْ ذِلَّةٌ ۖ مَا لَهُمْ مِنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۖ كَأَنَّمَا أُغْشِيَتْ وُجُوهُهُمْ قِطَعًا مِنَ اللَّيْلِ مُظْلِمًا ۚ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ -

(یونس - ۲۶ - ۲۷)

جن لوگوں نے بھلائی کا طریقہ اختیار کیا ان کے لیے بھلائی ہے اور مزید فضل، ان کے چہروں پر روسیاہی اور ذلّت نہ چھائے گی وہ جنّت کے مستحق ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اور جن لوگوں نے برائیاں کمائیں ان کی برائی جیسی ہے ویسا ہی بدلہ پائیں گے۔ ذلت ان پر مسلّط ہوگی کوئی اللہ سے ان کو بچانے والا نہ ہوگا۔ ان کے چہروں پر ایسی تاریکی چھائی ہوئی ہوگی جیسے رات کے سیاہ پردے ان پر پڑے ہوئے ہوں۔ وہ دوزخ کے مستحق ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

ایک دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

إِنْ أَحْسَنْتُمْ أَحْسَنْتُمْ لِأَنْفُسِكُمْ ۖ وَإِنْ أَسَأْتُمْ فَلَهَا ۚ

(الاسراء - ۷)

تم نے اچھا کیا تو وہ تمہارے اپنے ہی لیے اچھا تھا اور برا کیا تو وہ تمہارے اپنی ذات کے لیے برا ثابت ہوا۔

حضرت یوسفؑ کیا کرتے ہیں؟

احسان کے نتیجہ میں حضرت یوسفؑ تو اس سربلندی تک پہنچ گئے کہ سب کی امیدوں کا مرکز بن گئے۔ لیکن ان کے بھائیوں کو اپنی بدسلوکی کے نتیجے میں یہ دن دیکھنا پڑا کہ فاقہ کشی تک پہنچ گئے۔ اور روزی کی تلاش میں انھیں مصر جاکر گڑگڑانا پڑا۔

فَلَمَّا دَخَلُوا عَلَيْهِ قَالُوا يٰاَيُّهَا الْعَزِيزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجَاةٍ فَاَوْفِ لَنَا الْكَيْلَ وَتَصَدَّقْ عَلَيْنَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَجْزِي الْمُتَصَدِّقِيْنَ قَالَ هَلْ عَلِمْتُمْ مَّا فَعَلْتُمْ بِيُوسُفَ وَاَخِيْهِ اِذْ اَنْتُمْ جَاهِلُوْنَ ۝ قَالُوْا ءَاِنَّكَ لَاَنْتَ يُوْسُفُ ؕ قَالَ اَنَا يُوْسُفُ وَهٰذَا اَخِيْ قَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا اِنَّهٗ مَنْ يَّتَّقِ وَيَصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

(یوسف ۸۸-۹۰)

جب یہ لوگ مصر جاکر یوسف کی پیشی میں داخل ہوئے تو انھوں نے عرض کیا کہ "اے سردار با اقتدار، ہم اور ہمارے اہل و عیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہم کچھ حقیر سی پونجی لے کر آئے ہیں آپ ہمیں بھرپور غلہ عنایت فرمائیں اور ہم کو خیرات دیں، اللہ خیرات دینے والوں کو جزا دیتا ہے (یہ سن کر یوسف سے رہا نہ گیا)، اس نے کہا "تمہیں یہ بھی معلوم ہے کہ تم نے یوسفؑ اور اس کے بھائی کے ساتھ کیا کیا تھا جبکہ تم نادان تھے"؟ وہ چونک کر بولے "ہائیں کیا تم یوسف ہو؟ اس نے کہا ہاں میں یوسف ہوں اور یہ میرا بھائی ہے اللہ نے ہم پر احسان فرمایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر کوئی صبر و تقویٰ سے کام لے تو اللہ کے ہاں ایسے نیک لوگوں کا اجر مارا نہیں جاتا۔

اس آخری جملہ کو تو سماجی و اجتماعی طرز عمل کا ایک لازمی قانون ہونا چاہیے جس طرح دیگر علوم و فنون کے مقررہ قوانین ہیں، احسان کا بیج ضائع نہیں جاتا نہ احسان کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ کی عنایت کبھی چھوڑتی ہے چاہے حالات و مسائل کتنے ہی سنگین ہو چکے ہوں۔

احسان کوئی ایسی چیز نہیں کہ جیسے کسی غفلت زدہ ذہن میں کبھی اچانک ذہانت کی بجلی چمک جائے یا کاہل و سست طبیعت میں کبھی اچانک چستی پیدا ہو جائے۔

یہ تو ایک مستقل عادت اور ایسی صلاحیت ہے جو ہر کام کو حسن و خوبی کے ساتھ درجۂ کمال

ایک اور چیز کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ مسلمانوں سے فرض عبادات کی ادائیگی بھی مطلوب ہے اوران عبادات کو شریعت و سنّت کے مطابق ٹھیک ادا کرنا ہی احسان ہے اور قرآن کریم ہمیں بتاتا ہے کہ اس جامعیت کے ساتھ احسان زندگی کے مسائل کے حل اور سربلندی نیز سعادت و برکت کے حصول کا ذریعہ ہے۔

○

حضرت یوسفؑ پاکیزہ کردار اور پختہ ایمان رکھنے والے نوجوان تھے انھیں جلاوطنی قید و بند، تنگدستی اور بدنامی جیسے بحرانوں سے گزرنا پڑا لیکن جب ان کے قدم ذرا بھی نہیں ڈگمگائے اور برابر ثابت قدم رہے تو اس احسان کا نتیجہ یہ نکلا کہ انھیں سب سے بڑا منصب سونپا گیا اور عوام ان کے زیرنگیں ہو گئے۔

وَقَالَ الْمَلِكُ ائْتُونِي بِهِ أَسْتَخْلِصْهُ لِنَفْسِي ۖ فَلَمَّا كَلَّمَهُ قَالَ إِنَّكَ الْيَوْمَ لَدَيْنَا مَكِينٌ أَمِينٌ ۝ قَالَ اجْعَلْنِي عَلَىٰ خَزَائِنِ الْأَرْضِ ۖ إِنِّي حَفِيظٌ عَلِيمٌ ۝ وَكَذَٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوسُفَ فِي الْأَرْضِ يَتَبَوَّأُ مِنْهَا حَيْثُ يَشَاءُ ۚ نُصِيبُ بِرَحْمَتِنَا مَنْ نَشَاءُ ۖ وَلَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِينَ ۔

(یوسف - ۵۴ - ۵۶)

بادشاہ نے کہا کہ ان کو میرے پاس لاؤ تاکہ میں ان کو اپنے لیے مخصوص کرلوں"۔ جب یوسفؑ نے اس سے گفتگو کی تو اس نے کہا" اب آپ ہمارے یہاں قدر و منزلت رکھتے ہیں اور آپ کی امانت پر پورا بھروسہ ہے۔ یوسفؑ نے کہا کہ" ملک کے خزانے میرے سپرد کیجیے میں حفاظت کرنیوالا بھی ہوں اور علم بھی رکھتا ہوں اس طرح ہم نے اس سرزمین میں یوسفؑ کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کی۔ وہ مختار تھا کہ اس میں جہاں چاہے اپنی جگہ بنائے۔ ہم اپنی رحمت سے جس کو چاہتے ہیں نوازتے ہیں نیک لوگوں کا اجر ہمارے یہاں مارا نہیں جاتا۔

اور یہ تو دنیا میں ہوا۔ اس کے بعد:

وَلَأَجْرُ الْآخِرَةِ خَيْرٌ لِلَّذِينَ آمَنُوا وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۝ (یوسف ۵۷)

اور آخرت کا اجر ان لوگوں کے لیے زیادہ بہتر ہے جو ایمان لائے اور خدا ترسی کے ساتھ کام کرتے رہے۔

جن بھائیوں نے ان کی اہانت کی تھی اور انھیں اتنے سارے مسائل میں پھنسایا تھا ان کے ساتھ بھی

عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۚۖ لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝

(الزمر ۳۳-۳۵)

رب کے ہاں وہ سب کچھ ملے گا جس کی وہ خواہش کریں گے۔ یہ ہے احسان پر عمل کرنے والوں کی جزا، تاکہ جو بدترین اعمال انھوں نے کیے تھے انھیں اللہ ان کے حساب سے ساقط کردے۔ اور جو بہترین اعمال وہ کرتے رہے ہیں ان کے لحاظ سے ان کو اجر عطا فرمائے۔

آخری آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محسن معصوم نہیں ہوتا کہ اس سے کسی غلطی کا صدور ہی نہ ہو۔ ہوسکتا ہے اس کا ماضی خراب رہا ہو جس سے اس نے توبہ کرلی ہو۔ ہوسکتا ہے اس کے دل میں وسوسے پیدا ہوتے ہوں لیکن اس کے دل میں جو روشنی پیدا ہوچکی ہوتی ہے وہ کسی عارضی شئے سے بدل نہیں جاتی بلکہ اس کی پوری زندگی کو منوّر کیے رہتی ہے۔

○

احسان کی جن صورتوں کا ہم نے ابھی ذکر کیا ہے ان کی روشنی میں یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ ہماری امّت انفرادی و اجتماعی دونوں اعتبار سے دنیا و آخرت دونوں میدانوں میں پچھڑی ہوئی ہے۔

وہ تمنائیں تو کرلیتی ہیں لیکن کائنات میں جاری اللہ کے قوانین پر تمنّائیں غالب نہیں آسکتیں۔

دونوں زندگیوں میں سربلندی کے لیے اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں کہ امّت ہر کام کو اس طرح انجام دے کہ وہ یہ احساس کر رہی ہو کہ اللہ تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اور پھر اس کام کو (اگر دینی ہے تو) آسمانی شریعت کے مطابق یا (اگر دنیاوی ہے تو) فطری قوانین کے مطابق نہایت کمال و خوبی کے ساتھ انجام دے۔

یہی اس حدیث کا مطلب ہے کہ:

"تم اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو اور اگر تم اسے نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے"۔

تک پہنچانے کی خواہش اور اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ یاد کرنے اور اس کی موجودگی کے احساس سے پیدا ہوتی ہے جس طرح سائنسی وعلمی مہارت کے لیے مزید مطالعہ و تجربہ کی ضرورت ہے ـــــ کیونکہ زندگی کے امور ہمیشہ تغیر پذیر رہتے ہیں ـــــ اسی طرح نفسیاتی و قلبی ماحول کے لیے بھی مسلسل بیدار مغزی اطاعات و فضائل کو عادت بنا لینے اور ان چیزوں سے شغف کی ضرورت ہوتی ہے جن سے اللہ تعالیٰ کا قرب اور خوشنودی حاصل ہو۔

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ۝ؕ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۝ (الذاریات ۱۵-۱۸)

البتہ متقی لوگ اس وقت باغوں اور چشموں میں ہونگے جو کچھ ان کا رب انھیں دے گا اسے خوشی خوشی لے رہے ہوں گے وہ اس دن کے آنے سے پہلے احسان پر عمل کرتے تھے، راتوں کو کم ہی سوتے تھے پھر وہی راتوں کو پچھلے پہروں میں معافی مانگتے تھے اور ان کے مالوں میں حق تھا سائل اور محروموں کے لیے۔

احسان کے راستے بہت سارے ہیں ان سب کو کون اختیار کر پاتا ہے، ان کے لیے پختہ عزم، صبر جمیل، بلند ہمت، مسلسل جدّوجہد وغیرہ کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں یہ خصلتیں پیدا ہو جائیں وہ یقیناً اس لائق ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے اور اس کی راہنمائی فرمائے اسی لیے قرآن کریم میں بار بار محسنین پر اللہ کی عنایت کا ذکر آتا ہے:

اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ (الاعراف ۵۶)

یقیناً اللہ کی رحمت نیک کردار لوگوں سے قریب ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا وَّالَّذِيْنَ هُمْ مُّحْسِنُوْنَ ۝ؑ (النحل ۱۲۸)

اللہ ان لوگوں کے ساتھ ہے جو تقویٰ سے کام لیتے ہیں اور احسان پر عمل کرتے ہیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ؑ (العنکبوت ۶۹)

جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انہیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے اور یقیناً اللہ احسان پر عمل کرنے والوں ہی کے ساتھ ہے۔

وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ

اور جو شخص سچائی لے کر آیا اور جنھوں نے اس کو سچّا مانا وہی عذاب سے بچنے والے ہیں انھیں اپنے

کتابوں میں مال و دولت کی قدر و قیمت اور مادی حالات کی اہمیت پر انتہائی توجہ دلاتے رہے ہیں۔ لیکن یہ حقیقت ہرگز فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ اقتصادی حالات جنھیں ہم اپنے قابو میں لانا چاہتے ہیں ان کی حیثیت ذرائع کی ہے، مقاصد کی نہیں ان کے حصول و استعمال کا مقصد بھی زیادہ بڑے مقاصد کی خدمت کرنا ہے۔

○

اس زندگی میں انسان کا پیغام کیا ہے اس پر مزید غور و خوض اور مطالعہ کی ضرورت ہے۔ اس وسیع دنیا میں انسان کا کردار کیا ہے اس کا تعیّن کرنا اور واضح کرنا ضروری ہے تاکہ وہ پوری واقفیت و بصیرت اور طاقت و پامردی کے ساتھ اسے ادا کر سکے۔

بعض لوگ اپنے وجود کی اعلیٰ حکمت سے ناواقف رہے تو زندگی کی سرگرمیوں میں پوری جدّوجہد کے ساتھ حصہ لینے کے بجائے عضوِ معطل بن کر رہ گئے یا اپنا مقصد بھول کر اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے جبکہ انھیں سیدھی رہنمائی کے ساتھ راستہ طے کرنا چاہیے تھا۔

حضرت آدمؑ اور بنی آدم کی تخلیق ـــــ جیسا کہ قرآن کریم میں ذکر آتا ہے ـــــ پر پہلی نگاہ ڈالنے سے انسان کے پیغام کے تعلق سے ہر چیز واضح ہو جاتی ہے۔

تخلیق زمین کی مٹی سے ہوئی۔ اپنے وجود کے اس مرحلہ میں تمام انسان برابر ہیں کائنات کی دیگر مخلوقات پر انھیں فضیلت دینے والی کوئی چیز نہیں۔

ایک مٹھی مٹی کی کیا قیمت ہو سکتی ہے؟

انسان کی اس بے مائگی کو قرآن ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

اَلَّذِی اَحْسَنَ کُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِیْنٍ (السجدہ ۷ - ۸)

جو چیز بھی اس نے بنائی خوب بنائی اس نے انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی پھر اس کی نسل ایک ایسے سَت سے چلائی جو حقیر پانی کی طرح ہے۔

انسان اپنے وجود کے اس مرحلہ سے کوئی بڑائی حاصل نہیں کرتا۔ بڑائی تو دوسرے مرحلہ سے حاصل ہوتی ہے۔ جب اللہ تعالیٰ اپنے فرشتوں سے فرماتا ہے:

روحانی کمال کی بنیادیں

آسمانی نسبت

انسانی جسم کے تقاضوں کے ارد گرد گھومتی ہوئی تمام تر کوششوں کے درمیان اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ذرا ٹھہر کر اپنا جائزہ لیں تاکہ ہم اپنی منزلِ مقصود کو نگاہوں سے اوجھل کر کے صحیح راستہ سے بھٹک نہ جائیں۔

پیٹ اور جنس کی ضروریات کے تعلق سے آج کل اتنا شور و غوغا مچایا جا رہا ہے کہ گویا دنیا میں اس کے علاوہ کوئی اور چیز ہے ہی نہیں۔

ہر جگہ معاشی معیار کو بلند کرنے اور ہر چھوٹے بڑے کی خواہشات کی تکمیل کی ضمانت فراہم کرنے کی باتیں ہی سنائی دیتی ہیں۔

انسان کی مادی ضروریات اور ان کی تکمیل کی اہمیت سے انکار نہیں لیکن ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بہت سے ازم اور نظریات اسی چیز کو اپنا محور بنائے ہوئے ہیں اور اس کے نتیجہ کے طور پر ایسے فتنے اور مظالم بھی سامنے آرہے ہیں جنھوں نے مادی پہلو اور عام زندگی کو شدید برائیوں میں جکڑ دیا ہے۔

لیکن صحیح علاج نہ تو تشخیص میں غلو کرنے سے ممکن ہے نہ چیزوں کو ان کی اپنی اہمیت سے گھٹا کر دیکھنے سے۔

یہ صحیح علاج نہیں ہے کہ ہم یہ سمجھ لیں کہ زندگی صرف مادہ کا نام ہے یا وجودیکہ انسان کے وجود اور اس کے قلب و دماغ پر مادی حالات اثر انداز ہوتے ہیں۔ ہم اپنی دوسری

اور اسے یہ احساس ہوا کہ آسمانوں اور زمین کو اس کی خدمت کے لیے بنایا گیا ہے۔

اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاہِرَۃً وَّبَاطِنَۃً ؕ (لقمان ۔۲۰)

کیا تم لوگ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی ساری چیزیں تمہارے لیے مسخر کر رکھی ہیں اور اپنی کھلی اور چھپی نعمتیں تم پر تمام کر دی ہیں۔

آسمان و زمین کی وسعتوں کی انسان کی خدمت کے لیے یہ تسخیر یہ واضح اشارہ کرتی ہے کہ انسان کو اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ وہ آقا بنے نہ کہ ذلیل و خوار ہو۔

آسمان میں فرشتوں کے ذریعہ اسے سجدہ کیے جانے کا مطلب یہی ہے کہ وہ روئے ارض پر با عزت و باحیثیت آقا کی حیثیت سے رہے گا کیونکہ اس کا کام روئے ارض پر اللہ تعالیٰ کی جانشینی ہے۔

لیکن زمین پر رہتے ہوئے اپنی مادی ضروریات کی تکمیل میں انسان کو اس طرح غرق نہیں ہو جانا چاہیے کہ وہ اپنے پروردگار کے حقوق ہی فراموش کر دے جبکہ اسی نے انسان کو ساری صلاحیت و طاقت بخشی ہے۔

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰکُمْ عَبَثًا وَّاَنَّکُمْ اِلَیْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ فَتَعٰلَی اللّٰہُ الْمَلِکُ الْحَقُّ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْکَرِیْمِ۔

(المومنون ۱۱۵ ۔ ۱۱۶)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا تھا کہ ہم نے تمہیں فضول ہی پیدا کیا ہے اور تمہیں ہماری طرف کبھی پلٹنا ہی نہیں ہے پس بالا و برتر ہے اللہ بادشاہ حقیقی کوئی خدا اس کے سوا نہیں مالک ہے عرش بزرگ کا۔

اسلام نے اپنی تعلیمات میں جسم و روح کے تقاضوں اور دنیا و آخرت کے فرائض کے درمیان ہم آہنگی پیدا کی ہے۔ گویا اسلام کی پیدا کردہ اس ہم آہنگی کے بعد انسان ایسا وجود بن گیا ہے جس کے لیے موت و حیات کی دنیاؤں میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا۔ اسی درمیانی طریقہ کی وضاحت کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے۔

وَابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰہُ الدَّارَ الْاٰخِرَۃَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ

جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا

فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۝ (الحجر ۲۹)

جب میں اسے پورا بنا چکوں اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونک دوں تو تم سب اس کے آگے سجدے میں گر جانا۔

انسانی وجود میں الٰہی روح کے پھونکے جانے سے ہی انسانی وجود میں وہ خصوصیتیں پیدا ہوئیں جن کی بدولت وہ سربلند ہوسکے اور دوسری مخلوقات اس کے سامنے جھک جائیں۔ اس سے پہلے اسے سجدہ کیے جانے اور تکریم کا حق نہیں ملا۔ فرشتوں وغیرہ کو بے قیمت مٹی کے ایک آلہ کو سجدہ کرنے کا مکلّف نہ کیا جاتا۔

لیکن جب اس مادی غلاف کے اندر اللہ تعالیٰ کے مقدس نور کی چنگاری اور اس کی صفات کا پرتو آ گیا اور اس میں زندگی، صلاحیت، علم اور بولنے، سننے اور سمجھنے کی صلاحیتیں پیدا ہوگئیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی سرزمین پر اس کا جانشین بننے کے قابل ہوگیا اور اسے یہ مرتبہ مل گیا کہ کائنات کے مختلف گوشے اس کا استقبال کریں اور اس کی فرماں برداری کریں۔

بلاشبہ انسان ایک عظیم وجود ہے لیکن اس کی عظمت کا راز اس کی آسمانی نسبت میں مضمر ہے مادی و زمینی نسبت میں نہیں۔

کچھ لوگ اپنی اس الٰہی نسبت کو سمجھتے ہیں تو وہ زندگی کو معرفت، فضیلت اور بزرگی سے سنوارتے ہیں اور انسان کے لیے کائنات کی تسخیر کرتے ہیں۔

لیکن جن لوگوں پر مٹی کے رجحانات غالب ہوتے ہیں ان کی زندگی پر شہوت رانیوں، مظالم انا پرستی اور حقیر ترین چیزوں کے لیے انسانوں کو قابو میں لانے کی خواہش جیسی چیزوں کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

مادہ پرستی انسان کو نیچے ڈھکیلتی ہے

اس زندگی میں انسانوں کے مابین دائمی کشمکش کی بنیاد یہی ہے کہ ظلم و خود پرستی کے حیوانی جذبات کو غلبہ حاصل ہو یا کمال امن، محبت اور ایثار چاہنے والے انسانی جذبات کا۔

ہم مسلمانوں نے دنیا کے سامنے وہ تہذیب پیش کی جس میں انسان کی قدر و منزلت بڑھی

الْمُتَطَهِّرِيْنَ (البقرہ ۲۲۲) باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔

اور روح کی صفائی و پاکیزگی کی بنیاد اللہ تعالیٰ سے تعلق پر ہے۔
بدن کو گندگی سے صاف کرنا اس لیے ضروری ہے کہ گندگی اس انسان کے مرتبہ و مقام کے شایانِ شان نہیں جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک معزز ہے اور جسے آسمانی پیغام سے نوازا گیا ہے۔

جسم کی پرستش، مادہ کی پرستش اور انسانی زندگی میں الٰہی بنیاد کے خلاف سرکشی ایسی کجی ہے جو برائی و مصیبت ہی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔

مادی تہذیب کی آفت یہ ہے کہ اس نے ذہنوں کو شہوت پرستیوں کے لیے مسخر کیا اور رُوح کی آواز کا گلا گھونٹ دیا۔ اس نے مٹی کی تقاضوں کو تو کھلی چھوٹ دی اور اس کو نہ مانا کہ انسان میں رُوحِ الٰہی کی پھونک شامل ہے۔ اسے یہی نظر آتا ہے کہ انسان کلّی وجزئی ہر طرح سے مٹی سے پروان چڑھا ہے اور اس کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنا سر اوپر کی طرف اٹھائے اور اپنے آقائے نعمت کو یاد کرے اور اس کی عظمت کے راز کو سمجھنے کی کوشش کرے۔

ہم زور دے کر یہ بات کہتے ہیں کہ انسانیت کی عزت اول و آخر دونوں اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے تعلق، اس سے مدد طلبی اور اسی کے قوانین اور ہدایتوں کی پابندی میں ہے۔

انسان کے حق میں حقیقی آزادی یہ نہیں کہ وہ جب چاہے اپنے آپ کو پستیوں سے آلودہ کرلے اور جب چاہے بلندی اختیار کرے۔ حقیقی آزادی یہ ہے کہ وہ کمال کی شرطوں کی پابندی کرے اور اسی کے حدود کے اندر سرگرم رہے۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّلَا مُؤْمِنَةٍ إِذَا قَضَى اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗٓ أَمْرًا أَنْ يَّكُوْنَ لَهُمُ الْخِيَرَةُ مِنْ أَمْرِهِمْ وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا مُّبِيْنًا۔ (الاحزاب۔ ۳۶)

کسی مومن مرد اور کسی مومن عورت کو یہ حق نہیں ہے کہ جب اللہ اور اس کا رسولؐ کسی معاملے کا فیصلہ کردے تو پھر اسے اپنے اس معاملے میں خود فیصلہ کرنے کا اختیار حاصل رہے اور جو کوئی اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے وہ صریح گمراہی میں پڑ گیا۔

الدُّنْيَا وَ اَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ وَ لَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِي الْاَرْضِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِيْنَ۔ (القصص ۷۷)

حصہ فراموش نہ کر، احسان کر جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ احسان کیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش نہ کر۔ اللہ مفسدوں کو پسند نہیں کرتا۔

چنانچہ اسلام میں دنیا کے لیے عمل اور آخرت کے لیے عمل کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں۔ کیونکہ دنیا کے لیے عمل بھی عبادت بن جاتا ہے اگر اسے نیک و بلند مقصد کے ساتھ انجام دیا جائے۔

اسلام میں جسم کو روح پر غالب کرنے یا روح کو جسم پر غالب کرنے کا کوئی تصور نہیں۔ دونوں کے درمیان نظم و ربط ہے جس کے ذریعہ انسان کا روحانی پہلو اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ وہ نہ فطری تقاضوں کو کچلنے والا راہب بنانا چاہتا ہے اور نہ روح کے تقاضوں اور نہ اس کے سربلندی و دائمی کامرانی کے شوق کو کچلنے والا مادہ پرست۔

اسلام روئے ارض پر ہر انسان سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنی آسمانی نسبت اور روحِ الٰہی کے سرچشمہ سے نکلی ہوئی اپنی اصل کو نظر انداز اور فراموش نہ کرے۔ بلاشبہ جسم کے کچھ اپنے حقوق ہوتے ہیں خود اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کے بارے میں فرماتا ہے:

وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ٥ (الانبیاء ۸)

ان رسولوں کو ہم نے کوئی ایسا جسم نہیں دیا تھا کہ وہ کھاتے نہ ہوں اور نہ وہ سدا جینے والے تھے۔

لیکن ان حقوق کی ادائگی دل و دماغ کی صلاحیتوں کے تحفظ کا ذریعہ ہے جسم کی مثال تو بجلی کے بلب کے اوپر کے شیشے جیسی ہے جو اس کی روشنی کو مزید جلا بخشتا اور اس کی شعاعوں کو پھیلاتا ہے اگر شیشہ ٹوٹ جائے تو روشنی بھی چلی جائے گی۔

لیکن اس کے باوجود اس شیشہ کی حفاظت اور اسے گرد و غبار سے صاف کرنا بجائے خود مقصود نہیں۔ مقصود تو یہ ہے کہ اس کے ذریعہ روشنی صاف ہو کر پھیلے۔

اسلام نے بدن کی صفائی اور روح کے تزکیہ کا حکم دیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ

اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے

اسی لیے ہم آزادی کی ہر اس دعوت کی تکذیب کرتے ہیں جو لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے حدود و احکام کی خلاف ورزی یا فرائض کے استخفاف پر ابھارے یا انسان کو اس کے شایانِ شان آسمانی مقام سے نیچے گرائے۔

انسان ایسی صورت میں کتنا حقیر و بے قیمت ہوگا جب زندگی میں اس کا کردار صرف اتنا ہی ہو کہ وہ روئے زمین پر چند برس گزار لے اور بس۔ جس طرح جنگل میں بھیڑیے، چراگاہوں میں بھیڑ بکریاں یا اصطبل میں گھوڑے اپنی مدّت گزار کر ختم ہو جاتے ہیں۔

کیا انسان کو اسی لیے پیدا کیا گیا ہے یا اسے دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اسی لیے بنایا گیا ہے اللہ تعالیٰ نے جہاں انسان کو اتنا بڑا مقام عطا کیا ہے وہیں اس زندگی میں اسے بے لگام نہیں چھوڑا ہے۔

اَیَحۡسَبُ الۡاِنۡسَانُ اَنۡ یُّتۡرَکَ سُدًی ؕ
(القیامہ - ۳۶)

کیا انسان نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ یونہی مہمل چھوڑ دیا جائے گا؟

اللہ تعالیٰ نے جہاں اسے بہت سی نعمتوں سے نوازا ہے وہیں اسے بہت سی ذمہ داریاں بھی سونپی ہیں۔ جو اس کے مفادات کی دیکھ بھال اور دنیا و آخرت میں اس کی بھلائی کی ضامن ہیں۔

اسلام اللہ تعالیٰ کا آخری پیغام ہے اور یہ دین فطرت ہونے کی بنا پر چیزوں کے فطری تقاضوں کا احترام کرتا ہے اس لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ کوئی ایسا عملی یا اجتماعی حکم دے جو مقررہ حقائق سے ٹکراتا ہو۔

وَبِالۡحَقِّ اَنۡزَلۡنٰهُ وَبِالۡحَقِّ نَزَلَ ؕ وَمَاۤ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِیۡرًا۔
(الاسراء ۱۰۵)

اس قرآن کو ہم نے حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور حق ہی کے ساتھ یہ نازل ہوا اور اے نبی تمہیں ہم نے اس کے سوا کسی کام کے لیے نہیں بھیجا کہ (جو مان لے) اسے بشارت دے دو اور (جو نہ مانے) اسے متنبہ کر دو۔

اسی طرح اس میں کسی تبدیلی کی بھی ضرورت نہیں۔

وَتَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّكَ صِدۡقًا

بات سچائی اور انصاف کے اعتبار سے کامل

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ:

"تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہشات میری لائی ہوئی ہدایات کے تابع نہ ہو جائیں۔" (مسلم)

آخر یہ آزادی ہے کیا جس کی طرف قومیں لپکتی رہی ہیں اور بڑے دل والے اس کا نعرہ بلند کرتے رہے ہیں۔

آزادی نام ہے انسان کے اس حق کا کہ اسے ان تمام وسائل کی ضمانت دی جائے جن کے ذریعہ وہ صاف ستھری زندگی گزار سکے۔ یہ کسی بھی انسان کا حق نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے فطرت کے خلاف بغاوت و سرکشی کرے۔

آزادی انسان کے اس حق کا نام نہیں کہ وہ اگر چاہے تو حیوان بن جائے یا پروردگارِ عالم کی طرف اپنی روحانی نسبت کا انکار کر دے۔ یا ایسے افعال کا مرتکب ہو جو اس کا تعلق آسمان سے کمزور کر دیں اور مٹی کے ساتھ مضبوط کر دیں۔ اس مفہوم کے ساتھ تو آزادی کا مطلب ہو گا حقائق کو الٹ پلٹ دینا اور معاملات کو فطری طریقوں سے دور دور کر دینا۔ حقیقت تو یہ ہے آپ اس شخص سے زیادہ غلام کسی کو نہیں پائیں گے جو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ آزاد ہے جبکہ آپ اس کا بغور جائزہ لیں تو اسے شہوت پرستیوں کا مکمل پیرو کار پائیں گے۔ وہ یا تو پیٹ کا بندہ ہو گا یا جنسی خواہشات کا یا ظاہرداری کا بندہ ہو گا کہ اس کے ذریعہ لوگوں کے لیے دکھاوے کرتا ہو گا۔ یا ایسی رسم و رواج کا بندہ ہو گا جسے وہ عزت کا ذریعہ سمجھتا ہو گا۔ اگر وہ اس طرح کی کسی چیز سے محروم کر دیا جائے تو آپ اسے حقیر ترین انسان پائیں گے چاہے وہ بلند ترین منصب ہی پر کیوں نہ فائز ہو اور چاہے ایسا بادشاہ ہی کیوں نہ ہو جس کے سامنے گردنیں جھکتی ہوں۔

حقیقی آزادی کا سرچشمہ تو صرف خدائے واحد کی صحیح بندگی ہے

جو دل اللہ تعالیٰ سے مربوط ہو گا وہ انسان کو ہر چیز سے بلند کر دے گا اسے نہ کوئی ڈر ذلیل کر سکے گا نہ کوئی خواہش اس کا سر جھکا سکے گی۔

شریعت کی پابندی کے ساتھ وہ گندی اور ذلیل چیزوں اور مشکلات سے محفوظ ہو گا۔

طرح بار آور نہ ہو جائیں۔

وہ لوگوں کو سب سے پہلے ان کے پروردگار کی پہچان کراتا ہے ان کے دلوں کو برائیوں اور سرکشیوں سے پاک صاف کر کے اللہ تعالیٰ سے ان کا تعلق جوڑتا ہے، انھیں عقائد و عبادات اور ایسے کردار و اخلاق سکھاتا ہے جن کی بدولت وہ بھلائی سے محبت کرنے لگیں، اچھے کام کرنے لگیں اور ان میں اچھائی کو اچھائی اور برائی کو برائی سمجھنے کی تمیز پیدا ہو جائے۔

ہم یہ گمان تو نہیں کرتے کہ دین سے انتساب رکھنے والا ہر شخص کمال کے مطلوبہ معیار تک پہنچ جائے گا لیکن یہ ضرور کہیں گے کہ دین اپنے سارے متبعین میں روحانی کمال پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اس کی حیثیت ایک اسپتال کی ہوتی ہے جو ہر مریض کو قبول کر کے مختلف دواؤں سے علاج کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنی بیماریوں سے شفایاب ہو جائے۔ لیکن ہر مریض کو ایک ہی معیار کی شفایابی حاصل نہیں ہوتی۔ البتہ اگر کوئی مریض اسپتال کی مجوزہ دوائیں استعمال کرنے سے انکار کر دے تو اسے اسپتال سے نکال دیا جائے گا۔

یہی صورت روحانی علاج کی بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسی بلند چیز ہے۔ جہاں تک فسادی و مجرم، شہوتوں کے غلام اور دنیا میں سربلندی اور مخلوق پر بالادستی کے عاشق پہنچ ہی نہیں سکتے۔ اس طرح کے برے لوگوں کو جنت میں جگہ نہیں دی جا سکتی ان کی برائیاں تو انھیں جہنم کی طرف ہی لے جائیں گی۔

مَا سَلَكَكُمْ فِي سَقَرَ قَالُوا لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّينَ وَلَمْ نَكُ نُطْعِمُ الْمِسْكِينَ وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَائِضِينَ وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّينِ حَتَّى أَتَانَا الْيَقِينُ ۝

"تمہیں کیا چیز دوزخ میں لے گئی وہ کہیں گے "ہم نماز پڑھنے والوں میں سے نہ تھے اور مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے اور حق کے خلاف باتیں کرنے والوں کے ساتھ مل کر ہم بھی باتیں بنانے لگتے تھے اور روز جزا کو جھوٹ قرار دیتے تھے یہاں تک کہ اس یقینی چیز سے سابقہ پیش آگیا۔

(المدثر ۴۲ - ۴۷)

ہاں جن لوگوں نے تزکیہ کے لیے مشقتیں اٹھائیں اور اپنے دلوں کو برائیوں اور گناہوں کی گندگیوں سے پاک صاف کیا ان کے لیے جنت کا راستہ ہموار ملے گا اور ان سے کہا جائے گا

وَّعَدْلاً لَامُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهٖ وَهُوَ	ہے کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں
السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ (الانعام ۱۱۵)	ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

لوگوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ اس کتاب کے صفحات میں ہدایت و روشنی تلاش کریں جس میں اس دین کے اصول بھی بیان کیے گئے ہیں اور وہ ساری چیزیں بھی واضح کر دی گئی ہیں جو دنیا کی بھلائی اور خوشحالی کی ضامن ہیں۔

یہ آسمانی کتاب جو تحریف و تبدیل سے بلند تر رہی ہے انسان کو اس کی اصل آسمانی نسبت سے جوڑتی ہے اور اسے مٹی کی سطح سے بلند کرتی ہے۔

انسان کی عقلی صلاحیتیں پچھلے زمانوں میں بھی ٹھوکریں کھاتی رہی ہیں اور موجودہ دور میں تو یہ صورت اور بھی ابتر ہو چکی ہے کیونکہ انسان یہ سمجھنے لگا ہے کہ اس کے فکری ارتقا کے نتائج بے شمار ہیں اور وہ پورے وجود کا آقا بن چکا ہے۔

انسانی زندگی میں ترقی کے اس مرحلہ پر اگر ہم غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ گھاٹے کا پلڑا بہت بھاری ہے۔ انسان نے اپنی نفیس ترین چیز کو حقیر و فانی چیزیں حاصل کرنے کے لیے بیچ دیا اور اس سلسلے میں بہت ساری قربانیاں دے کر بھی مصیبتیں خرید لیں۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ (الحج ۵۵)	انکار کرنے والے تو اس کی طرف سے شک ہی میں پڑے رہیں گے۔ یہاں تک کہ یا تو ان پر قیامت کی گھڑی اچانک آجائے یا ایک منحوس دن کا عذاب نازل ہو جائے۔

انسان جب اپنے ذہن و قلب کو اللہ تعالیٰ سے لَو لگانے پر مرکوز کرے گا تبھی وہ اپنی آسمانی نسبت کا وفادار ہو سکے گا۔

الحاد خیانتِ عظمیٰ ہے

دین کی حیثیت تو ایک درس گاہ کی ہوتی ہے جو کمالات سکھاتا ہے دلوں میں ان کے بیج بوتا ہے اور اس وقت تک ان کی دیکھ بھال کرتا ہے جب تک وہ حالات و افعال میں پوری

اسی لیے ہم اباحت پرستوں، اشتراکیوں اور وجودیوں وغیرہ کو اشخاص اور چیزوں کے تعلق سے عجیب و غریب رائیں قائم کرتے دیکھتے ہیں، ان کے خیال میں یہ امت اس وقت تک اُٹھ نہیں سکتی جب تک وہ یورپ کی غلاظتوں کی تقلید نہ کرے۔ جنسی تعلقات کے سلسلہ میں وہ کسی حیا و شرم کے قائل نظر نہیں آتے۔ پھر بھی اخلاقی کمال اور نفسیاتی سلامت روی کے دعویدار ہوتے ہیں اور دین اور اہلِ دین پر جھوٹے الزامات لگاتے رہتے ہیں۔

ان لوگوں کی اخلاقی حالت کو نظر انداز کرتے ہوئے ہم سوال کریں گے کہ کیا اللہ تعالیٰ پر ایمان اتنی معمولی چیز ہے کہ شرک و توحید اور نفی و اثبات برابر سمجھے جائیں؟

ہمیں تو جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فلاں شخص زمین کو گول کے بجائے مربع اور سمندروں کے پانی کو کھارا ہونے کے بجائے میٹھا مانتا ہے تو ہم اس کا مذاق اڑانے لگتے ہیں۔

اگر دنیا کے بعض حقائق کو سمجھنے میں غلطی اتنا وزن رکھتی ہے تو اعلیٰ حقائق کے تعلق سے اتنی بھیانک غلطی کو کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے؟

جب ہم کسی شخص کے بارے میں یہ جان لیں کہ وہ احسان فراموش ہے تو ہمارے دلوں میں اس کے لیے حقارت پیدا ہو جاتی ہے تو جو شخص خالق و رازق کے گود سے گور تک کے احسانات کا منکر ہو اسے کیا سمجھیں گے؟

جو یہ کہتا ہے کہ ملحد شخص نفسیاتی طور پر مکمل ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ یا تو خدا موجود ہی نہیں اس لیے ملحد نے انکار کر کے کوئی قابلِ ملامت فعل نہیں کیا یا وہ یہ کہتا ہے کہ خدا تو موجود ہے لیکن اس سے ناواقفیت یا انکار کوئی عیب ہی نہیں۔

ہم اہلِ ایمان اس طرح کی باتوں کو صحیح نہیں سمجھتے۔ بلکہ یہ مانتے ہیں کہ انکارِ خدا برائیوں کی جڑ ہے اور منکرین بگاڑ کے جراثیم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ایک قسم ایسے لوگوں کی ہے جو گویا اس اہم مسئلہ میں غیر جانبدار ہوتے ہیں ان کے نزدیک اس مسئلہ کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ انھیں عوام کی زندگی کا اس سے کوئی تعلق نظر آتا ہے۔

اس طرح کے غیر جانبدار، ملحدین ہی کی طرح، اس روئے ارض پر بغیر کسی آسمانی ہدایت کے اپنے بنائے ہوئے قوانین کے مطابق زندگی گزارنا چاہتے ہیں۔

كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـئًا بِمَآ اَسْلَفْتُمْ فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ (الحاقہ ۲۴)

(ایسے لوگوں سے کہا جائے گا) مزے سے کھاؤ اور پیو اپنے ان اعمال کے بدلے جو تم نے گزرے ہوئے دنوں میں کیے ہیں۔

یعنی دین اللہ تعالیٰ سے ایسے تعلق کا نام ہے جو تعلق والے کو سربلندی عطا کرتا ہے اور اس کا تزکیۂ نفس کر کے اسے کھرا سکّہ بناتا ہے اور یہی انسانی کمال کی حقیقت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے تعلق توڑ کر اور اس کے قوانین سے نفرت کر کے انسانی کمال کا تصوّر بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ سے بیگانگی اور اس کے راستہ سے وحشت ایسا کوڑھ ہے جو انسان کو کسی کام کا نہیں چھوڑتا۔

سب سے بڑے منعم اور اس کے حقوق کا انکار ایسی خیانتِ عظمیٰ ہے جس کے ساتھ کوئی بھی خیر و امتیاز قابلِ قبول نہیں ہوسکتا۔

ہم چاہتے ہیں کہ ان حقائق کو پوری وضاحت سے سمجھا جائے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ دین اللہ تعالیٰ سے ایسے تعلق کا نام ہے جس سے انسان میں کوئی ادب و تمیز اور عزت پیدا نہیں ہوتی تو یہ اسلام پر تہمت ہوگی اور ایسے شخص کو دائرہ اسلام میں نہیں سمجھا جاسکتا۔

اسی طرح جو یہ سمجھتا ہے کہ انسانی کمال تک اللہ تعالیٰ پر ایمان، نماز کی پابندی اور زکاۃ کی ادائگی کے بغیر پہنچا جاسکتا ہے وہ فریب خوردہ ہے۔

○

بہت سے حلقوں میں یہ خیال رائج ہوگیا ہے کہ آدمی دین سے بے تعلق رہے، کبھی کبھی دین کے تعلق سے کچھ اچھے الفاظ بول دیا کرے اس کے بعد جو چاہے طرزِ زندگی اپنائے خواہ اس میں مسجد سے کوئی تعلق باقی نہ رہے اور آسمانی ہدایتوں کو ذرا بھی وزن نہ دیا جائے۔ پھر بھی زندگی و قلب کی ویرانی کے باوجود عزت کے اسباب اور نیک خصلتوں کو حاصل کیا جاسکتا ہے۔

جو آدمی آخرت پر یقین نہ رکھے اور وحیِ آسمانی سے ہدایت حاصل نہ کرے اس کے شعور میں خیر و شر کا معیار الٹ ہی جائے گا۔ کیونکہ چیزوں کے تعلق سے وہ محض اپنے دل کی مرضی سے ہی فیصلہ کرے گا اور اس دل پر بھی بسا اوقات خواہشات کا غلبہ ہوگا۔

اور اس کی ہدایتوں کی مکمل پیروی ہے۔

○

عبادات کی ادائگی انسان کی نفسیاتی وقلبی تعمیر و تشکیل میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اور اگرچہ ان عبادات کے اخلاقی و اجتماعی اثرات بھی دوررس ہیں تاہم ان کی ادائگی کا اولین مقصد اللہ تعالیٰ کے حق کی ادائگی، اس کے حکم کی پیروی اور اللہ تعالیٰ جل شانہ کی ذات کے سامنے مطلق سپردگی کا اعلان و اظہار ہے۔ بلکہ جس کے دل میں یہ معانی پنہاں نہ ہوں اس کی نماز روزہ بیکار ہے کیونکہ اس سلسلے میں نیت ہی یہی ہوتی ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے سرانداز ہے، اس کی خوشنودی کا طلب گار ہے اس کی ناراضگی سے خائف ہے اور اسے یہ احساس ہے کہ انسان کو پیدا ہی اسی لیے کیا گیا ہے کہ وہ اپنے پروردگار کی شایانِ شان تعریف و توصیف کرے اور ہر عیب و نقص سے اسے پاک قرار دے۔ یہی اس کا مقصدِ وجود بھی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ (الذاریات - ۵۶)

میں نے جن اور انسان کو اس کے سوا اور کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا کہ وہ میری بندگی کریں۔

فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ قَبْلَ غُرُوْبِهَا وَمِنْ اٰنَآءِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَ اَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى۔ (طٰہٰ ۱۳۰)

پس اے نبی جو باتیں یہ لوگ بناتے ہیں ان پر صبر کرو۔ اپنے رب کی حمد و ثنا کے ساتھ اس کی تسبیح کرو سورج نکلنے سے پہلے اور غروب ہونے سے پہلے اور رات کے اوقات میں تسبیح کرو اور دن کے کناروں پر بھی شاید کہ تم راضی ہو جاؤ۔

حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ کسی کو یہ پسند نہیں کہ اس کی تعریف بیان کی جائے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے خود اپنی تعریف بیان فرمائی ہے۔ (مسلم)

اور جس خدا نے پیدا کیا ہے یہ اس کا حق ہے کہ اس کی تعریف و پرستش کی جائے۔

جس خدا نے رزق دیا ہے یہ اس کا حق ہے کہ اس کو یاد کیا جائے اور شکر ادا کیا جائے۔

جو خدا زمین اور اہلِ زمین کا وارث ہے اس کا حق ہے کہ مخلوق اس کے سامنے باریابی

ایمان کسی مبہم طاقت کے اقرار کا نام نہیں بلکہ یہ نام ہے اس اللہ تعالیٰ کے اعتراف کا جو قدرت و غلبہ والا ہے جس نے اوامر و نواہی دئے ہیں اور انھیں نافذ کرنے کے لیے انسانوں کو ایک معیّن مدّت عطا کی ہے اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے اور ہر چھوٹی بڑی چیز کے بارے میں ایک دن جواب طلب کرے گا۔

وہ مومن نہیں جو یہ کہتا ہے کہ دنیا میں یا اس کے پیچھے کوئی طاقت ہے جس کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے نہ ہمارے خاص و عام طرزِ عمل کے تعلق سے ہمارے اور اس کے درمیان کوئی ربط ہے۔

ایمان تو اس اللہ تعالیٰ کا اعتراف ہے جس نے خود اپنے بارے میں اور مخلوق کی خلقت کے مقصد کے تعلق سے ہمیں واضح طور پر بتایا ہے اور ایسے پیغمبر بھیجے ہیں جو ہمارے سامنے واضح کر سکیں کہ ہم آسمانی ہدایت کے مطابق کیسے زندگی گزاریں۔

كِتَابٌ اُحْكِمَتْ اٰيَاتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ۝ وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(ھود ۱-۳)

کتاب ہے جس کی آیتیں پختہ اور مفصل ارشاد ہوئی ہیں ایک دانا اور باخبر ہستی کی طرف سے کہ تم نہ بندگی کرو مگر صرف اللہ کی۔ بس اس کی طرف سے تم کو خبردار کرنے والا بھی ہوں۔ اور بشارت دینے والا بھی اور یہ کہ تم اپنے رب سے معافی چاہو اور اس کی طرف پلٹ آؤ تو وہ ایک مدّت خاص تک تم کو اچھا سامانِ زندگی دے گا اور ہر صاحبِ فضل کو اس کا فضل عطا کرے گا لیکن اگر تم منھ پھیرتے ہو تو میں تمہارے حق میں ایک بڑے ہولناک دن کے عذاب سے ڈرتا ہوں تم سب کو اللہ کی طرف پلٹنا ہے اور وہ سب کچھ کر سکتا ہے۔

اسی لیے ہم یہ صاف فیصلہ سمجھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا انکار، اس سے سرکشی اور اس کی ہدایات کو مسترد کرنا خیانتِ عظمیٰ ہے اور انسانی کمال کی اولین بنیاد اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کی فرمانبرداری

وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيِّنَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَّ يَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَأْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ -

(آل عمران - ۲۱)

انکار کرتے ہیں اور اس کے پیغمبروں کو ناحق قتل کرتے ہیں اور ایسے لوگوں کی جان کے درپے ہو جاتے ہیں جو خلقِ خدا میں سے عدل و راستی کا حکم دینے اٹھیں، ان کو دردناک سزا کی خوشخبری سنا دو۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ٥

(النساء ۱۳۸)

اور جو منافق ہیں انھیں یہ مژدہ سنادو کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کا کوئی ساجھی ٹھہراؤ جبکہ اسی نے تمہیں پیدا کیا ہے۔ (متفق علیہ)

جہادِ نفس

آج کے دور میں یہ عام بات نظر آتی ہے کہ لوگ اس بات پر مطمئن ہیں کہ اپنی خواہشات کے پیچھے دیوانہ وار دوڑتے رہیں اور اسی معیار سے لوگوں اور چیزوں کے بارے میں فیصلے بھی کرتے رہیں۔ دنیا کے قوانین بھی اسی کی رعایت کرنے پر آمادہ ہیں۔ زندگی کے اس نئے رنگ کے ساتھ ادب و اخلاق کے معانی بھی بدل گئے ہیں۔

اس عام انتشار کے اسباب جو بھی ہوں لیکن ہمیں دین و وحی کے مطابق اچھائی کو اچھائی اور برائی کو برائی ماننا ہوگا اور یہ سمجھنا ہوگا کہ اسی میں رضائے الٰہی مضمر ہے۔

پھر نفس کی اصلاح کرنے والی چیزوں میں سرِ فہرست فرض نمازوں کی ادائگی ہے چاہے وہ نفس پر کتنی ہی شاق کیوں نہ ہو۔ یہ قیامت تک جاری رہنے والا عمل ہے۔ اور اس کے لیے ہر عذر اور شغل چھوڑ دینا چاہیے۔

نماز لہو و لعب میں مشغول رہنے والوں پر اس لیے بھی شاق گزرتی ہے کہ وہ وقفہ وقفہ سے ان کے دل پسند اشغال کا سلسلہ منقطع کر دیتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

کی تیاری کرے جو خدا ہر پوشیدہ چیز کو جانتا ہے یہ اس کا حق ہے کہ اس کی خلاف ورزی سے شرمایا جائے۔

ان حقوق کے تعلق سے ہر کمی بڑا عیب ہے۔ جو اس طرح زندگی گزارتا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق کٹا ہو، اس کا دل شکر سے خالی، اس کی نگرانی سے لاپرواہ اور اس کے سامنے پیشی کی تیاری سے غافل ہو تو چاہے دیگر پہلوؤں سے وہ کتنا ہی بلند ہو جائے ایک غدار اور خبیث جانور ہی رہے گا اس کا یہ کفر و انکار ایسی بڑی غداری ہے جو اس کے ہر کمال پر پانی پھیر دیتی ہے۔

مادّی تہذیب کے مقلّدین

سچ کو فضیلت اور جھوٹ کو ذلت سمجھا جانا لازمی ہے اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ سچوں کا احترام کیا جائے اور جھوٹوں کو نگاہِ حقارت سے دیکھا جائے۔

یعنی حق کی تصدیق اور باطل کی تکذیب صاف طور پر کی جانی چاہیے۔

ایمان اور انکار و الحاد نیز شرک اور توحید کو بھی خلط ملط نہیں کیا جا سکتا۔ جب وطن سے غداری کو بہت بڑا جرم قرار دیا جاتا ہے تو سارے اوطان کے خالق و مالک سے غداری کتنا بڑا جرم ہو گی؟

افراد ہوں یا اقوام۔ جن میں یہ مرض پایا جائے پوری حکمت اور نرمی کے ساتھ ان کے علاج کی ضرورت ہے تاکہ وہ پھر سے صحت یاب ہو جائیں لیکن اس سے بھی پہلے انھیں قائل کرنے کی ضرورت ہے کہ وہ کس مرض میں گرفتار ہیں اور اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔

ایمان کی جزا جنت اور انکار کی سزا جہنّم کے سوا کچھ نہیں۔

دلوں میں یہ مفہوم جاگزیں کرانے کے لیے ضروری ہے کہ گمراہوں کو ان کے ناگزیر انجام کی یاد دہانی کرائی جائے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ...... جو لوگ اللہ کے احکام و ہدایت کو ماننے سے

ہیں گم ہو کر رہ جاتے ہیں اور اچھے بُرے کی تمیز ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ صورت حال ضمیر کے لیے مہلک ہے اور اس طرح وہ لوگ ایسی رات میں جا پھنستے ہیں جس کی صبح ہی نہیں ہوتی۔ ایسی انسانی خواہشات بہت ساری ہیں جن پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔

نفس کی محبت، عورتوں کی چاہت، دولت کی محبت، شہرت کی خواہش وغیرہ۔

کوئی اس قدر ذات پرست ہو جاتا ہے کہ اپنے علاوہ کسی پر توجّہ ہی نہیں کرتا۔

کسی کو دولت سے اتنی محبت ہو جاتی ہے کہ وہ دن رات اسی کو جمع کرنے میں لگا رہتا ہے اور چاہے جتنی ضرورت ہو، خرچ نہیں کرتا۔

کوئی اپنی دولت اس لیے خرچ کرتا ہے کہ اسے شہرت حاصل ہو۔

کوئی اتنا شہوت پرست ہو جاتا ہے کہ جانوروں کی طرح اس کی پیاس ہی نہیں بجھتی۔

ان خواہشات کو بے لگام چھوڑنے سے ہی دنیا میں ساری برائیاں پھیلتی ہیں۔

آپ تھوڑا سا پانی پی لیں تو آپ کی پیاس بجھ جائے گی لیکن آپ دریا ہی میں کود پڑیں تو آپ غرق ہو جائیں گے۔

گود سے گور تک انسان کو بہت سے مسائل، آزمائشوں اور وساوس سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور ان سب کا سامنا کرتے ہوئے سیدھے راستے پر قائم رہنے کے لیے مسلسل جدّوجہد کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور اس جدّوجہد میں کامیابی تبھی مل سکتی ہے جب انسان اپنی خواہشات کی مخالفت کی مشق کرے۔

يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ (ص۔ ۲۶)

(ہم نے اس سے کہا) اے داوٗد ہم نے تجھے زمین پر خلیفہ بنایا ہے لہٰذا تو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ حکومت کر اور خواہشات نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بھٹکا دے گی۔ جو لوگ اللہ کی راہ سے بھٹکتے ہیں یقیناً ان کے لیے سخت سزا ہے کہ وہ یوم الحساب کو بھول گئے۔

وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ

ورنہ اگر اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آچکا

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ (البقرۃ ۔ ۴۵ - ۴۶)

بے شک نماز ایک سخت مشکل کام ہے مگر ان فرمانبرداروں کے لیے مشکل نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ آخر کار انھیں اپنے رب سے ملنا ہے اور اسی کی طرف پلٹ کر جانا ہے۔

اوقات مقررہ پر ان نمازوں کی ادائگی کے لیے نفس کے ساتھ مجاہدہ مطلوبہ کمال کی ٹھوس بنیاد ہے یہی حال ان تمام اطاعتوں کا ہے جن کا حکم اسلام نے دیا ہے کیونکہ وہ سب روح کی بلندیوں، اللہ تعالی کی خوشنودی کے حصول اور مطلوبہ کمال تک پہنچنے کی سیڑھیاں ہیں۔

عقل کو صیقل کرنے اور ترتیب دینے کی جتنی ضرورت ہے اس سے زیادہ انسانی نفس کے تزکیہ کی ضرورت ہے۔

آج کے دور میں ہم تعلیم کے مراحل کو برسہابرس تک پھیلاتے ہیں تاکہ عقل روشن ہو جائے اور اسے اتنا علم حاصل ہو جائے کہ ادراک اور فیصلہ بخوبی کر سکے۔

کیا آپ کے خیال میں نفس کو سدھارنے اور سنوارنے اور خواہشاتِ نفس پر قابو پا کر بلندی کی منزل تک پہنچانے کے لیے اس سے کم مدّت کی تربیت کی ضرورت ہو گی؟

خواہشات پر پاکیزگی کو غالب کرنے کے لیے ایک طویل جدّ وجہد درکار ہے اور اگر مقصد یہ ہو کہ نفس اس درجہ پر پہنچ جائے کہ بھلائی کو پسند کرنے اور اس سے لطف اندوز ہونے لگے اور برائی سے نفرت اور اس کی حقارت عادت بن جائے تو اور زیادہ مشق کی ضرورت ہو گی اور وہ بھی جب توفیق الٰہی بھی شامل ہو۔

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ (الحجرات ۷ - ۸)

مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند فرما دیا اور کفر و فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں اور اللہ علیم و حکیم ہے۔

بعض لوگوں کا نفس اتنا بگڑ جاتا ہے کہ وہ حق بات کو سمجھ بھی نہیں پاتے۔ وہ جہالتوں

نفس کے خلاف جہاد میں مشقت تو ہے ہی لیکن ہر چیز سے پہلے نیت و مقصد کی اہمیت ہوتی ہے۔

ایک چور بھی شب بیداری کرتا ہے لیکن اس لیے کہ لوگ سو جائیں تو چوری کرے۔

ایک سپاہی بھی شب بیداری کرتا ہے لیکن تنخواہ کے بدلے امن و امان کی نگرانی کے لیے

لیکن ایک تہجد گزار اپنا بستر چھوڑ کر اس لیے اٹھتا ہے کہ پورے سکون کے ساتھ اپنے رب کی عبادت کرے اور خشوع و خضوع کے ساتھ آیات پر غور کرے۔ اسے دنیا میں بوئی ہوئی اس کھیتی کی فصل آخرت میں کاٹنے کی امید ہوتی ہے۔

تَتَجَافٰی جُنُوْبُھُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ یَدْعُوْنَ رَبَّھُمْ خَوْفًا وَّطَمَعًا وَّمِمَّا رَزَقْنٰھُمْ یُنْفِقُوْنَ فَلَا تَعْلَمُ نَفْسٌ مَّآ اُخْفِیَ لَھُمْ مِّنْ قُرَّةِ اَعْیُنٍ جَزَآءًۢ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ۔

(السجدہ ۱۶ - ۱۷)

ان کی پیٹھیں بستروں سے الگ رہتی ہیں اپنے رب کو خوف اور طمع کے ساتھ پکارتے ہیں اور جو کچھ رزق ہم نے انھیں دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں پھر جیسا کچھ آنکھوں کی ٹھنڈک کا سامان ان کے اعمال کی جزا میں ان کے لیے چھپا رکھا گیا ہے اس کی کسی متنفس کو خبر نہیں۔

تینوں کی شب بیداری کا عمل یکساں ہے لیکن فرق زمین آسمان کا ہے۔

پہلا شخص مجرم اور سزا کا مستحق ہے۔ دوسرے شخص کو اگر اُجرت نہ ملے تو وہ یہ کام چھوڑ دے گا۔ تیسرا شخص جانتا ہے کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کس کے لیے کر رہا ہے۔

جہادِ نفس آسمانی ہدایت اور صحیح ادائگی کے ساتھ ہی صحیح ہوسکتا ہے محض جسم کی ضروریات کو کچلنا اور رہبانیت اسلام نہیں ہے۔

خواہشات پرستی

عصرِ حاضر میں مادّی نظریات نے اخلاقی قدروں کو پامال کر ڈالا ہے آج شخصی فضائل کو بہت سے لوگ غیر ضروری سمجھنے لگے ہیں بلکہ ان سے نجات پاکر خواہشات نفس کو بے لگام چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک شریفانہ خصلتیں انسانی طبیعت کے لیے بیڑیاں ہیں۔

اسی لیے آج خواہشات نفس کی تکمیل کی دوڑ جاری ہے جبکہ حرام طریقوں سے خواہشاتِ نفس کی تکمیل سے وہ اور زیادہ بڑھ جاتی ہیں اور اس طرح کے معاشرے میں حسد و بغض اور فساد و

الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (البقرہ ۱۲۰)

بعد تم نے ان کی خواہشات کی پیروی کی تو اللہ کی پکڑ سے بچانے والا کوئی دوست اور مددگار تمہارے لیے نہیں۔

قرآن منکرین کی یہ صفت بیان کرتا ہے کہ ان کی خواہشاتِ نفس نے ہی ان کے لیے ظلم وجہالت کو خوشنما بنا رکھا ہے۔

بَلِ اتَّبَعَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ بِغَیْرِ عِلْمٍ فَمَنْ یَّهْدِیْ مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ۔ (الروم ۲۹)

مگر یہ ظالم بے سمجھے بوجھے اپنے تخیلات کے پیچھے چل پڑے ہیں اب کون اس شخص کو راستہ دکھا سکتا ہے جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو۔

بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ بہت سے لوگوں کے دلوں پر خواہشات کا اس طرح غلبہ ہوتا ہے وہ ان کے اقوال وافعال پر فیصلہ کن انداز میں اثر انداز ہوتی ہیں اور ان کے حواس پر اس طرح چھا جاتی ہیں کہ وہ زندگی کو اس کے حقیقی رنگ میں دیکھنے کی بجائے اپنے خاص زاویہ سے دیکھتے ہیں جیسے آپ نیلے رنگ کا چشمہ لگالیں تو سب کچھ نیلا ہی نظر آئے گا۔

اَرَاَیْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ ؕ اَفَاَنْتَ تَكُوْنُ عَلَیْهِ وَكِیْلًا ۝ اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ ؕ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا۔ (الفرقان ۴۳،۴۴)

کبھی تم نے اس شخص کے حال پر غور کیا ہے جس نے اپنی خواہشِ نفس کو اپنا خدا بنا لیا ہو؟ کیا تم ایسے شخص کو راہ راست پر لانے کا ذمہ لے سکتے ہو؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ ان میں سے اکثر لوگ سنتے اور سمجھتے ہیں یہ تو جانوروں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

یہ جانوروں کی سی زندگی دنیا وآخرت دونوں میں نامرادی کا آسان راستہ ہے۔ اس طرح کے لوگوں کا سارا محور عیش کوشی، لذت پرستی، شہوت پرستی، بے انصافی اور آخرت پر دنیا کو ترجیح دینا ہوتا ہے اور اس کا انجام ظاہر ہے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰی ۝ وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰی ۝ وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَی النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰی۔ (النازعات ۳۷-۴۱)

تو جس نے سرکشی کی تھی اور دنیا کی زندگی کو ترجیح دی تھی دوزخ ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی اور جس نے اپنے رب کے سامنے کھڑے ہونے کا خوف کیا تھا اور نفس کو بُری خواہشات سے باز رکھا تھا جنت ہی اس کا ٹھکانہ ہوگی۔

بزرگوں کے تجربے

ہمارے قدیم ورثہ میں انسانی نفس کے گہرے مطالعہ و تجزیہ کا گرانقدر سرمایہ موجود ہے جس میں نفس کے امراض، ان سے نجات اور نفس کو صحیح راہ پر لگانے کے طریقے تجویز کیے گئے ہیں لیکن ان سے واقفیت محنت و مشقت کے بغیر ممکن نہیں۔ علمی و سیاسی ضعف کے دور میں ان پر کسی حد تک پیچیدگی کے پردے بھی پڑ گئے۔ تاہم تصوف کی کتابوں کا مطالعہ کرنے سے ایسی باتیں مل جاتی ہیں جن سے بہت فائدہ ہو سکتا ہے۔ یہاں ہم قارئین کے سامنے ایک بزرگ عطار اللہ سکندریؒ کے کچھ اقوال پیش کریں گے اور تعلیمات اسلامی کی روشنی میں ان کی کچھ تشریح بھی تاکہ میدانِ تربیت میں سرگرم حضرات کے لیے نقوشِ راہ کا کام دیں۔

محنت رائگاں ہے

"جس چیز کی تمہیں ضمانت دی گئی ہے اس کے لیے جدّوجہد کرنا اور جس چیز (کے لیے جدّوجہد) کا تم سے مطالبہ کیا گیا ہے اس میں کوتاہی برتنا اندھے پن کی دلیل ہے"

آپ کے کچھ حقوق ہیں۔ اسی طرح آپ پر کچھ فرائض عائد ہوتے ہیں۔ بہت سے لوگ اپنے حقوق کو (بلکہ جسے اپنا حق سمجھ لیتے ہیں) شدت سے طلب کرتے ہیں لیکن جو فرائض ان پر عائد ہیں ان کی ادائیگی میں کوتاہی کرتے ہیں بلکہ بسا اوقات ان کا انکار ہی کر بیٹھتے ہیں۔

اس طرح کے لوگ ان جانوروں سے قریب ہیں جو صرف اپنی ضرورت تو محسوس کرتے ہیں لیکن

خونریزی عام ہو جاتی ہیں۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ أَنْ تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ وَتُقَطِّعُوا أَرْحَامَكُمْ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ فَأَصَمَّهُمْ وَأَعْمَىٰ أَبْصَارَهُمْ (محمد ۲۲-۲۳)

اب کیا تم لوگوں سے اس کے سوا کچھ اور توقع کی جا سکتی ہے کہ اگر تم الٹے منہ پھر گئے تو زمین میں پھر فساد برپا کرو گے اور آپس میں ایک دوسرے کے گلے کاٹو گے۔ یہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی اور ان کو اندھا اور بہرا بنا دیا۔

حق یہ ہے کہ خواہشات پرستی اگر افراد کے حواس کو بے اثر کر دیتی ہے تو معاشروں کو شدید تاریکیوں میں ڈال دیتی ہے۔

اسلام نے نہ کسی پاک چیز کو حرام کیا ہے نہ کسی اچھی چیز پر پابندی لگائی ہے انسانی طبیعت کے لیے جو چیزیں بھی مناسب ہیں انھیں مباح کیا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے وہی چیزیں حرام کی ہیں جو انسان کو صحیح راستہ سے ہٹا کر برائی تک پہنچانے والی ہیں۔

اسلام تو انسان کو یہ یاد دلانا چاہتا ہے کہ انسان مادہ ہی نہیں رُوح بھی ہے اور آسمان سے اس کا تعلق زمین کے مقابلہ میں کہیں زیادہ گہرا ہے اس لیے اس تعلق کی حفاظت کرنی چاہیے اور اگر نفس اس میں رکاوٹ ڈالتا ہے تو اس کے خلاف جدّ و جہد کرنی چاہیے۔ اور انسان جتنا اس جدّ و جہد میں کامیاب ہوگا اتنا ہی اس کا مرتبہ بلند ہوگا، اور یہ جدّ و جہد اسلحہ کی جنگ سے بھی زیادہ سنگین ہوتی ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: اپنے نفس کا خود محاسبہ کرو اس سے پہلے کہ اس کا محاسبہ کیا جائے اور اپنے نفس کو خود تولو اس سے پہلے کہ اسے تولا جائے۔ قیامت سے پہلے اپنا محاسبہ کرنا کل قیامت کے دن کے حساب سے زیادہ آسان ہے۔ اس دن کے لیے تیاری کرو جب تم پیش کیے جاؤ گے اور تمہاری کوئی ڈھکی چھپی چیز بھی مخفی نہیں رہے گی۔

نفس کو اگر طمع دلائی جائے تو اس کی طمع بڑھتی جائے گی اور اگر نفس کو بے لگام چھوڑ دیا جائے تو وہ فاسد ہو جائے گا ہاں اگر اسے خدا کے حکم کے تابع بنایا جائے تو درست ہو جائے گا۔

لوگ کتنے زیادہ ہوتے ہیں ——— ان کے لیے یہ بات بہترین رہنما ہے۔

دنیا و دین میں امامت و رہنمائی کا منصب برسہا برس کے صبر و مشقت کا طالب ہوتا ہے۔

انسان کو چاہیے کہ وہ پہلے خاموشی سے صلاحیت پیدا کرنے میں لگا رہے جیسے ہر درخت کا بیج پہلے مٹی کے اندر گوشۂ گمنامی میں پڑا رہتا ہے پھر اپنا راستہ نکالتا ہے۔ نوجوانوں کے لیے اس میں کیا مشکل ہے کہ وہ اپنی صلاحیتیں مکمل کرنے کے بعد ہی لوگوں کے سامنے آئیں؟

آپ دیکھتے ہیں کہ ایک شخص چند مضامین لکھتے ہی اپنے آپ کو مفکر سمجھنے لگتا ہے یا چند چھوٹے موٹے کام کر کے اپنے آپ کو عالمی سیاستدان سمجھنے لگتا ہے اگر وہ گمنامی کو اختیار کر کے اپنی صلاحیتیں پختہ کرتا تو کتنا بہتر ہوتا۔

پھر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ آپ جو کچھ کریں اللہ تعالیٰ کی رضا کے حصول کے لیے کریں شہرت کے لیے نہیں کیونکہ شہرت طلبی اللہ تعالیٰ کی نگاہ سے گرا دیتی ہے۔

تو دو چیزوں سے پرہیز کیجیے۔

ایک تو یہ کہ مطلوبہ صلاحیتیں پختہ و مکمل ہونے سے پہلے سامنے نہ آیئے۔

دوسرے یہ کہ لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے (یعنی شہرت کے لیے) صلاحیتیں حاصل نہ کیجیے۔

پھر یہ بھی سمجھنا چاہیے کہ تقدیر آپ کی خواہش کے پیچھے نہیں چل سکتی۔ حالات کی رفتار کے پیچھے حکمتِ عالیہ کی کارفرمائی ہوتی ہے اور اس کا ہماری رضامندی یا ناراضگی سے کوئی تعلق نہیں۔

جو کسی ایسی چیز کو مقدم کرنا چاہے جسے اللہ تعالیٰ نے مؤخر کیا ہے یا کسی ایسی چیز کو مؤخر کرنا چاہے جسے اللہ تعالیٰ نے مقدم کیا ہے وہ اپنا سر چٹان سے ٹکراتا ہے اس سے صرف اس کا سر ہی پھوٹ سکتا ہے۔

عقلمند وہی ہے جو حقائق کا اعتراف کرے اور بھرپور دانائی کے ساتھ ان کے مطابق چلنے کی کوشش کرے۔

زمانہ پر ناراض ہونے کے بجائے خود اپنی خواہشات پر ناراض ہونے ہی میں بھلائی ہے۔ میں خود اپنے تجربات کی روشنی میں یہ اعتراف پیش کرتا ہوں کہ اکثر مجھے ان چیزوں سے فائدہ پہنچا جن سے بظاہر مجھے تنگی محسوس ہوتی تھی۔ مشکلات و مصائب عقل کو پختہ کرتے ہیں اور صلاحیتوں کو جلا بخشتے ہیں۔

اپنی ڈیوٹی انجام دینے کے لیے کوڑے کے منتظر رہتے ہیں۔

رزق کی ضمانت اللہ تعالیٰ نے دے رکھی ہے لیکن اس کے طلب میں لوگ انتہائی سرگرداں رہتے ہیں ــــــ اگر اللہ تعالیٰ رزق کا معاملہ مخلوقات کے سپرد کر دیتا تو دنیا کب کی مٹ چکی ہوتی۔ لیکن دوسری طرف اللہ تعالیٰ سے تعلق بہتر بنانے، اللہ تعالیٰ کے دین کو برپا کرنے میں دوسروں سے تعاون کرنے اور اللہ تعالیٰ کی حدود کی پابندی میں انتہائی کوتاہی و غفلت برتتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو رزق کی فراہمی کی ضمانت دے کر انھیں راحت بخش دی تھی اور انھیں عبادت کا مکلّف بنایا تھا لیکن انسانوں نے عبادت سے غفلت کر لی اور اپنے آپ کو رزق کے لیے سرگردانی کا مکلّف بنالیا۔

اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے:

وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا لَا نَسْئَلُكَ رِزْقًا نَحْنُ نَرْزُقُكَ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى (طٰہ ۱۳۲)

اپنے اہل و عیال کو نماز کی تلقین کرو اور خود بھی اس کے پابند رہو ہم تم سے کوئی رزق نہیں چاہتے رزق تو ہم ہی تمہیں دے رہے ہیں اور انجام کی بھلائی تقویٰ ہی کے لیے ہے۔

اور لوگ روٹی روٹی چیخ رہے ہیں۔ دنیا طلبی کے علاوہ ان کا کوئی شغل ہی نہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے رزق رسانی اور آسانی کے وعدے ان کی نگاہوں سے اوجھل ہیں جبکہ یہ دنیا بھی اللہ تعالیٰ ہی سے مل سکتی ہے۔

اسے اندھاپن نہیں تو اور کیا کہیں گے۔

شہرت طلبی

”اپنے وجود کو گمنامی کی مٹی میں دفن کر دو جو پودا زمین کے اندر سے نہیں اُگے گا اس سے پیداوار حاصل نہیں ہو سکتی“۔

جو لوگ شہرت کے حصول میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ تھوڑا سا علم اور مہارت لوگوں کی رہبری اور لوگوں میں مرکزی حیثیت حاصل کرنے کے لیے کافی ہیں ــــــ اور اس طرح کے

حدیث میں آتا ہے کہ دو نعمتوں کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکہ میں رہتے ہیں صحت اور فرصت و فراغ۔ (بخاری)

اپنے خدا پر بھروسہ رکھیے

"جس مقصد کی تکمیل آپ اپنے رب سے چاہیں گے وہ رک نہیں سکتا اور جس مقصد کی تکمیل آپ اپنے نفس سے چاہیں گے وہ آسان نہیں ہو سکتا"

جب مسلمان معرکہ بدر میں کود رہے تھے تو انھیں اس کا احساس تھا کہ جنگ ان پر فرض کی گئی ہے اس کی ضروری تیاری بھی نہیں تھی۔ اللہ تعالیٰ پر ان کا پورا انحصار تھا اور وہ شدت سے اس کی مدد کے طلبگار تھے اپنے آپ کا احساس مدھم بلکہ غائب ہو چکا تھا اور اللہ تعالیٰ کی یاد بڑھ گئی تھی وہ پوری طرح سمجھ رہے تھے کہ وہ تو مشیت الٰہی کے لیے محض آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں مؤثر کار فرما تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ چنانچہ اس معرکہ میں انھیں شاندار کامیابی حاصل ہوئی۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى۔ (الانفال - ۱۷)

بس حقیقت یہ ہے کہ تم نے انھیں قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا اور اے نبی تو نے نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے پھینکا۔

حقیقت یہ ہے کہ انسان جب اپنی سی کوشش کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے عزم، توفیق اور کامیابی کا طلبگار ہوتا ہے۔ تو اسے غالب طاقت حاصل ہو جاتی ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسی روح کے ساتھ دشمنوں سے مقابلہ فرماتے تھے۔

"اے پروردگار! دشمنوں کے مقابلے میں ہم تجھی کو اپنی ڈھال بناتے ہیں اور ان کی شرانگیزیوں سے تیری ہی پناہ چاہتے ہیں۔ خدایا تو ہی میرا دست و بازو اور مددگار ہے۔ میں تیرے ہی سہارے تدبیر کرتا ہوں اور لڑتا ہوں"

لیکن جب انسان اللہ تعالیٰ سے غافل ہو کر اپنی طاقت پر ناز کرنے لگتا ہے تو غیر متوقع نتائج نکلتے ہیں جیسا کہ معرکہ حنین میں سامنے آچکا ہے جب مسلمانوں کو اپنی تعداد کی کثرت پر ناز ہو گیا تھا اور وہ کارسازِ مطلق کی طرف دیکھنے کے بجائے اپنی کثرت کی طرف دیکھنے لگے تھے۔

وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ (البقرہ ۲۱۱)

ہوسکتا ہے تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور وہ تمہارے لیے بہتر ہو اور ہوسکتا ہے تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

شیطان کی فریب کاری

"اپنے اعمال کو فرصت کے اوقات کے لیے ٹالنا نفس کی دھوکہ دہی ہے"

کسی کام کو مؤخر کرنا ایک درماندہ نفس اور پست ہمّت کی فریب دہی ہے۔ جو آج پر قابو نہیں رکھتا وہ کل پر اور زیادہ قابو نہیں رکھ سکتا۔

خواہشات کے ساتھ معرکہ آرائی کو مؤخر کرنا ان سے مقابلہ میں اپنی درماندگی کا اعتراف ہے کسی مسلمان کو خواہشات کے آگے خود سپردگی نہیں اختیار کرنی چاہیے اور ان سے پہلی فرصت میں چھٹکارا پانا چاہیے۔

جو رکاوٹیں درپیش ہیں انہیں دُور کرنے کی کوشش کا آغاز کل سے پہلے آج اور آج سے پہلے ابھی کر دینا چاہیے۔ تاخیر کا مطلب ہے برائی کی عمر بڑھانا اور بھلائی کی عمر کم کرنا۔ انسان کو اپنے انجام سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْٓءٍ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًا بَعِيْدًا وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ (آل عمران ۳۰)

وہ دن آنے والا ہے جب ہر نفس اپنے کیے کا پھل حاضر پائے گا خواہ اس نے بھلائی کی ہو یا برائی اس روز آدمی یہ تمنا کریگا کہ کاش ابھی یہ دن اس سے بہت دُور ہوتا، اللہ تمہیں اپنے آپ سے ڈراتا ہے اور وہ اپنے بندوں کا نہایت خیر خواہ ہے۔

يُنَبَّؤُا الْاِنْسَانُ يَوْمَئِذٍۢ بِمَا قَدَّمَ وَاَخَّرَ (القیامہ ۱۳)

اس روز انسان کو اگلا و پچھلا کیا کرایا بتا دیا جائے گا۔

فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَاِنْ یَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَیْـًٔا لَّا یَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ ۔ (الحج ۷۳)

معبودوں کو تم خدا کو چھوڑ کر پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی پیدا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے بلکہ اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو وہ اسے چھڑا بھی نہیں سکتے چاہنے والے بھی کمزور اور جن سے مدد چاہی جاتی ہے وہ بھی کمزور۔

اس لیے مانگنا تو اللہ تعالیٰ ہی سے چاہیے کہ وہی قوی وغنی ہے۔

ایک عالم ظالم حکمرانوں کے سامنے بڑی کمزور آواز میں بولتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے نفس میں طمع کے بیج ہیں جو اسے گونگا بنائے دے رہے ہیں اگر وہ مخلوق کی نوازش سے مایوس ہو کر خالق کے نوازش کا طالب ہوتا تو سر اٹھا کر بجلی کی طرح کڑک سکتا تھا۔

نفس کی طمع نے کتنی ہی مصلحتوں اور حقوق کو پامال کر رکھا ہے۔

لوگوں سے مایوسی کے لیے عفت و خود داری، کم پر قناعت اور لوگوں سے بے نیازی پر نفس کی تربیت کی ضرورت ہے۔ کسی مخلوق سے مال وجاہ کی امید حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

کمال کے حصول میں کوتاہی

”بسا اوقات آپ غلط کار ہوتے ہیں لیکن اپنے سے بھی بدتر لوگوں کی صحبت آپ کو اپنے بارے میں غلط فہمی میں مبتلا کر دیتی ہے۔“

کانا یقیناً اندھے سے بہتر حال میں ہوتا ہے لیکن کانا پن جسم کا کمال نہیں بن سکتا۔

بعض لوگ اپنے سے بدتر حال و اعمال والے لوگوں کو دیکھتے ہیں تو اپنے کم عمل کو بہت سمجھنے لگتے ہیں اور حصولِ کمال سے رک جاتے ہیں۔

اعمالِ خیر میں اپنے سے کم تر کی طرف دیکھنا مہلک ہے۔ اس سلسلے میں اپنے سے بہتر اور بلند تر لوگوں کو دیکھنا چاہیے۔ پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ ہم بھی ایسے کیوں نہ بن جائیں۔

کوتاہ لوگوں کی صحبت اپنی کوتاہی پر پردہ ڈال دیتی ہے اور انسان کو شش سے کمال کے

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَّضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ (التوبہ ۲۵)

اور غزوہ حنین کے روز جب تمہیں اپنی کثرتِ تعداد کا غرہ تھا مگر وہ تمہارے کچھ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی اور تم پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے۔

اسی طرح کے تلخ انجام کا مزا مسلمانوں کو معرکہ احد میں بھی چکھنا پڑا تھا۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ۔ (آل عمران ۱۶۵)

اور یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آپڑی تو تم کہنے لگے یہ کہاں سے آئی؟ حالانکہ (جنگ بدر میں) اس سے دوگنی مصیبت تمہارے اوپر پڑ چکی ہے۔ اے نبی ان سے کہو یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔

انسانی کوششوں میں کتنے ہی خلا اور کوتاہیاں رہ جاتی ہیں اگر اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال نہ ہو تو کامیابی ناممکن ہے اس لیے ہر چیز میں اللہ تعالیٰ سے مدد طلب کرنی چاہیے اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ کاہلی اور کوتاہی سے کام لیں کہ یہ تو اللہ تعالیٰ کے مقررہ قانون کے خلاف ہے، بلکہ سب سے بڑا سبب اور ذریعہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو سمجھیں۔

لوگوں سے مایوسی

"ذلّت کی شاخیں لالچ کے بیج ہی سے نشوونما پاتی ہیں"

انسان کی بہترین حالت وہ ہوتی ہے جب وہ اپنی تمام امیدیں اللہ تعالیٰ سے وابستہ کر کے اس سے گڑگڑاتا ہے لیکن یہ حالت تبھی ہوگی جب چیزوں کی فطرت کا ٹھوس عقلی شعور ہو۔

ایک فقیر اپنے ہی جیسے فقیر سے کیا امید کرسکتا ہے۔ کسی انسان سے آپ کیا امید کرسکتے ہیں جبکہ وہ ایک مکھی سے بھی جیت نہیں سکتا۔

کسی مرض کا جرثومہ مکھی سے بھی زیادہ حقیر ہوتا ہے لیکن بڑے سے بڑے طاقتور انسان کی صحت چھین لیتا ہے۔

يَآاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ

لوگو ایک مثال دی جاتی ہے غور سے سنو جن

رکھتے ہوئے اپنے کسی مرض کے لیے دوا نہ استعمال کرے تو اسے اس علم سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

اس سے بہتر تو وہ شخص ہوگا جو کم علم رکھتا ہو لیکن گہرے اخلاص کے ساتھ اپنے امراض کی جستجو میں رہے اور برابر تزکیۂ نفس اور حالت بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہے۔ اگر بڑے بڑے علماء بھی اپنے نفس سے مطمئن ہو کر اس کی اصلاح سے غافل رہیں تو ظاہر ہے ان سے بہتر انجام اس کم علم شخص کا ہی ہوگا۔

اللہ تعالیٰ سے لَو لگانا

"بسا اوقات اطاعت کا دروازہ کھول دیا جاتا ہے لیکن قبولیت کا دروازہ نہیں کھولا جاتا بسا اوقات کوئی گناہ ہی درجۂ کمال تک پہنچنے کا سبب بن جاتا ہے ایسی معصیت جو دل میں احساسِ ذلت اور انکسار پیدا کردے اس اطاعت سے بہتر ہے جو دل میں غرور و تکبر پیدا کردے"

قدیم زمانے سے پختہ علم والے حضرات ایسے اہلِ عبادت سے تنگی محسوس کرتے آرہے ہیں جو عبادت کی روح کے بجائے اس کی ظاہری شکل پر ہی توجہ دیتے ہیں۔ ظاہری باتوں کو مقصد بنا لیتے ہیں اور حقائق کا ادراک ہی نہیں کرتے۔

ایسے لوگ ہمیشہ دین کے لیے نقصان دہ اور لوگوں کو عبادات سے متنفر کرنے کا سبب بنتے رہے ہیں۔

وہ نماز پڑھتے ہیں لیکن ان کی نماز رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بقول "کالی سیاہ نکلتی ہے اور کہتی ہے اللہ تعالیٰ تمہیں بھی اسی طرح ضائع کرے جیسے تم نے مجھے ضائع کیا۔" (طبرانی)

ظاہر ہے ایسی نماز اس کے منہ پر ماردی جائے گی۔

ایسے لوگ روزہ رکھتے ہیں لیکن اس کی قیمت کیا ہوتی ہے؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے الفاظ ہیں:

"بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں روزہ سے بھوک کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے شب بیدار ایسے ہوتے ہیں کہ انھیں رت جگائی کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا۔" (ابن ماجہ)

جن درجات تک پہنچ سکتا ہے وہاں نہیں پہنچ پاتا اسی لیے عطاء اللہ سکندریؒ نصیحت کرتے ہیں کہ:

"ایسے شخص کی صحبت نہ اختیار کرو جس کا حال تمہارے لیے مہمیز کا کام نہ کرے اور جس کی بات اللہ تعالیٰ کی طرف رہنمائی نہ کرے"۔

اپنے نفس سے چوکنا رہیے

"ہر معصیت، غفلت اور شہوت کی بنیاد اپنے نفس پر مطمئن ہو جانے اور ہر اطاعت بیدار مغزی اور پاکیزگی کی بنیاد اپنے نفس سے مطمئن نہ ہونے پر ہے، آپ کسی ایسے جاہل کی صحبت اختیار کریں جو اپنے نفس سے مطمئن نہ ہو یہ اس سے بہتر ہے کہ آپ ایسے عالم کی صحبت اختیار کریں جو اپنے نفس سے مطمئن ہو۔ اس عالم کا علم کیا ہے جو اسے اپنے نفس سے مطمئن کیے ہوئے ہے اور اس جاہل کی جہالت کیا ہے جو اسے اپنے نفس سے مطمئن نہیں ہونے دیتی"۔

علاج وہی تلاش کرے گا جو اپنے مرض کو محسوس کرے۔ جو اپنے مرض کو محسوس ہی نہ کرے گا وہ علاج ہی نہیں کرے گا اور اس کے مرض کے جراثیم پھیلتے پھیلتے اس کی ہلاکت کا سبب بن جائینگے۔

اسی طرح انسانی نفس کا بھی حال ہے جو اس کے امراض کو محسوس کرے گا وہی علاج کی بھی کوشش کرے گا۔ مرض کا احساس علاج کا پہلا قدم ہے۔

خود انبیاءؑ کی زبانی کہلوایا گیا ہے:

وَمَا أُبَرِّئُ نَفْسِي إِنَّ النَّفْسَ لَأَمَّارَةٌ بِالسُّوءِ إِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّي إِنَّ رَبِّي غَفُورٌ رَحِيمٌ (یوسف - ۵۳)	میں کچھ اپنے نفس کی برأت نہیں کر رہا ہوں نفس تو بدی پر اکساتا ہی ہے الا یہ کہ کسی پر میرے رب کی رحمت ہو بے شک میرا رب بڑا غفور رحیم ہے۔

اگر آپ کسی شخص کو اپنے نفس سے مطمئن دیکھیں تو اس سے مایوس ہو جائیے کیونکہ اسے اپنے مرض کا احساس تک نہیں وہ درجۂ کمال تک کیا پہنچے گا۔

محض نظریاتی علم سے کوئی شخص بلندی تک نہیں پہنچ سکتا۔

اس شخص کی کیا قیمت ہوگی جس کے دماغ میں معلومات کا خزانہ ہو لیکن اس کے باوجود اسے اپنے امراض کا علم نہ ہو سکے اور اپنی غلط کاریوں میں مبتلا رہے کوئی شخص دواؤں سے پوری واقفیت

جھنجھوڑنے کا سبب بن جاتا ہے اور وہ خدا کی پکڑ کے خوف سے اشکبار ہو جاتا ہے۔

اس گناہ گار کا خوف اس عبادت گزار کے تکبر سے افضل ہے۔

اسی پس منظر میں یہ حدیث پڑھیے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

ایک شخص نے کہا خدا کی قسم خدا فلاں شخص کی بخشش نہیں فرمائے گا تب اللہ تعالیٰ نے فرمایا کون میرے اوپر یہ دعویٰ کر رہا ہے کہ میں فلاں شخص کی بخشش نہیں کروں گا۔ میں نے اسے بخش دیا اور تمہارا عمل ساقط کر دیا۔ (مسلم)

○

اس سے کوئی شخص یہ نہ سمجھے کہ عبادت کی شان گھٹانا مقصود ہے ہرگز نہیں یہ تو حقیقی عبادت کی حمایت اور جعلی عبادت کے خلاف آگاہی اور بندوں کے سامنے یہ واضح کرنا ہے کہ وہ اپنی عبادت سے غرور میں مبتلا نہ ہوں۔

یہ انھیں اس پر ابھارتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کریں جیسا کہ صالحین کی صفت بیان کرتے ہوئے بتایا گیا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ
(المومنون ۶۰)

اور جن کا یہ حال ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے۔

گناہ رضامندی کا سبب نہیں بن سکتے بلکہ وہ تو دنیا میں رسوائی و نامرادی اور آخرت کے عذاب کا ذریعہ ہیں۔

لیکن جو گناہ گناہگاروں کے ضمیر بیدار کر دیں اور انھیں توبہ کے دروازے تک پہنچا دیں وہ ـــ ندامت کے آنسوؤں سے غسل کے بعد ـــ گناہ باقی نہیں رہ جاتے۔ رب العالمین تک پہنچانے کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔

مادہ کے قیدی

"ایک عالم سے دوسرے عالم کی طرف چکر نہ لگاؤ ورنہ تیلی کے بیل کی طرح ایک ہی جگہ

عبادت تو جسم و روح دونوں کا نام ہے جو عبادت کو زندہ حالت میں پیش کرے گا اسی کو قبولیت حاصل ہوگی۔

اسی لیے ایک حدیث میں آتا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ کسی بندے سے وہی عمل قبول کرتا ہے جس میں بدن کے ساتھ دل بھی شامل ہو۔

(مسند الفردوس)

میں نے بعض کسانوں کو دیکھا ہے کہ غسل کی ضرورت کے بعد کسی غیر صاف ستھرے پانی والے تالاب میں ڈبکی لگا لیتے ہیں۔ اگر آپ ان کے قریب جائیں تو بدبو محسوس کریں گے ایسے غسل سے کیا فائدہ؟

اسی طرح بعض لوگ محض ظاہری صورتوں کے ساتھ عبادت تو کر لیتے ہیں لیکن وہ عبادت روح و حقیقت سے محروم ہوتی ہے۔

عبادت تو پورے شعور کے ساتھ کرنی چاہیے تبھی اس سے دل میں نرمی اور انکسار پیدا ہوگا اور اخلاق و کردار سدھریں گے۔

آپ دیکھیں گے کہ بعض لوگ اس لیے عبادت کرتے ہیں کہ لوگوں میں اپنی سربلندی قائم کریں ان کے کردار میں نرمی و تواضع کا شائبہ بھی نہیں ہوتا بلکہ بعض غیر عبادت گزار لوگ ان سے بہتر اخلاق رکھتے ہیں۔

بسا اوقات ان سے کوئی گناہ سرزد ہو جاتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کے خوف سے کانپ اٹھتے ہیں اور اپنے شکستہ دل کے ساتھ بارگاہِ خدا میں اظہارِ ندامت کرتے ہیں۔

جبکہ پہلی قسم کے لوگوں نے عبادت سے قساوتِ قلبی کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا

اللہ تعالیٰ نے عبادتیں اس لیے واجب کی ہیں کہ بندے تواضع و انکسار سیکھیں، تکبر و غرور نہیں وہ عبادت کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کے طلبگار ہوں پھر دل کی رقت اور سیرت کی پاکیزگی کے ساتھ تمام مخلوقات سے رحم کے ساتھ پیش آئیں۔

اگر کوئی عبادت گزار اس صفت سے عاری ہے تو اس نے درحقیقت عبادت ہی نہیں کی

اللہ تعالیٰ نے معصیتوں کو حرام قرار دیا ہے۔

تاہم بسا اوقات کسی شخص کے لیے کسی معصیت کا ارتکاب اس کے سوئے ہوئے ضمیر کو

اس وسیع و عریض کائنات کو دیکھ کر معمولی عقل رکھنے والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ اس کا بنانے والا کتنا عظیم ہوگا اور اس کی حمد و ثنا کتنی ضروری ہوگی۔

کچھ لوگ تو صرف مادہ کو جانتے ہیں اور اس کے آگے انھیں کچھ نظر نہیں آتا۔

لیکن کچھ لوگ جو اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور یہ جانتے ہیں کہ ایک دن اس کے سامنے پیش ہونا ہے وہ بھی زندگی کی مختلف مشغولیتوں اور روزی روزگار کے چکروں میں اس طرح الجھ جاتے ہیں کہ ایمان کے تقاضے نگاہوں سے اوجھل ہوجاتے ہیں اور مادی تقاضے احساس پر غالب رہتے ہیں پھر گھڑی کے پنڈولم کی طرح زندگی ایک ہی ڈھرے پر چکر لگاتی رہ جاتی ہے اور تیلی کے بیل کی طرح جہاں سے چلتے ہیں پھر وہیں پہنچ جاتے ہیں۔

مومن کے لیے واجب ہے کہ وہ دنیا کے سارے علائق کو ثانوی سمجھے اور اصل توجہ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی پر مرکوز رکھے۔

یہ بھی ایک دھوکہ ہوتا ہے کہ آدمی کام تو اپنے لیے کرتا ہے اور سمجھتا یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے لیے کر رہا ہے اگر وہ باریک بینی سے دیکھے تو معلوم ہوجاتے گا اس کی راحت و مشقت اور خوشی و ناراضگی وغیرہ کے محرکات اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کے بجائے خود اپنے نفس کی خواہشات اور تقاضوں پر مبنی ہیں اور یہ خطرناک بات ہے کیونکہ ہجرت اگر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تب تو مقبول ہے ورنہ اگر کسی دنیاوی غرض سے ہے تو بیکار۔

○

اللہ تعالیٰ کے وجود کا احساس کرنے کے لیے انسانوں کو کوئی مشقت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ تو محض حقیقت محسوس کرنا ہے۔ یہ کسی قریب یا دور کی چیز کو ذہن میں بٹھانے یا تصور کرنے کی بات نہیں یہ تو اس طرح ہے جیسے آپ گھر میں یا گاڑی میں بیٹھے ہوئے ہوں اور یہ محسوس کریں کہ وہ گھر یا گاڑی ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے دن رات میں ایک پل کے لیے بھی غافل اور دور نہیں رہتا اگر بندے اسے محسوس نہ کریں تو یہ ان کی کوتاہی ہے۔

هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ   وہی اوّل بھی ہے وہی آخر بھی وہی ظاہر بھی

چکر لگاتے رہ جاؤ گے بلکہ عالم کو بنانے والے کی طرف چلو کیونکہ:

وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَہٰی (النجم) اور تیرے رب کی طرف ہی انجام کار ہے۔

اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس قول پر توجہ دو کہ:

جس نے اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہجرت کی اس کی ہجرت تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہوئی اور جس کی ہجرت دنیا کمانے کے لیے یا کسی عورت سے نکاح کرنے کے لیے تھی تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہوئی۔ (بخاری)

لہٰذا اگر تم عقلمند ہو تو اس معاملہ پر غور کرو"

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالسَّمَآءَ بَنَیْنٰھَا بِاَیْدٍ وَّ اِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰھَا فَنِعْمَ الْمٰھِدُوْنَ وَمِنْ کُلِّ شَیْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَیْنِ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ فَفِرُّوْٓا اِلَی اللّٰہِ اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ اِنِّیْ لَکُمْ مِّنْہُ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ۔

(الذاریات ۴۷-۵۱)

آسمان کو ہم نے اپنے زور سے بنایا ہے اور ہم اس کی قدرت رکھتے ہیں زمین کو ہم نے بچھایا ہے اور ہم بڑے اچھے ہموار کرنے والے ہیں اور ہر چیز کے ہم نے جوڑے بنائے ہیں شاید کہ تم اس سے سبق لو پس دوڑو اللہ کی طرف میں تمہارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں اور نہ بناؤ اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا معبود میں تمہارے لیے اس کی طرف سے صاف صاف خبردار کرنے والا ہوں۔

پہلی تین آیتوں میں کائنات کی بلندیوں اور گہرائیوں اور ان میں پیدا ہونے والی زندگی اور زندوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

پھر آخری دو آیتوں میں کائنات سے کائنات کے خالق کے وجود اور اس کی توحید کی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔

اور اللہ تعالیٰ کی طرف بھاگنے کا حکم دیا گیا ہے کہ کائنات کے مظاہر میں پھنس کر رہ جانا ایک عیب ہے جسے کوئی ذی ہوش پسند نہیں کرسکتا۔

نیت و مقصد کے مطابق وزن دے جس عمل کا خالص مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی نہ ہو وہ بیکار ہے۔

روئے ارض پر جو وسیع سرگرمیاں جاری ہیں اور جن کا مقصد زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنا یا بڑائی اور شہرت حاصل کرنا ہے وہ سب اسی مٹی میں مل جائیں گی۔ باقی رہنے والی اور برکت والی سرگرمیاں وہی ہیں جن کا مقصد اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہے۔

وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الْآخِرَةِ نَزِدْ لَهُ فِي حَرْثِهِ وَمَنْ كَانَ يُرِيدُ حَرْثَ الدُّنْيَا نُؤْتِهِ مِنْهَا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ نَصِيبٍ (الشوریٰ - ۲)

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں اور جو دنیا کی کھیتی چاہتا ہے اسے دنیا ہی میں سے دے دیتے ہیں مگر آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔

○

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ ایمان رجعت پسندانہ چیز ہے اور الحاد ترقی پسندی کی علامت ہے وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کفر و الحاد کی تاریخ تو بہت قدیم ہے زندگی کی تاریخ میں خیر و شر اور بناؤ بگاڑ قدم بقدم نظر آتے ہیں اب جو یہ کہتا ہے کہ ایمان ماضی کی چیز ہے اور اس کا دور ختم ہو چکا اب کفر و انکار کا دور ہے وہ یقیناً جھوٹ گھڑ رہا ہے۔

اسی طرح یہ کہنا کہ ایمان محدود فکر کی چیز ہے اور الحاد ذہانت پر مبنی ہے یا یہ کہ ایمان محض نظریاتی منطق کی علامت ہے اور الحاد سائنٹفک مطالعہ اور کائنات کی جستجو کی منطق پر مبنی ہے ایک احمقانہ بات ہے کیونکہ کائنات کے رموز واسرار پر غور و فکر کرنے والے بڑے سائنسداں عام طور پر اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں اور اسے تسلیم نہیں کرتے کہ کائنات بلا مقصد پیدا کی گئی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ الحاد کی بنیاد افواہوں اور باطل گمان پر ہے یقین و دلائل پر نہیں۔ یہ آج تک کسی لیبورٹری میں ثابت نہیں ہوا کہ اللہ تعالیٰ موجود نہیں ہاں یہ ضرور ہوا کہ مادہ پرستوں نے ان چیزوں کی نسبت غیر اللہ کی طرف کر دی جن کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ سے کرنی چاہیے۔

وَمَا يَتَّبِعُ أَكْثَرُهُمْ إِلَّا ظَنًّا إِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِي مِنَ الْحَقِّ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِمَا

حقیقت یہ ہے کہ ان میں سے اکثر لوگ محض گمان و قیاس کے پیچھے چلے جا رہے ہیں حالانکہ گمان حق کی ضرورت کو کچھ بھی پورا نہیں کرتا

وَالْبَاطِنُ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ هُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْأَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَاءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيهَا وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنْتُمْ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ (الحدید ۲-۴)

ہے وہی مخفی بھی اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا، اور پھر عرش پر جلوہ فرما ہوا اس کے علم میں ہے جو کچھ زمین میں جاتا ہے اور جو کچھ اس سے نکلتا ہے اور جو کچھ آسمانوں سے اترتا ہے اور جو کچھ اس میں چڑھتا ہے وہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہو اور جو کام بھی جو تم کرتے ہو اسے وہ دیکھ رہا ہے۔

ہم جہاں بھی ہوں اور جو کچھ بھی کر رہے ہوں اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہے تب اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا کسی غائب کو حاضر سمجھنا نہیں بلکہ خود ہمارا غفلت سے چونکنا ہے۔

بعض فلاسفہ یا بعض صوفیہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز میں ہے۔

یہ تعبیر اس مفہوم کے ساتھ صحیح ہے کہ اللہ تعالیٰ کے آثار و شواہد ہر چیز میں نظر آتے ہیں لیکن یہ مفہوم بالکل باطل ہے کہ خالق اور مخلوق ایک ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے وجود اور مخلوقات کے وجود میں بہت بڑا فرق ہے۔ وحدتِ وجود کی بات محض گمراہ کن ہے۔

○

کاش لوگ جتنی جدّ و جہد روزی کمانے یا زمین پر اقتدار حاصل کرنے کے لیے کرتے ہیں اس کی آدھی جدّ و جہد بھی اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کے لیے کرتے تو اخلاقی و روحانی ترقی کی بہت سی مسافت طے کر لیتے۔ انسان جتنا تکلیفوں اور دشمنوں کو ناپسند کرتا ہے اس سے آدھی نفرت بھی شیطان اور اس کے وساوس سے کرتا تو فرشتوں کی پاکیزگی تک پہنچنے لگتا۔

اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں نصف جدّ و جہد تو قبول کر سکتا ہے لیکن نصف نیت قبول نہیں کرتا۔ یا تو قلب کا پورا اخلاص ہو یا پوری طرح مسترد ہو جائے گا۔

تربیت کرنے والے علماء دل میں پیدا ہونے والے مختلف مقاصد کو روکنے اور دل کو پاک کرنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ اسلام اس بارے میں بہت حساس ہے کہ کسی عمل کو

اس حقیقت کو تو خلائی گاڑی میں سفر کے بغیر بھی جانا جاسکتا ہے۔

آخر زمین اور تمام سیاروں کو ان کے مدار میں کون باقی رکھے ہوئے ہے کہ اس عظیم کائنات میں باہم تصادم کے بغیر آسانی سے رواں دواں ہیں۔ کون ان کی حرکات میں ہم آہنگی پیدا کرتا ہے؟

قُلْ لِمَنِ الْاَرْضُ وَ مَنْ فِيْهَا اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ (المومنون ۸۴-۸۹)

ان سے کہو کہ بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ زمین اور اس کی ساری آبادی کس کی ہے یہ ضرور کہیں گے کہ اللہ کی کہو پھر تم ہوش میں کیوں نہیں آتے ان سے پوچھو ساتوں آسمانوں اور عرشِ عظیم کا مالک کون ہے یہ ضرور کہیں گے اللہ کہو پھر تم ڈرتے کیوں نہیں ان سے کہو بتاؤ اگر تم جانتے ہو کہ ہر چیز پر اقتدار کس کا ہے اور وہ کون ہے جو پناہ دیتا ہے اس کے مقابلے میں کوئی پناہ نہیں دے سکتا۔ یہ ضرور کہیں گے کہ یہ بات تو اللہ ہی کے لیے ہے کہو پھر کہاں تم کو دھوکہ لگتا ہے۔

ایمان فکری خوابیدگی اور اوہام و خرافات سے ذہن کے متاثر ہونے کا نام نہیں کیونکہ اس طرح کے ایمان کی کوئی قیمت نہیں۔

اس لیے ہم ٹیٹوف اور دیگر لوگوں سے کہتے ہیں کہ وہ صرف سوال پر اکتفا نہ کرلیں اور جواب پائے بغیر غافل نہ ہو جائیں۔

وحیِ الٰہی سے ہم پہلے یہ سوال و جواب سن چکے ہیں۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ قُلْ لِّلّٰهِ كَتَبَ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا

ان سے پوچھو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے کہو سب کچھ اللہ ہی کا ہے اس نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کرلیا ہے اسی لیے وہ نافرمانیوں اور سرکشیوں پر تمہیں جلدی سے نہیں پکڑ لیتا، قیامت کے روز تم سب

يَفْعَلُوْنَ (یونس ۳۶) جو کچھ یہ کر رہے ہیں اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔

روسی خلاباز ٹیٹوف جب اپنے سیارہ میں فضا سے زمین کے ارد گرد چکر لگا رہا تھا تو اس نے کائنات کے عجیب وغریب دلکش مناظر کا مشاہدہ کیا وہ اپنے تاثرات ظاہر کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "لیکن سب سے دلکش چیز زمین کا منظر تھا جو فضا میں معلق تھی یہ ایسا منظر تھا جسے انسان نہ بھول سکتا ہے نہ ذہن سے نکال سکتا ہے۔ یہ ایک گیند جیسی چیز تھی جو نقشوں میں کھینچی ہوئی تصویروں کی طرح تھی اور فضا میں اس طرح معلق تھی کہ اسے کوئی اٹھانے والا نہیں تھا اس کے ہر طرف خلا ہی خلا تھا۔ کئی منٹ تک مجھ پر حیرت طاری رہی بلکہ میں نے دہشت زدہ ہو کر اپنے دل سے پوچھا کہ کیا چیز اسے اس طرح معلق رکھے ہوئے ہے"۔

اس سوال کا جواب قرآن کریم پہلے ہی دے چکا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ يُمْسِكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اَنْ تَزُوْلَا وَلَئِنْ زَالَتَآ اِنْ اَمْسَكَهُمَا مِنْ اَحَدٍ مِّنْ بَعْدِهٖ (فاطر ۴۱)	حقیقت یہ ہے کہ اللہ ہی ہے جو آسمانوں اور زمین کو ٹل جانے سے روکے ہوئے ہے اور اگر وہ ٹل جائیں تو اللہ کے بعد کوئی دوسرا نہیں تھامنے والا۔

زمین کو بھی وہی طاقت فضا میں روکے ہوئے ہے جس نے سورج چاند اور نہ جانے کتنے سیاروں کو روک رکھا ہے۔

وہ سب قدرتِ عالیہ کے ستونوں پر قائم ہیں۔

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا وَاَلْقٰى فِي الْاَرْضِ رَوَاسِيَ اَنْ تَمِيْدَ بِكُمْ۔ (لقمان ۔ ۱۰)	اس نے آسمانوں کو پیدا کیا بغیر ستونوں کے جو تم کو نظر آئیں اس نے زمین میں پہاڑ جما دیے تاکہ وہ تمہیں لے کر ڈھلک نہ جائے۔

ٹیٹوف نے جس خلائی گاڑی میں سفر کیا وہ خود بخود نہیں بن گئی اسے ذہین ترین سائنسدانوں نے ایک محکم نظام کے مطابق تیار کیا تھا۔

تب کیا زمین فضا میں خود بخود معلق ہو گئی اور اس کی حرکت کی کوئی نگرانی نہیں کر رہا ہے نہ اس پر اربوں زندہ وجودوں کی ضروریات کا کسی کو خیال ہے؟

بندگی کی حقیقت

"آپ خدا تک اس کی توفیق کے ذریعہ ہی پہنچ سکتے ہیں کیونکہ اگر اس کی رحمت سایہ گستر نہ ہو تو کوئی عمل قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔"

شرعی دلیلیں کثرت سے وارد ہیں کہ نیک عمل جنت کا راستہ ہے اور برا عمل جہنم کا۔ اللہ تعالیٰ نے مومنین سے جنت کا اور بدکاروں سے جہنم کا وعدہ کر رکھا ہے۔ دونوں کو یکساں بدلہ نہیں دیگا۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِیْنَ عِنْدَ رَبِّھِمْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ کَالْمُجْرِمِیْنَ مَالَکُمْ کَیْفَ تَحْکُمُوْنَ۔ (القلم ۳۴-۳۶)

یقیناً خدا ترس لوگوں کے لیے ان کے رب کے یہاں نعمت بھری جنتیں ہیں۔ کیا ہم فرمانبرداروں کا حال مجرموں کا سا کر دیں؟ تم لوگوں کو کیا ہو گیا ہے تم کیسے حکم لگاتے ہو۔

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَھُمْ جَنّٰتُ النَّعِیْمِ خٰلِدِیْنَ فِیْھَا وَعْدَ اللّٰہِ حَقًّا۔ (لقمان ۸-۹)

البتہ جو لوگ ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں ان کے لیے نعمت بھری جنتیں ہیں جن میں وہ ہمیشہ رہیں گے یہ اللہ کا پختہ وعدہ ہے۔

اَلْقِیَا فِیْ جَھَنَّمَ کُلَّ کَفَّارٍ عَنِیْدٍ مَّنَّاعٍ لِّلْخَیْرِ مُعْتَدٍ مُّرِیْبِ الَّذِیْ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰھًا اٰخَرَ فَاَلْقِیٰہُ فِی الْعَذَابِ الشَّدِیْدِ مَا یُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَیَّ وَمَا اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِیْدِ۔ (ق ۲۴-۲۹)

حکم دیا گیا پھینک دو جہنم میں ہر کٹر کافر کو جو حق سے عناد رکھتا تھا خیر کو روکنے والا اور حد سے تجاوز کرنے والا تھا شک میں پڑا ہوا تھا اور اللہ کے ساتھ کسی دوسرے کو خدا بنائے بیٹھا تھا ڈال دو اسے سخت عذاب میں۔ میرے ہاں بات پلٹی نہیں جاتی اور میں اپنے بندوں پر ظلم توڑنے والا نہیں ہوں۔

اس طرح کی سیکڑوں آیتوں سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ انسان خود اپنا انجام بنانے والا ہے۔ وہ اپنے مستقبل کا راستہ خود بناتا ہے۔ وہ آخرت میں وہی فصل کاٹے گا جو اس نے اس دنیا میں بوئی ہے۔

اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ

(الانعام ۱۲)

کو ضرور جمع کرے گا یہ بالکل ایک غیر مشتبہ حقیقت ہے مگر جن لوگوں نے اپنے آپ کو تباہی کے خطرے میں مبتلا کرلیا ہے اسے نہیں مانتے ۔

اسلام تو انسان کی ذہنی طاقت کو بیدار کرتا ہے اور آسمان و زمین کی وسعتوں میں غور و فکر کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ پر یقین تک پہنچاتا ہے ۔

اسی لیے اسلام سائنسی جستجو اور کائناتی اکتشافات سے خوف زدہ نہیں ہوتا بلکہ ان پر ابھارتا ہے کیونکہ کائناتی علم ہی سے یہ ظاہر ہوگا کہ ہر حرکت و سکون کے پیچھے اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ۔

وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ سَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ فَتَعْرِفُوْنَهَا وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۔

(النمل ۹۳)

ان سے کہو کہ تعریف اللہ ہی کے لیے ہے عنقریب وہ تمہیں اپنی نشانیاں دکھا دے گا اور تم انھیں پہچان لوگے اور تیرا رب بے خبر نہیں ان اعمال سے جو تم لوگ کرتے ہو ۔

○

انسانی عقل بہت سے خداؤں کے وجود کو تسلیم نہیں کرتی ۔ کلمہ لا الٰہ الا اللہ میں پہلے ان تمام معبودوں کی نفی کی گئی ہے جنھیں انسانی اوہام اور خیال آرائیوں نے گھڑ لیا ہے کیونکہ ان کی حیثیت :

مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ۔

(یوسف ۴۰)

جن کی بندگی کر رہے ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہیں کہ بس چند نام ہیں جو تم نے اور تمہارے آباء و اجداد نے رکھ لیے ہیں اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی ۔

لیکن مصنوعی خداؤں کے انکار (لا الٰہ) کے ساتھ حقیقی خدا (الا اللہ) پر ایمان ناگزیر ہے ملحدوں اور کمیونسٹوں نے صرف انکار ہی تک اپنے آپ کو محدود کرلیا ۔ اور پھر کسی نتیجہ تک نہیں پہنچ سکے ۔

"کوئی شخص اپنے عمل کے بل پر جنت میں نہیں جائے گا۔ لوگوں نے عرض کیا:
آپ بھی نہیں یارسول اللہ؟ آپ نے فرمایا میں بھی نہیں سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ
مجھے اپنی رحمت کے سایہ میں لے لے۔" (بخاری)

لیکن عمل سے دھوکہ نہ کھانے کا مطلب یہ نہیں کہ عمل ہی کو بالکل بیکار سمجھ لیا جائے
اور عمل کی کوشش ہی نہ کی جائے کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے گا جنت دے گا چاہے اس
نے کبھی کوئی نیک عمل نہ کیا ہو۔

لیکن ایسا سمجھنا صحیح نہیں کیونکہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن مومنین سے خود فرمائے گا۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ لَكُمْ فِيْهَا فَاكِهَةٌ كَثِيْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ۔
(الزخرف ۷۲-۷۳)

تم اب ہمیشہ یہاں رہوگے۔ تم اس جنت کے وارث اپنے اعمال کی وجہ سے ہوئے جو تم دنیا میں پیش کرتے تھے تمہارے لیے یہاں بکثرت نواکہ موجود ہیں جنھیں تم کھاؤ گے۔

پھر آگے آتا ہے:

اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خَالِدُوْنَ لَا يُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِيْنَ۔
(الزخرف ۷۴-۷۶)

رہے مجرمین تو وہ ہمیشہ جہنم کے عذاب میں مبتلا رہیں گے کبھی ان کے عذاب میں کمی نہ ہوگی اور وہ اس میں مایوس پڑے ہوں گے ان پر ہم نے ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود ہی اپنے اوپر ظلم کرتے رہے۔

عبادت گزاروں کی غلطیاں

"فرائض کی ادائیگی میں تساہلی اور نوافل کی ادائیگی میں چستی خواہشات نفس کی پیروی
کی علامت ہے۔"

عبادات میں فرائض و واجبات تو محدود ہیں لیکن معاملات و عبادات میں ان کا دائرہ
وسیع ہے۔ ایک مسلمان کے لیے سب کی ادائیگی ضروری ہے۔ ان کی ادائیگی سے پہلے کسی نفل کی

لیکن ساتھ ہی عملِ صالح کی قدر و قیمت سمجھنے میں حد سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی یہ سمجھے کہ برسہا برس کی عبادت جنت میں ہمیشگی کے انعام کی پوری قیمت ہے تو یہ نادانی ہو گی۔

اسی طرح جو یہ سمجھے کہ اس کی عبادات پوری طرح ادا ہو گئی ہیں اور ہر طرح کھری نکلیں گی وہ خود فریبی کا شکار ہو گا۔

اسی طرح جو یہ سمجھے کہ دنیا میں اسے جو نعمتیں ملی ہیں ان کے مقابلہ میں اس کی عبادت کا پلڑا بھاری ہے وہ حماقت میں مبتلا ہو گا۔

حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کی نیک نیتی دیکھ کر ان کی بہت سی کوتاہیوں کو معاف کر دیتا ہے اور ان کے تھوڑے عمل کو بھی بڑھا دیتا ہے جیسے کھیت میں بہت کم بیج ڈالے جاتے ہیں لیکن فصل بہت زیادہ تیار ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کامیابی کی لذت بھی نہ ملتی۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ مَا زَكٰى مِنْكُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَبَدًا ۙ وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ (النور - ۲۱)

اگر اللہ کا فضل اور اس کا رحم و کرم تم پر نہ ہوتا تو تم میں سے کوئی شخص پاک نہ ہو سکتا مگر اللہ ہی ہے جسے چاہتا ہے پاک کر دیتا ہے۔

عمل پر ناز کرنا ایسی برائی ہے جو عمل کو بے قیمت بنا دیتی ہے اگر کوئی اپنے عمل کے بدلے اللہ تعالیٰ سے قربت و ثواب چاہے تو وہ کتنا مستحق ٹھہرے گا؟

ضروری یہ ہے کہ انسان اپنی کوتاہیوں کے شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہو اور یہ یقین رکھے کہ اللہ تعالیٰ کا اس پر جتنا حق ہے اس کا ایک ذرہ بھی ادا نہیں کر سکتا۔ اگر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے نہ نوازے تو وہ برباد ہو جائے گا۔

فرض کر لیجیے آپ نے اپنی جان اور مال اللہ تعالیٰ کے لیے قربان کر دیے۔ کیا یہ جان و مال اسی کے عطا کردہ نہیں تھے؟

اپنے سارے اعمال پر نظر ڈال لیجیے۔ ان میں کتنی کمیاں اور کوتاہیاں ملیں گی۔

مومن عمل کرتا ہے لیکن اس پر گردن نہیں اکڑاتا۔

یہی اس حدیث کی تشریح ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کوشش میں کسی کوتاہی کا شکار نہ ہو جائے۔

اسی لیے ابن عطار اللہ کسی ضروری واجب پر کسی نفل کو ترجیح دینے کو خواہش نفس کی پیروی قرار دیتے ہیں۔

میں نے بعض صالحین کو دیکھا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے قربت کے لیے کثرت سے نفلی روزے رکھتے ہیں۔ روزہ بلاشبہ جہادِ نفس اور قربت کا ذریعہ ہے لیکن اگر فرض روزوں کی ادائگی کے بعد نفلی روزوں سے مثلاً ایک مدرس کو تدریس کے کام میں، ایک ملازم کو اپنی ڈیوٹی کے ادائگی میں کوتاہی ہوتی ہے تو اس کے لیے نفلی روزہ نہ رکھنا ہی بہتر ہے، کیونکہ طلبا کو پڑھانا مدرس کے لیے اور عوام کے مصالح کی خبرگیری ملازم کے لیے واجب ہے۔

لوگوں کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ ان کے ذمے جو عام یا خاص ڈیوٹی لگائی گئی ہے اس کی خوش اسلوبی کے ساتھ ادائگی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے حصول کا بڑا ذریعہ ہے۔

مجھے افسوس ہوتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ کوئی طبیب مسجدوں میں وعظ کرنا پسند کرتا ہے۔ جبکہ تمام ممکنہ وسائل کے ساتھ مریض کی پوری طرح جانچ پڑتال اور تندہی کے ساتھ اس کا علاج ہی فرائض کے بعد اس کے لیے اولین عبادت ہے نفلی رکعات بھی اس عبادت سے اسے بے نیاز نہیں کر سکتیں۔

ملّت کو عبادات کے علاوہ دیگر میدانوں میں بھی اپنے فرائض کی ادائگی پر پوری توجہ دینے کی ضرورت ہے تاکہ کوئی پہلو نظر انداز نہ ہو جائے کہ سارا توازن ہی درہم برہم ہو جائے۔

احسان صرف خدا کا ہے

"ساری تعریف تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ستر پوشی کی ہے"۔

اللہ تعالیٰ ہی نعمت کا مالک ہے اور اول و آخر اور ظاہری و باطنی طور پر وہی تعریف کے لائق ہے۔

ہو سکتا ہے آپ ذہین اور با صلاحیت ہوں اور آپ کی ذہنی صلاحیتوں کی لوگ تعریف کرتے ہوں۔

ادائگی پر متوجہ ہونا جائز نہیں۔

فرائض و واجبات کی حیثیت ضروریات کی ہے اور نوافل کی حیثیت زیب و زینت کی۔ جب کسی شخص کے گھر والوں کو روٹی کی ضرورت ہو تو اس کے لیے عطر کی شیشیاں خریدنا مناسب نہیں۔ بھوک دور کرنا، زیب و زینت سے کہیں زیادہ ضروری ہے۔

لیکن بہت سے دیندار اس حقیقت کو نگاہوں سے اوجھل کر دیتے ہیں۔ میں نے سنا کہ ایک صاحب کئی بار حج کر چکے ہیں اور پھر حج کی تیاری کر رہے ہیں یہ غلطی ہے انھوں نے فرض حج کی ادائگی کے بعد اگر اپنے اوپر عائد دوسرے فرائض اور معاشرہ کی ضرورتوں پر غور کیا ہوتا تو یہ بات زیادہ صحیح بھی ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی سے زیادہ قریب اور خواہشِ نفس سے زیادہ دور بھی۔

ایک نفلی حج کے اخراجات سے متعدد نادار طلبہ کی تعلیم کے اخراجات پورے کیے جاسکتے ہیں۔ بہت سے ناداروں کی کفالت کی جاسکتی ہے۔ دینی کتابوں کو چھپوا کر تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

ملّت کو جہالت اور غربت سے نکالنا نفلی حج وعمرہ کرکے اپنی دلی خواہش کو پورا کرنے سے زیادہ ضروری ہے۔

اسی طرح بہت سے دیگر میدان بھی ہیں۔

فرائض و نوافل کے درمیان توازن پیدا کرنے کے لیے حضرت عبداللہ بن عمرو[رض] ابن العاص کی یہ روایت پڑھیے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ

"جس نے حج نہیں کیا ہے اس کے لیے حج کرنا دس غزوات (میں شرکت کرنے) سے بہتر ہے اور جو حج کر چکا ہے اس کے لیے ایک غزوہ (میں شریک ہونا) دس بار حج سے بہتر ہے"۔ (طبرانی)

اور غزوہ میدانِ جنگ میں بھی ہوتا ہے اور اقتصادی و ثقافتی میدانوں میں بھی۔

دور اندیش علماء نے فرائض و نوافل کے درمیان حدود قائم کرنے کی اسی لیے کوششیں کی ہیں کہ کوئی مسلمان کسی ایسے عمل کے ذریعہ، جو واجب نہیں، اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کی

جب بچے اس طرف چل پڑے تو اشعب بھی ان کے پیچھے چل پڑا کہ شاید مٹھائیاں واقعی تقسیم ہو رہی ہوں۔

خود اپنی ہی گھڑی ہوئی بات کو سچ سمجھ بیٹھا۔

یہی حالت ان لوگوں کی ہوتی ہے جو دوسروں سے جھوٹی تعریفیں سن کر ان کا یقین کر بیٹھتے ہیں جبکہ وہ صحیح بات یقیناً جانتے ہیں۔

ایک بزرگ کے بارے میں آتا ہے کہ اگر کوئی ان کی تعریف کرتا تھا تو دعا فرماتے تھے۔

"اے میرے رب میری ان چیزوں کو معاف کر دے جو یہ لوگ نہیں جانتے اور جو کچھ یہ لوگ کہہ رہے ہیں اس پر میرا مواخذہ نہ فرما اور مجھے ان کے گمان سے زیادہ بہتر بنا دے"

اپنے آقا کا حق پہچانیے

"اپنی کمتری کا احساس رکھیے تو اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی عزت سے نوازے گا۔ اپنی عاجزی و درماندگی کا احساس رکھیے تو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے نوازے گا اور اپنی کمزوری کا احساس رکھیے تو اللہ تعالیٰ اپنی طاقت سے نوازے گا۔"

صرف یہی صورت مقبول ہو سکتی ہے کہ کمتر، برتر کا ظاہری و معنوی طور پر اعتراف کرے اور یہ اعتراف اس کے دل اور ظاہر سے نمایاں ہو۔

خاص طور پر جب یہ تعلقات دائمی حیثیت رکھتے ہوں۔ ان تعلقات کی نوعیت باپ بیٹے کے تعلق جیسی نہیں کہ بیٹا بچپن میں باپ کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ جب بڑا ہو جاتا ہے تو اس سے بے نیاز ہو جاتا ہے اور بسا اوقات سب کچھ بھلا کر باپ سے قطع تعلق کر لیتا ہے۔

ایسا ہرگز نہیں۔ بندے کی ضرورت اپنے پروردگار سے دائمی طور پر رہتی ہے اور یہ اس ضرورت سے کہیں زیادہ شدید ہوتی ہے جو ایک شیر خوار بچے کی اپنی ماں سے ہوتی ہے یا کسی پودے کو پانی اور دھوپ سے ہوتی ہے۔

قُلْ مَن يَكْلَؤُكُم بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ   اے نبی ان سے کہو "کون ہے جو رات کو یا

لیکن یہ ذہانت وصلاحیت کس کی مرہونِ منت ہے۔؟
آخر عبقری لوگوں کو کس نے پیدا کیا۔

هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ (آل عمران۔ ٦)	وہی ہے جو تمہاری ماؤں کے پیٹ میں تمہاری صورتیں جیسی چاہتا ہے بناتا ہے اس زبردست حکومت والے کی سوا کوئی اور خدا نہیں۔

پھر اللہ تعالیٰ ہی تمہارے عیبوں اور کوتاہیوں کو لوگوں سے چھپائے رکھتا ہے۔
تب آخر اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس نے آپ کو اتنی نعمتوں سے نوازا اور پھر آپ کی پردہ پوشی کر کے لوگوں میں باعزت ہونے اور رہنے دیا، اس کے علاوہ کوئی تعریف کے لائق ہو سکتا ہے؟ ظاہر ہے' ہرگز نہیں۔

اپنی حقیقت فراموش نہ کیجئے

"لوگ آپ کے بارے میں جو حسنِ ظن رکھتے ہیں اس کی بنیاد پر آپ کی تعریف کرتے ہیں لیکن آپ اپنے نفس کے بارے میں جو کچھ جانتے ہیں اس کی بنیاد پر اس کی مذمت کرتے رہیے۔"

اللہ تعالیٰ نے میری پردہ پوشی کر رکھی ہے جس کی بدولت لوگ میری تعریف کرتے ہیں تو کیا میں اپنے بارے میں خود بھی دھوکے میں مبتلا رہ سکتا ہوں؟ کوئی ذی ہوش آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔ مجھے خود اپنے نفس کے بارے میں صحیح موقف اختیار کرتے ہوئے اس کی خامیوں کو تلاش کرتے رہنا اور انھیں درست کرنے کی کوشش کرتے رہنا چاہیے۔

اگر لوگ مجھے کامل قرار دیں تو مجھے ان کی بات سے خود اپنی حقیقت کے بارے میں دھوکے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔ لوگوں کے گمان پر اپنے یقین کو چھوڑنا انتہائی جہالت کی بات ہوگی۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ایسا ہوتا رہتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اشعب بخیل کا ایک دن بچوں نے پیچھا کیا تو اس نے بچوں سے پیچھا چھڑانے کے لیے انھیں بہکایا کہ فلاں جگہ شادی ہو رہی ہے اور مٹھائیاں تقسیم کی جا رہی ہیں۔

اور دوسروں کو بھی یہ بتاتا ہے کہ وہ خود بخود اپنی موجودہ سربلندی کی حیثیت تک پہنچا ہے اور اس سلسلے میں ہر نصیحت کو مسترد کر دیتا ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَاهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْ بَعْدِ ضَرَّاءَ مَسَّتْهُ لَيَقُولَنَّ هٰذَا لِي وَمَا اَظُنُّ السَّاعَةَ قَائِمَةً وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْ اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى۔ (فصلت ۵۰)

مگر جونہی کہ سخت وقت گزر جانے کے بعد ہم اسے اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں یہ کہتا ہے "میں اسی کا مستحق ہوں"، اور میں نہیں سمجھتا کہ قیامت کب آئے گی لیکن اگر واقعی میں اپنے رب کی طرف پلٹایا گیا تو وہاں بھی مزے کروں گا۔

آخر جب کوئی منکر بن کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوگا تو اسے کیسے اچھائی مل سکے گی؟ اللہ تعالیٰ ایسے بندوں کو ناپسند کرتا ہے جو اپنے بارے میں اندھے بن جاتے ہیں۔
اس نے تو لوگوں کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ اس کو پہچانیں اور اس کی حمد و ثنا کریں۔ اس لیے نہیں کہ جہالت و انکار سے کام لیں۔
جو قومیں راہ سے بھٹک جاتی ہیں تو انھیں تادیب کی جاتی ہے کہ وہ ہدایت کی طرف لوٹ آئیں اور اپنی بندگی کا احساس کریں۔

فَلَوْلَا اِذْ جَاءَهُمْ بَاْسُنَا تَضَرَّعُوْا (الانعام ۴۳)

پس جب ہماری طرف سے ان پر سختی آئی تو کیوں نہ انھوں نے عاجزی اختیار کی۔

لیکن جب اس پر بھی آنکھیں نہیں کھلتیں اور گمراہی کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔ تب مکمل سزا کا وقت آجاتا ہے۔

وَلَوْ رَحِمْنٰهُمْ وَكَشَفْنَا مَا بِهِمْ مِّنْ ضُرٍّ لَّلَجُّوْا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ وَلَقَدْ اَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ فَمَا اسْتَكَانُوْا لِرَبِّهِمْ وَمَا يَتَضَرَّعُوْنَ

اگر ہم ان پر رحم کریں اور وہ تکلیف جس میں آجکل یہ مبتلا ہیں دور کر دیں، تو یہ اپنی سرکشی میں بالکل ہی بہک جائیں گے۔ ان کا حال تو یہ ہے کہ ہم نے انھیں تکلیف میں مبتلا کیا۔ پھر بھی یہ اپنے رب کے آگے نہ جھکے

مِنَ الرَّحْمٰنِ بَلْ هُمْ عَنْ ذِكْرِ رَبِّهِمْ مُّعْرِضُوْنَ۔ (الانبیاء ۴۲)

دن کو تمہیں رحمان سے بچا سکتا ہو۔ مگر یہ اپنے رب کی نصیحتوں سے منہ موڑ رہے ہیں۔

بندہ کبھی یہ گمان کر سکتا ہے کہ وہ کوئی غلطی کر کے اس کے نتائج سے بھاگ سکتا ہے اور کسی کے پاس پناہ لے سکتا ہے۔ لیکن کائنات میں کون ہے جس کے پاس وہ پناہ لے سکے اور بچ سکے؟

اَمْ لَهُمْ اٰلِهَةٌ تَمْنَعُهُمْ مِّنْ دُوْنِنَا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ نَصْرَ اَنْفُسِهِمْ وَلَا هُمْ مِّنَّا يُصْحَبُوْنَ۔ (الانبیاء ۴۳)

کیا یہ کچھ ایسے خدا رکھتے ہیں جو ہمارے مقابلے میں ان کی حمایت کریں؟ وہ تو نہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں اور نہ ہماری ہی تائید ان کو حاصل ہے۔

انسان کی اللہ تعالیٰ سے احتیاج اور ضرورت مندی شدید ترین ہے وہ جس دل، آنکھ کان اور دیگر اعضائے جسم سے فائدہ اٹھا رہا ہے اگر اللہ تعالیٰ چاہے تو ایک پل میں سب کچھ چھین سکتا ہے۔

قُلْ اَرَاَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ۔ (الانعام - ۴۶)

اے نبی ان سے کہو کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ اگر اللہ تمہاری بینائی اور سماعت تم سے چھین لے اور تمہارے دلوں پر مہر کر دے۔ تو اللہ کے سوا اور کونسا خدا ہے جو یہ قوتیں تمہیں واپس دلا سکتا ہے دیکھو کس طرح ہم بار بار اپنی نشانیاں پیش کرتے ہیں اور پھر یہ کس طرح ان سے نظر چراتے ہیں۔

اور حقیقی عبادت یہی ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس کی بے پایاں عظمت اور اپنی مکمل بے چارگی کے ساتھ کھڑے ہوں۔

لیکن انسانی نفس کبھی کبھی فریب خوردگی کا سہارا لیتا ہے اور انسان تواضع و انکسار کے بجائے تکبر و غرور میں پڑ کر یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ آسمانی عنایت سے بے نیاز ہے۔

لَا يُخْلِفُ الْمِيعَادَ ۔
(الرعد - ۳۱)

رہے گا۔ یہاں تک کہ اللہ کا وعدہ آن پورا ہو یقیناً اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔

فضولیات

"اگر اللہ تعالیٰ نے تمہیں ضرورت کے بقدر روزی دے دی، لیکن اتنی زیادہ نہیں دی کہ تم سرکشی میں مبتلا ہو جاؤ، تاکہ تم کم سے کم مگن یا غمزدہ رہو، تو تم پر نعمت پوری ہوگئی"۔

اگر مومن اللہ تعالیٰ کی راہ میں جدوجہد کرنا چاہتا ہے تو دنیا کے ساز و سامان اور نفس کی لذتوں سے اپنا تعلق محدود کر لینا چاہیے، کیونکہ زندگی کی لذتوں میں غرق ہونے سے یہ آگ اور بھڑکتی ہے اور دل انھیں چیزوں میں مشغول رہ جاتا ہے دیگر ضروری کاموں کی طرف متوجہ ہی نہیں ہو پاتا۔

زندگی کے کم سے کم معیار پر نفس کو راضی کر لینا اور اس سے زیادہ کی فکر میں نہ رہنا آدمی کی عزت، سربلندی اور خدا کی خوشنودی کی ضمانت ہے۔

جامع ازہر کے ایک شیخ سے ایک دن کہا گیا کہ آپ ایسا کیجیے ورنہ انجام بُرا ہوگا انھوں نے دریافت کیا: کیا مجھے میرے گھر سے مسجد تک آنے جانے سے بھی روک دیا جائے گا؟

کہا گیا: نہیں۔

تب انھوں نے کہا: پھر جو چاہو کرو۔

ایک اور بزرگ شیخ علیش کو جب مصر میں عرابی پاشا کے انقلاب کے بعد گرفتار کیا گیا تو ان سے کہا گیا کہ خدیو سے تھوڑی سی چاپلوسی کر لیجیے وہ معافی کا حکم جاری کر دے گا۔ تب انھوں نے اپنا وہ قصیدہ کہا جس میں کہا گیا ہے کہ اپنے رب کی چوکھٹ پکڑ لو اس کے علاوہ سب کچھ چھوڑ دو جو کچھ مقدر میں ہے وہ ہو کر رہے گا زیادہ فکرمند ہونے کی کیا ضرورت ہے؟

حَتّٰى اِذَا فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا ذَا عَذَابٍ شَدِيْدٍ اِذَا هُمْ فِيْهِ مُبْلِسُوْنَ ۔ (المومنون ۷۵-۷۷)

اور نہ عاجزی اختیار کرتے ہیں۔ البتہ جب نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی کہ ہم ان پر سخت عذاب کا دروازہ کھول دیں تو یکایک تم دیکھو گے کہ اس حالت میں ہر چیز سے مایوس ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی رحمت تو انھیں لوگوں کے قریب ہوتی ہے جو اپنی انسانی حیثیت کو مانتے ہیں اور کھلے چھپے اللہ تعالیٰ کی بڑائی کرتے ہیں۔

اپنی طاقت وقوت کے بارے میں خوش گمان اور تکبر میں مبتلا ہونے کے بجائے انسان اگر اپنی کمزوری و بے بسی کا احساس کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے توفیق اور کامیابی سے نوازتا ہے۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۔ (الحدید ۲۸)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول (محمد صلے اللہ علیہ وسلم) پر ایمان لاؤ۔ اللہ تمہیں اپنی رحمت کا دہرا حصہ عطا فرمائے گا۔ اور تمہیں وہ نور بخشے گا جس کی روشنی میں تم چلو گے اور تمہارے قصور معاف کر دے گا۔

آج لوگ آسمان سے بے نیاز ہو کر زمین ہی میں مست ہیں عالم غیب کو نظر انداز کر کے جو کچھ ناک کے سامنے نظر آتا ہے، اسی پر یقین رکھتے ہیں اور اپنے پروردگار کو چھوڑ کر ـــــ جس نے انھیں برتر مقصد کے لیے پیدا کیا تھا ـــــ خود اپنی ذات میں مگن ہیں۔ ظاہر ہے ایسے لوگ رحمتِ الٰہیہ سے محروم ہی رہیں گے۔ اور رسوائی و نامرادی ان کا مقدر ہوگی۔

وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تُصِيْبُهُمْ بِمَا صَنَعُوْا قَارِعَةٌ اَوْ تَحُلُّ قَرِيْبًا مِّنْ دَارِهِمْ حَتّٰى يَاْتِيَ وَعْدُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ

جن لوگوں نے خدا کے ساتھ کفر کا رویہ اختیار کر رکھا ہے ان پر ان کے کرتوتوں کی وجہ سے کوئی نہ کوئی آفت آتی ہی رہتی ہے یا ان کے گھر کے قریب کہیں نازل ہوتی ہے یہ سلسلہ چلتا

یہ معاشی معیار نہیں نفسیاتی حالات ہیں جو یہ فرق پیدا کرتے ہیں۔

معاشی معیار تو مددگار بن سکتا ہے۔

اس مٹی سے گلاب کا پھول بھی نکلتا ہے اور کانٹے بھی۔

آج ہم معیارِ زندگی کی بلندی کے پُرشور نعرے سنتے ہیں۔ ہم بھی غربت و مسکنت کے خلاف جدّوجہد کے حامی ہیں لیکن مادہ پرستوں کو یہ جان لینا چاہیے کہ آج انسانی زندگی کو روزی سے کہیں زیادہ روحانی قدروں کو سمجھنے اور اس سے بھی زیادہ اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کی ضرورت ہے۔

محاسبۂ نفس

"جب لوگوں کی بے توجہی یا مذمت سے تمہیں تکلیف پہنچے تو اپنے بارے میں اللہ تعالیٰ کے علم کی طرف نگاہ اٹھاؤ۔ اگر اس کا علم تمہیں مطمئن نہیں کرتا تو اس کے علم پر عدم اطمینان کی مصیبت لوگوں کی اذیت کی مصیبت سے کہیں زیادہ سنگین ہے۔"

اللہ تعالیٰ سے تعلق ہی مومن کی سلامتی یا پریشانی اور خوشی یا غم کی بنیاد ہے۔ لوگوں کے ساتھ اس کا تعلق دوسرے درجہ میں ہے اور اس میں بھی اللہ تعالیٰ سے تعلق کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

کسی معاملہ میں لوگوں کی رائے اس کے صحیح یا غلط ہونے کے لیے فیصلہ کن نہیں کسی شخص کے بارے میں لوگوں کی رائے اس کی بلندی یا پستی کا آخری فیصلہ نہیں کر سکتی لوگوں کی رائیں بسا اوقات غلط بھی ہوتی ہیں۔

بحرانوں اور مشکل حالات میں کم ہی لوگ ثابت قدمی اور بہادری سے کام لیتے ہیں اس لیے مصلحین تنہائی اور عدم حمایت و انکار کا سامنا کرتے ہیں تو اس کی پرواہ بھی نہیں کرتے۔

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ

اور اے نبی اگر تم ان لوگوں کی اکثریت کے کہنے پر چلو جو زمین میں بستے ہیں تو وہ تمہیں

یہ طرزِ عمل جب ہوتا ہے جب آدمی اپنی ضروریات مختصر کر لیتا ہے ورنہ نفس کی خواہشات کی رسّی جتنی ڈھیلی کیجیے دراز ہوتی چلی جائے گی۔

ہمارا مقصد کسی حلال کو حرام کرنا یا کسی کشادگی کو تنگ کرنا نہیں صرف وہ راستہ بتا دینا مقصود ہے جو اہلِ دعوت کے لیے ضروری ہے۔ دنیا کا لالچ اور اعلیٰ نمونہ قائم کرنا دونوں ایک ساتھ ممکن نہیں۔ اسی طرح لوگوں کو خوش کرنے اور زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کی کوشش کا حق کی بات بلند کرنے کے ساتھ کوئی جوڑ نہیں۔

○

کفایت کے سلسلے میں کوئی واضح حد بندی نہیں کی جا سکتی انسانوں کی طبیعت، حالات اور ماحول کے ساتھ ضروریات بھی مختلف ہو سکتی ہیں۔ کسی فرد یا خاندان کے لیے اخراجات کا کوئی معیار مقرر کرنا اور یہ کہنا کہ اس کے بعد اسراف اور فضول خرچی ہے بیکار بات ہوگی۔

بعض چیزیں کسی کے لیے ضرورت کا درجہ رکھتی ہیں کسی دوسرے کے لیے اسراف کا۔

ان حالات میں خود اپنے دل کا فیصلہ ہی مناسب ہوگا۔ خود فقر و غنا بھی خارجی سے زیادہ داخلی و نفسیاتی حیثیت رکھتے ہیں۔ کتنے مالدار مزید دولت کے لیے ہائے ہائے کرتے رہتے ہیں اور اسی فکر میں انھیں نیند نہیں آتی اور کتنے غریب جو کچھ مہیا ہے اسی پر قانع اور خوش ہو کر آرام سے میٹھی نیند کے مزے لیتے ہیں۔

لوگوں کو دیکھیے تو عجیب عجیب تجربے سامنے آتے ہیں۔

ایک شخص کے پاس دولت بھی ہے اور جوان اولاد بھی۔ بڑھاپا آچکا ہے اب اسے چاہیے تھا کہ آخرت کے لیے زیادہ سے زیادہ تیاری کرے۔

اگر وہ راہِ خدا میں جان دے دے تو اس کے پیچھے کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے جس کے لیے فکر مند ہو۔ لیکن اس کے باوجود وہ کلمۂ حق کہنے سے ڈرتا ہے اور زیادہ سے زیادہ دنیا طلبی میں لگا ہوا ہے۔

جبکہ ایسے نوجوان بھی مل جائیں گے جو اپنے سارے ذاتی مسائل کو پسِ پشت ڈال کر شہادت کے لیے کود پڑتے ہیں۔

اَلَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ کَانُوۡا یَتَّقُوۡنَ لَهُمُ الۡبُشۡرٰی فِی الۡحَیٰوةِ الدُّنۡیَا وَ فِی الۡاٰخِرَةِ لَا تَبۡدِیۡلَ لِکَلِمٰتِ اللّٰهِ ذٰلِکَ هُوَ الۡفَوۡزُ الۡعَظِیۡمُ۔

(یونس ۶۳-۶۴)

جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے دنیا اور آخرت دونوں زندگیوں میں ان کے لیے بشارت ہی بشارت ہے اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں یہی بڑی کامیابی ہے۔

زمین پر با اختیار ہونا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے اور نیک نامی اس کا ایک جزو ہے خود اللہ تعالیٰ اپنے نبی سے فرماتا ہے:

وَرَفَعۡنَا لَکَ ذِکۡرَکَ۔

(الانشراح -۴)

اور تمہاری خاطر تمہارے ذکر کا آوازہ بلند کر دیا۔

حضرت ابراہیمؑ نے بھی مرورِ زمانہ کے باوجود دوامی نیک نامی کی دعا مانگی تھی۔

رَبِّ هَبۡ لِیۡ حُکۡمًا وَّ اَلۡحِقۡنِیۡ بِالصّٰلِحِیۡنَ وَاجۡعَلۡ لِّیۡ لِسَانَ صِدۡقٍ فِی الۡاٰخِرِیۡنَ۔

(الشعراء ۸۳-۸۴)

اے میرے رب مجھے حکم عطا کر اور مجھ کو صالحوں کے ساتھ ملا اور بعد کے آنے والوں میں مجھ کو سچی ناموری عطا کر۔

لیکن یہ بات بنیادی اہمیت رکھتی ہے کہ انسان کا عمل اللہ تعالیٰ کے لیے پورے اخلاص کے ساتھ ہو اور اس کا مقصد دنیاوی فائدہ یا مخلوق کی خوشنودی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی ہر محرک پر غالب ہو اور اس سلسلے میں اسے کوئی ڈر اور خوف نہ ہو۔

لوگوں کے ساتھ تعلق کی بنیاد حق کے لیے تعاون کی بنیاد پر ہو۔ دنیاوی اغراض اور جسمانی لذتوں کی بنیاد پر نہیں۔

پھر اگر انسان یہ محسوس کرتا ہے کہ دوسرے لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں تو اسے یہ دیکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سے اس کا تعلق کیسا ہے۔ اگر وہ اس پہلو سے مطمئن ہے تو پھر اسے کوئی فکر نہیں کرنی چاہیے کیونکہ آقا کی خوشنودی کے مقابلہ میں غلاموں کی ناراضگی کی کیا حیثیت ہو سکتی ہے؟ جیسا کہ حضرت ہودؑ کے جواب سے واضح ہوتا ہے:

اِنِّیۡۤ اُشۡهِدُ اللّٰهَ وَاشۡهَدُوۡۤا اَنِّیۡ

میں اللہ کی شہادت پیش کرتا ہوں اور تم

يَتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ مَنْ يَّضِلُّ عَنْ سَبِيْلِهٖ وَهُوَ اَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِيْنَ۔ (الانعام ۱۱۶-۱۱۷)	اللہ کے راستہ سے بھٹکا دیں گے وہ تو محض گمان پر چلتے اور قیاس آرائیاں کرتے ہیں درحقیقت تمہارا رب زیادہ بہتر جانتا ہے کہ کون اس کے راستے سے ہٹا ہوا ہے اور کون سیدھی راہ پر ہے۔

مومن اپنے ضمیر کو ہی رہنما بناتا ہے اور اس کا مقصد اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ اسے اس کی پرواہ نہیں ہوتی کہ لوگ اس کی حمایت کر رہے ہیں یا اسے برا بھلا کہہ رہے ہیں۔

تاہم انسان اپنے معاشرہ سے جڑا ہوا ہوتا ہے اور مدح وذم کی لہریں خواہی نہ خواہی اس کے دل پر اثر انداز ہوتی ہیں۔ ایک صاحب دولت شخص کو بلا وجہ اپنے آپ کو ذلت میں نہیں پھنسانا چاہیے اور اپنی دولت کے استعمال سے اچھا نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ تاکہ نیک لوگ اس کے پاس اکٹھا ہو سکیں۔ لوگوں سے فراخدلانہ، نیک سلوک اور اسلامی فرائض وشعائر کی پابندی کے ساتھ رہنا فطری چیز ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَتُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ۔ (البقرہ ۲۷۱)	اگر اپنے صدقات علانیہ دو تو یہ اچھا ہے لیکن اگر چھپا کر حاجت مندوں کو دو تو یہ تمہارے حق میں زیادہ بہتر ہے۔

اپنی ساکھ اور شہرت کی حفاظت کی خواہش بھی فطری چیز ہے خود رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم جب ایک بار اپنی ایک زوجہ محترمہ کے ساتھ کہیں جا رہے تھے تو راستہ میں کچھ لوگ ملے تو آپؐ نے ان پر یہ واضح کر دیا کہ آپ کے ہمراہ زوجہ محترمہ ہیں تاکہ کسی کو کوئی بدگمانی نہ ہو جبکہ آپؐ بدگمانی کی سطح سے کہیں بلند تھے۔

اسی طرح نیک نیتی کے ساتھ کوئی بھلائی کرنے کے بعد لوگوں کے درمیان اپنے بارے میں کلمۂ خیر سن کر خوش ہونا بھی فطری ہے اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اسے مومن کے لیے اس دنیا میں بشارت قرار دیا۔ اور یہ آیت تلاوت فرمائی:

نقوشِ راہ

ہر مسلمان کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اتنی اہلیت پیدا کرے جو اسے اللہ تعالیٰ سے نسبت قائم کرنے اور اس کی رحمت میں ہمیشہ رہنے کے لائق بنا دے۔

اس کے پہلو میں جو دل دھڑکتا ہے وہی تزکیہ و ترقی کا مرکز ہے اور اس کے لیے ریاضت وہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی اطاعتوں اور ہدایتوں نیز حدود و آداب کی پابندی کے ذریعہ کرسکتا ہے یہاں تک کہ وہ منزلِ مقصود تک پہنچ جائے۔

کمال کے راستہ کی کوئی انتہا نہیں ہے جہاں پہنچ کر رُک جانا پڑے۔ مسلمان جب تک زندہ ہے امر و نہی کا مکلّف ہے اور خود اپنے بارے میں اسے غور و فکر کرتے رہنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے اس کے اندر کسی برائی کے اثرات باقی رہ گئے ہوں جن کو ختم کرنا ضروری ہو یا کوئی برائی از سرِ نو پیدا ہوگئی ہو جسے مٹانا ضروری ہو۔

اگر وہ اپنے آپ کو مامون سمجھنے لگا ہے کہ اب اس کے دل میں بڑے یا چھوٹے گناہوں کا خیال بھی پیدا نہیں ہوگا اور نہ وسوسے پیدا ہونگے تب بھی جب تک جسم و جان کا رشتہ برقرار ہے عبادت کے تعلق سے اللہ تعالیٰ کے حقوق اس پر برقرار رہیں گے یہاں تک کہ وہ شکر گزاری اور رضا و تسلیم کے ساتھ اپنے پروردگار سے جا ملے۔

قُلْ اِنَّ صَلوٰتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ

کہو میری نماز میرے تمام مراسمِ عبودیت میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین

بَرِيْءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ
فَكِيْدُوْنِيْ جَمِيْعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُوْنِ
اِنِّيْ تَوَكَّلْتُ عَلَى اللّٰهِ رَبِّيْ وَرَبِّكُمْ
مَا مِنْ دَآبَّةٍ اِلَّا هُوَ اٰخِذٌ
بِنَاصِيَتِهَا۔

(هود ۵۴ - ۵۶)

گواہ رہو کہ یہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو تم نے
خدائی میں شریک ٹھہرا رکھا ہے اس سے میں
بیزار ہوں تم سب کے سب مل کر میرے
خلاف اپنی کرنی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھو اور مجھے
ذرا مہلت نہ دو میرا بھروسہ اللہ پر ہے جو میرا
اور تمہارا رب ہے۔ کوئی جاندار ایسا نہیں جس
کی چوٹی اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔

اور اگر اللہ تعالیٰ سے تعلق ہی کمزور ہے تو اصل مصیبت یہ نہیں کہ لوگ اس سے متنفر ہیں بلکہ رونے کی چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق ہی اطمینان بخش نہیں جو مرض کی جڑ ہے۔

کا لفظ زبانوں پر اتنا رائج ہو گیا ہے کہ لگتا ہے کہ اس کی اصل اہمیت ہی ماند پڑ گئی ہے۔ ایک شاندار محل کی تعمیر ایک ویران دل کی تعمیر سے کہیں زیادہ آسان ہے۔ اسی طرح ایک قیمتی کتاب کو مرتب کرنا اس سے کہیں زیادہ آسان ہے کہ خواہشات سے مغلوب ایک دل کو از سر نو مرتب کیا جائے۔

توبہ اسی تعمیر و تربیت کا نام ہے لوگ اس لفظ کی اہمیت و وقعت کو سمجھے بوجھے بغیر اسے بولنے لگے ہیں۔

توبہ کی ضرورت سبھی انسانوں کو ہوتی ہے کیونکہ زندگی میں ان سے خطائیں ہوتی رہتی ہیں جبکہ بیشتر لوگوں پر خواہشات، کم عقلی، ناتجربہ کاری اور بے یقینی کا غلبہ ہو جایا کرتا ہے۔

اسلام کی نظر میں توبہ ایسی جدّوجہد کا نام ہے جو ہر انسان کو کرنی چاہیے کوئی دوسرا شخص اس کے لیے یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔

اگر آپ کے کپڑے گندے ہو جائیں تو اس طرح صاف نہیں ہو سکتے کہ آپ کے پڑوسی اپنے کپڑے دھولیں۔

اگر آپ کسی فکری گمراہی میں مبتلا ہوتے ہیں تو آپ خود ہی صحیح راستہ اختیار کر کے اس سے نجات پا سکتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی راہ بھی یہی ہے اس سلسلے میں کسی کی سفارش کام نہیں آسکتی۔

مَنِ اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ٥	جو کوئی راہ راست اختیار کرے گا اس کی راست روی اس کے اپنے ہی لیے مفید ہے اور جو گمراہ ہو اس کی گمراہی کا وبال اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائیگا۔

(بنی اسرائیل ۱۵)

اللہ تعالیٰ کے حق کے تعلق سے کسی غلطی کی تلافی اسی طرح ہو سکتی ہے کہ خود خطا کار معذرت پیش کرے۔ اگر دنیا کے سارے لوگ ـــــ انبیائے کرامؑ سمیت ـــــ اس کی طرف سے معذرت کریں اور وہ خود اپنی کج روی پر برقرار رہے تو کسی معذرت یا معافی کی طلب قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔

یہ لازمی ہے کہ گناہ گار خود پروردگار کے سامنے اپنے دل کی گہرائیوں سے پکارے۔

لَاشَرِيْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۔ (الانعام ۱۶۲-۱۶۳)

کے لیے ہے جس کا کوئی شریک نہیں اس کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور سب سے پہلے سر اطاعت جھکانے والا میں ہوں۔

اللہ تعالیٰ کی طرف پہنچانے والا راستہ مسلمان کی ان کوششوں کی لطیف تعبیر ہے جو وہ اپنے دل کی صفائی، اپنے پروردگار کو راضی کرنے اور غفلت و سستی کے بجائے ذکر و حرکت اختیار کرنے کے سلسلے میں کرتا ہے اور اس راستہ پر چل کر وہ جب کسی بری عادت سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے اور بہترین کردار و اخلاق سے آراستہ ہوتا ہے تو یہی اس کی کامیابی کا نشان ہوتا ہے۔

اس نفسیاتی و قلبی تبدیلی سے مسلمان میں بیداری، رائے میں پختگی اور اچھے اعمال و کردار پیدا ہوتے ہیں اور پھر توفیقِ الٰہی کی قوی امید بیدار ہو جاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے صحیح راہ پر چلائے گا اور کم میں بھی برکت عطا کرے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف توجّہ کرنے والوں سے زیادہ توجّہ کا وعدہ فرمایا ہے۔

وَمَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ خَيْرٌ مِّنْهَا (النمل ۸۹)

جو شخص بھلائی لے کر آئے گا اس کو اس سے بہتر صلہ ملے گا۔

کسی راہ کے راہی کو اگر خود اس کی جدّوجہد پر چھوڑ دیا جائے تو وہ تھکن کی وجہ سے سست گام بھی ہو سکتا ہے اور رک بھی سکتا ہے اس لیے خود اس کی جدّوجہد سے زیادہ الٰہی مدد درکار ہوتی ہے۔

کسان، بیج بوتا ہے پھر زمین کی سینچائی اور دیکھ بھال کرتا ہے پھر آسمانی برکتوں کی طرف دیکھتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر خدا کی مدد شامل نہ ہوئی تو اس کی محدود کوشش بیکار ہو سکتی ہے۔ پھر خدا کی مدد بھی کم، زیادہ ہو سکتی ہے۔

توبہ

توبہ اس راہ کا پہلا مرحلہ ہے بلکہ اسی کے ساتھ اس راہ میں داخل ہونا ممکن ہے۔ توبہ

پھر کیا انسان کی زندگی میں اس کی کوئی ضرورت نہیں؟

کیا آپ کا نفس اس کا حقدار نہیں کہ آپ اس کے معاملات پر وقتاً فوقتاً نظرِ ثانی کرتے رہیں اور ضروری اصلاح کرتے رہیں تاکہ وہ اپنی فطری حالت پر لوٹ سکے؟

انسان کو اس کی ضرورت سب سے زیادہ ہے کیونکہ اس کا وجود صرف جسمانی نہیں جذباتی و عقلی بھی ہے اور اس کے آلودہ ہونے کے امکانات سب سے زیادہ ہیں۔ خاص طور پر جب:

مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا۔ (الکہف ۲۸)

جس کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا ہے اور جس نے اپنی خواہشِ نفس کی پیروی کی اور جس کا طریق کار افراط و تفریط پر مبنی ہو۔

انسانی نفس کے معاملات میں ہم آہنگی پیدا کرنے والا کوئی نظام نہ ہو تو یہ معاملات درختوں سے گرنے والے پتوں کی طرح آوارہ ہو جاتے ہیں۔

اسی لیے نفس کی ہمہ وقت نگرانی کی کوشش ہونی چاہیے۔

ہر صبح بیدار ہونے کے بعد اور ہر رات سونے سے پہلے اس سلسلے میں غور و فکر سے کام لیتے رہنا چاہیے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"جب رات کا نصف حصہ یا دو تہائی حصہ گزر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ نچلے آسمان پر نازل ہوتا ہے اور فرماتا ہے کوئی مانگنے والا ہے جسے دیا جائے؟ کوئی دعا کرنے والا ہے جس کی دعا قبول کی جائے؟ کوئی مغفرت چاہنے والا ہے جس کی مغفرت کی جائے؟ یہ سلسلہ فجر طلوع ہونے تک جاری رہتا ہے۔" (مسلم)

ایک دوسری روایت میں ہے:

"بندہ اپنے رب سے سب سے زیادہ قریب رات کی گہرائیوں میں ہوتا ہے۔ اب اگر ان لوگوں میں سے بن سکتے ہو جو اس گھڑی میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں تو ایسے ہو جاؤ۔" (ترمذی)

ایسے وقت بستر کی گرمی اور بدن کی راحت چھوڑ کر اپنا مستقبل بنانے کے لیے ذکرِ الٰہی میں مشغول ہونا کتنی خوش نصیبی کی بات ہے۔

"اے میرے پروردگار! مجھے معاف کردے، مجھ پر رحم فرما، تو ہی بہترین رحم کرنے والا ہے"۔
اس کے بعد ہی وہ مغفرت کی امید کر سکتا ہے۔

جس انسان کا عمل خراب ہو اور اس کی حالت پریشان کن ہو اسے اپنے پروردگار کی طرف جلد از جلد رجوع کرنا چاہیے اور یہ پختہ عزم کرنا چاہیے کہ آئندہ وہ اپنی غلط کاریوں سے چھٹکارا حاصل کر کے اپنے اعمال کو سدھارے گا۔

اسی سلسلے میں کل کا انتظار نہیں کرنا چاہیے آج ہی یہ کام کر ڈالیے بلکہ اگر صبح کا وقت ہو تو شام تک بھی انتظار نہ کیجیے، ہو سکتا ہے وقت اتنی مہلت ہی نہ دے۔

پھر کل کی امید پر اپنی زندگی کی تعمیر نو لٹکائے نہ رہیے۔ آج کا وقت آپ کو حاصل ہے اس کو کام میں لائیے اور انتظار و التوا کو پس پشت ڈال دیجیے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:
"اللہ تعالیٰ رات میں اپنا ہاتھ کشادہ کر دیتا ہے کہ دن کا خطا کار توبہ کرلے اور دن میں اپنا ہاتھ کشادہ کرتا ہے کہ رات کا خطا کار توبہ کرلے۔ (مسلم)

اپنی زندگی کی از سر نو تشکیل کے سلسلہ میں تاخیر کبھی زیادہ مہلک بن جاتی ہے۔ موت تو اچانک ہی حملہ آور ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ کی درگزر سے کسی دھوکے میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے۔

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ
وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ
(الزلزال ۷-۸)

پھر جس نے ذرّہ برابر نیکی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا اور جس نے ذرہ برابر بدی کی ہوگی وہ اس کو دیکھ لے گا۔

یہ کتنی خوبصورت بات ہے کہ انسان وقتاً فوقتاً اپنے حالات پر ناقدانہ نظر ڈالتا رہے اور اپنی دائمی کامرانی کے لیے منصوبہ بندی کرتا رہے۔

ہر چند دنوں کے بعد میں اپنے دفتر پر اس مقصد سے نگاہ ڈالتا ہوں کہ ہر چیز کو پھر سے مرتب کر دوں، جو غیر ضروری چیزیں جمع ہو گئی ہیں انھیں وہاں سے ہٹا دوں یا ضائع کر دوں، جو کاغذات بکھر گئے ہیں انھیں پھر سے ان کی جگہ رکھ دوں۔

اسی طرح مکان میں بھی صفائی و ترتیب کی ضرورت ہمیشہ رہتی ہے۔

دنیا کو ظلم و جور سے بھر دیں تو اس میں کس کی خطا ہے؟

پھر بھی انسان جب توبہ کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ خوش ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں :

"اپنے مومن بندے کی توبہ سے اللہ تعالیٰ اس شخص سے بھی زیادہ خوش ہوتا ہے جو کسی بے آب و گیاہ اور مہلک جگہ پہنچ جائے اس کے ساتھ سواری کا جانور ہو جس پر کھانے پینے کی چیزیں بھی ہوں، وہ شخص کہیں دم لینے کے لیے رکے اور اسے نیند لگ جائے پھر اٹھ کر دیکھے تو سواری کا کہیں نام و نشان نہ ملے وہ اسے اِدھر اُدھر تلاش کرے لیکن جب پیاس اور گرمی کی شدت ناقابلِ برداشت ہو جائے تو وہ کہنے لگے اسی جگہ لوٹ چلوں جہاں نیند آئی تھی اور وہیں پھر سو رہوں یہاں تک کہ موت آجائے۔ تب وہ اپنے بازو پر سر رکھ کر مرنے کے لیے سو جائے اور جب اس کی آنکھ کھلے تو اچانک سواری (کھانے پینے کے سامان کے ساتھ) موجود ہو۔ اس وقت اس کی خوشی کا کیا ٹھکانا ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اس شخص سے بھی زیادہ اپنے مومن بندے کی توبہ سے خوش ہوتا ہے۔ (بخاری)

یہ بات فطری ہے کہ توبہ انسان کی کایا پلٹ دے اور اس کی پہلی زندگی اور توبہ کے بعد کی زندگی میں نمایاں فرق پیدا ہو جائے۔

توبہ اپنی کمزوریوں اور کمزور لمحات پر انسان کی فتح کی علامت ہے

اس نئی زندگی کی مثال اس زمین جیسی ہے جو بارش کے بعد از سرِ نو زندہ ہو جائے۔ توبہ پوری زندگی کو بدل دیتی ہے۔ جزوی تبدیلی نہیں لاتی۔

ڈاکٹر زکی مبارک "قوت القلوب" سے نقل کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

توبہ کرنے والے کو یہ نہیں دیکھنا چاہیے کہ گناہ کتنا چھوٹا ہے بلکہ یہ دیکھنا چاہیے کہ نافرمانی کس کی ہوتی ہے؟

ڈرنے والے کی نگاہوں میں چھوٹے گناہ بھی بڑے ہوا کرتے تھے کسی صحابیؓ کا قول ہے کہ آج تم لوگ جن کاموں کو نہایت معمولی سمجھ کر کر گزرتے ہو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ہم انھیں مہلک شمار کرتے تھے۔

یہ اس لیے کہ صحابہ کرامؓ کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی جتنی زیادہ عظمت تھی اس کی وجہ سے وہ

گناہوں کی کثرت سے مایوس نہ ہو جایئے۔ اگر یہ گناہ سمندر کے جھاگ کے برابر بھی ہوں تب بھی اللہ تعالیٰ کو پرواہ نہیں ہوگی بشرطیکہ آپ صدقِ دل سے توبہ کرنے لگ جاتے ہیں۔ پچھلے گناہوں کو آئندہ کے لیے رکاوٹ نہیں بنانا چاہیے کہ رحمتِ خداوندی کا دامن بہت وسیع ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَاَسْلِمُوْا لَهٗ ۔ (الزمر ۵۳ - ۵۴)

(اے نبیؐ) کہہ دو اے میرے بندو جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ یقیناً اللہ سارے گناہ معاف کر دیتا ہے وہ تو غفور رحیم ہے پلٹ آؤ اس کی طرف اور مطیع بن جاؤ اس کے۔

اس آیت اور اللہ تعالیٰ کی رحمت بے پایاں کا ذکر کرنے والی حدیثوں سے شکستہ دلوں میں امید کی تیز لَو پیدا ہو جاتی ہے اور ماضی کی خطاؤں پر پردہ ڈالتے ہوئے از سرِ نو زندگی شروع کرنے کا جذبہ بیدار ہوتا ہے۔

بندوں کو شوق کے پَروں پر سوار ہو کر اپنے پروردگار کی طرف تیزی سے بڑھنا چاہیے اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو یہ اپنے پروردگار اور اس کے دین سے ناواقفیت کی وجہ سے ہوتا ہے، کون اللہ تعالیٰ سے زیادہ ان کے لیے مہربان ہو سکتا ہے؟ پھر یہ مہربانی بغیر کسی غرض کے ہے اللہ تعالیٰ نے انسان کو عزت افزائی کے لیے پیدا کیا ہے ذلیل کرنے کے لیے نہیں۔

دین کا کام یہی ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان ان کے طرزِ عمل اور تعلقات کو حق وانصاف کی بنیادوں پر استوار کرے تاکہ وہ دنیا میں اس طرح زندگی گزاریں کہ ظلم و جہالت سے سروکار نہ ہو۔

انسان کے لیے دین ایسا ہی ہے جیسے بدن کے لیے غذا۔

اللہ تعالیٰ ہر ظالم کے مقابلہ میں مظلوم کے ساتھ ہے۔

کیا یہ محض رحمت اور بھلائی کی بات نہیں؟

اب اگر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو بعض آسان سی عبادتوں کا مکلف بنایا ہے تاکہ وہ اس کے حق کو یاد کریں تو کیا انسانوں کو ان کی ادائگی سے تکلیف محسوس کرنی چاہیے؟

اللہ تعالیٰ تو تمام انسانوں کے لیے آسانی اور عزت چاہتا ہے اب اگر وہ اپنی حرکتوں سے

بعض لوگ ایک عبادت پر دوسری عبادت کو اس لیے ترجیح دیتے ہیں کہ وہ انھیں زیادہ پسند ہوتی اور آسان نظر آتی ہے جبکہ دین ایک متوازن طرزِ عمل کا متقاضی ہے۔

۴۔ کسی عبادت واطاعت کی ادائگی کے بعد اسے مختلف آفتوں سے بچانا بھی ضروری ہے۔ جیسے کسان بیج بونے کے بعد اسے کیڑے مکوڑوں سے محفوظ رکھتا ہے۔

جو شخص کسی کو صدقہ دے کر احسان جتاتا ہے یا پھر لوگوں کے درمیان سربلندی چاہتا ہے وہ اپنے اس طرزِ عمل سے اپنا اجر ضائع کر دیتا ہے۔

پھر لوگوں کے مرتبہ ومقام کا بھی فرق ملحوظ ہونا لازمی ہے اسی لیے کہا جاتا ہے کہ حسنات الابرار سیئات المقربین یعنی نیک لوگوں کی نیکیاں مقرب حضرات کے تعلق سے ان کی کوتاہیاں شمار ہوتی ہیں جیسے کوئی غریب آدمی چند روپے صدقہ کرے تو یہ اس کی نیکی ہے لیکن کسی مالدار کے لیے چند روپے صدقہ کرنا اس کی کوتاہی مانی جائے گی اسے تو اپنی حیثیت کے مطابق بڑی رقم صدقہ کرنا چاہیے۔

دینی کمال وسیع افق رکھتا ہے۔

وَ فِیْ ذٰلِکَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ (المطففین ۲۶)	جو لوگ دوسروں پر بازی لے جانا چاہتے ہوں وہ اس چیز کو حاصل کرنے میں بازی لے جانے کی کوشش کریں۔

مومنین کے لیے اعلیٰ درجہ احسان کا ہے لیکن یہی احسان انبیائے کرامؑ کے لیے ادنیٰ درجہ ہے کہ وہ اس سے نیچے اتر ہی نہیں سکتے۔

پرہیزگاری

گناہوں سے اجتناب تو لازمی ہے ہی یہ بھی بھلائی ہے کہ گناہوں سے قریب چیزوں سے بھی اجتناب کیا جائے۔ جو آدمی ہر برائی ناپسند کرے گا وہ اپنے اور برائی کے درمیان رکاوٹ ڈالنے کی کوشش بھی کرے گا۔ حضرت نعمانؓ بن بشیر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

معمولی خطاؤں کو بھی بھاری سمجھتے تھے بعد کے مسلمانوں کے دلوں کا حال ویسا نہیں رہا۔

گناہ ایمان کے تقاضوں کے منافی ہوتے ہیں اس لیے ان سے توبہ اور پھر اجتناب کرنا ضروری ہے۔

يَا اَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْآ اِلَى اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا عَسٰى رَبُّكُمْ اَنْ يُّكَفِّرَ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ (التحریم ۸)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ سے توبہ کرو خالص توبہ بعید نہیں کہ اللہ تمہاری برائیاں دُور کر دے۔

گناہوں سے توبہ اور اجتناب کے ذریعہ ہی مسلمان اپنے دین کے صحیح نمائندے بن سکتے ہیں اور تبھی ان کا معاشرہ ہم آہنگ اور خوشگوار ہو سکتا ہے۔

○

بدعملی و گناہ پر جواب دہی و سزا کا سامنا مومن کو بھی کرنا پڑے گا سوائے اس کے کہ اس کی توبہ قبول ہو جائے۔

گناہوں کے علاوہ ان کوتاہیوں سے بھی توبہ ضروری ہے جو اطاعت و عبادت میں ہو جاتی ہیں مثلاً:

۱۔ عبادت کی ادائیگی میں غفلت و بے توجہی جو اللہ تعالیٰ کے مقام کو دیکھتے ہوئے بے ادبی ہے۔ اسی لیے ہر نماز کے بعد تین بار استغفار پڑھی جاتی ہے۔

۲۔ یہ گمان کرنا کہ ان عبادتوں کی ادائگی سے اللہ تعالیٰ کا حق پوری طرح ادا ہو گیا اور اس کی نعمتوں کی قیمت پوری ادا ہو گئی اب صرف اللہ تعالیٰ پر رہ گیا ہے کہ وہ فرشتوں کو بھیج کر جنت کی کنجی حوالے کر دے۔ اس طرح کا گمان انسان کو گناہ گاروں سے بھی زیادہ پستی میں گرا سکتا ہے۔

۳۔ عبادات کی بہت سی قسمیں ہیں۔ اگر انسان کچھ ہی عبادتیں کر سکتا ہے اور انھیں میں لگا رہے تو کوئی حرج نہیں لیکن اگر وہ دوسری عبادتیں بھی کر سکتا ہے تو انھیں نظر انداز کرنا بھی زیادتی ہے۔ مثلاً ایک مالدار شخص نمازیں تو بہت پڑھتا ہے لیکن صدقہ دینے میں کوتاہی کرتا ہے تو اسے اس طرزِ عمل سے توبہ کرنی چاہیے یا مثلاً ایک عالم اپنے فرائض منصبی کو چھوڑ کر ہر وقت روزہ نماز میں لگا رہے تو اسے بھی اس طرزِ عمل سے توبہ کرنی چاہیے۔

سے دُور رکھتے تھے۔

امام ابو حنیفہؒ کپڑوں کی تجارت کرتے تھے اور اتنا نفع مقرر کر رکھا تھا جس سے ان کی ضروریات پوری ہو جائیں۔ اگر خریدار خوشدلی سے بھی زیادہ قیمت دینا چاہتے تھے تب بھی نہیں لیتے تھے۔

زہد و فقر کے مقابلہ میں مجھے عفّت و قناعت کے الفاظ زیادہ پسند ہیں۔ زہد میں کچھ منفی پہلو شامل ہے جبکہ عفت نام ہے اپنے نفس پر قابو رکھنے کا یعنی اس میں مثبت پہلو ہے اسی لیے حدیث میں عفت کا لفظ ہی بار بار استعمال ہوا ہے۔

ظاہر ہے عفت صحیح ڈھنگ سے دولت مندی کے منافی نہیں اسی طرح قناعت بہتر حالات کے لیے جدّو جہد کے منافی نہیں۔

دنیا کی محبت اور موت سے نفرت ہی نے پچھلی صدیوں میں مسلمانوں کو زوال تک پہنچا دیا۔ مسلم مفکرین پر دو ذمّے داریاں عائد ہوتی ہیں۔

اول یہ کہ اللہ تعالیٰ پر ایمان اور یومِ آخرت پر یقین کو مضبوط بنائیں اور لوگوں کو آگاہ کریں کہ اس دنیا کے بعد انھیں آخری انجام سے دوچار ہونا ہے۔

دوم یہ کہ اس زندگی میں مہارت اور دنیاوی علوم میں سبقت حاصل کرنا ضروری ہے تاکہ انھیں صحیح ایمان کی خدمت میں لگایا جا سکے۔

زہد کے نام پر بے عملی زندگی سے ناواقفیت کی دلیل ہے جو آخرت میں خسارہ، حقیقت کے ضیاع، گمراہی کے غلبہ اور گناہوں کے تسلط کا مختصر ترین راستہ ہے۔

دنیا انسانوں سے بھری ہوئی ہے ان میں کچھ اللہ تعالیٰ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور کچھ نہیں رکھتے۔

دونوں طرح کے لوگ رزق کے حصول کے لیے جدّو جہد کرتے ہیں۔

لیکن دونوں کے طرزِ فکر میں زمین آسمان کا فرق ہوتا ہے۔

ایک غیر مومن زندگی کو ہی اپنا مقصد سمجھتا ہے کہ اس زندگی کے بعد پھر کوئی زندگی نہیں ہے۔

لیکن مومن اس کے برعکس یہ مانتا ہے کہ اس زندگی کے بعد ایک دوسری اور دائمی زندگی ہے زمین پر زندگی وسیلہ ہے مقصد نہیں یہاں وہ جو کچھ بوئے گا آخرت میں وہی کاٹے گا۔

"حلال واضح ہے اور حرام واضح ہے ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جنھیں بہت سے لوگ نہیں جانتے۔ اب جس نے ان مشتبہ چیزوں سے پرہیز کیا اس نے اپنا دین اور آبرو بچائی اور جوان میں پڑا اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو کسی ممنوع قطعۂ زمین کے اردگرد (اپنے مویشی) چرائے قریب ہے کہ اس کے مویشی اس میں جا پڑیں۔ جان لو ہر بادشاہ کا ایک محفوظ ممنوعہ علاقہ ہوتا ہے اور زمین پر اللہ تعالیٰ کا ممنوعہ خطہ اس کے محارم ہیں۔ جان لو جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ایسا ہوتا ہے کہ اگر وہ صحیح ہو تو پورا جسم صحیح رہے گا اور اگر وہ بگڑ جائے تو پورا جسم بگڑ جائے گا اور وہ دل ہے۔" (بخاری)

اب عقلمند وہی شخص ہوگا جو محارم سے دُور دُور رہنے کی کوشش کرے جو مشکوک و مشتبہ چیزوں کو چھوڑے گا وہ کھلی ہوئی حرام چیزوں کو بدرجۂ اولیٰ چھوڑ دے گا۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ بہترین دین پرہیز گاری ہے۔

پرہیز گاری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مشکلات و مصائب میں آدمی چُپ رہ جائے اور اپنی درماندگی ظاہر کرے بلکہ مسلمان کو اپنی دینی بصیرت کی روشنی میں حق کی جستجو کرنی چاہیے اگر اس کا دل کسی بات پر مطمئن ہو جائے تو اسے اختیار کرے اور اگر دل مطمئن نہ ہو تو چھوڑ دے۔ چاہے بتانے والے کچھ بھی بتائیں۔

پرہیز گاری کا ایک پہلو اور بھی ہے۔

ابو سلیمانؒ دارانی کہتے ہیں جو چیز بھی تمہیں اللہ تعالیٰ سے غافل کر دے وہ تمہارے لیے بُری ہے۔

سہیل بن عبداللہؒ سے خالص حلال کے بارے میں پوچھا گیا تو انھوں نے کہا:

حلال وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ کی جائے۔

اور خالص حلال وہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کو فراموش نہ کیا جائے۔

ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں کہ پرہیز گاری یہ ہے کہ تمہارا دل ایک لمحہ کے لیے بھی اللہ تعالیٰ سے غافل نہ ہو۔

حضرت عمرؓ فاروق کی پرہیز گاری کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے رشتے داروں کو سرکاری عہدوں

کی زندگی حاصل کرنے کی تمنّا سے پیدا ہوتے ہیں کیونکہ پھر ہر طرح کی لوٹ کھسوٹ کا راستہ کھل جاتا ہے اگر انسان اپنی حدود میں رہے تو آرام سے رہ سکتا ہے۔

خود کفالت کا مطلب یہی ہے کہ انسان اپنے ذرائع کو اچھی طرح سمجھے اور اپنی ضروریات کو انھیں کے مطابق حد میں رکھے۔ دوسروں کی طرف دیکھنے اور ان سے مسابقت کی کوشش نہ کرے۔

حضرت جابرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

طمع (لالچ) سے بچو کیونکہ وہی فقر ہے اور ان چیزوں سے بچو جن کے بارے میں معذرت کرنی پڑے۔ (طبرانی)

حضرت سعد بن ابی وقاص والی روایت میں یہ اضافہ ہے کہ "جو کچھ لوگوں کے ہاتھوں میں ہے اس سے مایوس رہو"

قناعت نفس پر کنٹرول رکھنے کی صلاحیت کا نام ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ مومن کا شرف شب بیداری اور اس کی عزت لوگوں سے بے نیازی میں ہے۔

آپ دیکھیں گے کہ ہر معاشرے میں ایسے لوگ ملتے ہیں جو کسی مال یا عہدے کے لالچ میں مالداروں اور اصحابِ اقتدار کے دروازوں پر پڑے ہوتے ہیں۔ مال کی محبت نے انھیں بھکاری بنا دیا ہے اور عہدہ کے چکر میں وہ اس لیے پڑے رہتے ہیں کہ اسی کو عزت و دولت کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

ایسے لوگ بھی مل جائیں گے جو اپنی ذہنی صلاحیتیں چند ٹکوں کے بدلے ہر خریدنے والے کو بیچنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔

اب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اندازِ تربیت کو دیکھئے کہ کس طرح آپؐ نے اپنے ساتھیوں کے رگ و پے میں عفت و قناعت کے جذبات پیوست کر دیے تھے اور وہ کس طرح کسی انسان کی طرف حاجت براری کے لیے دیکھنے سے بھی متنفر ہو گئے تھے۔

حضرت عوف بن مالک اشجعیؓ سے روایت ہے کہ ہم نے جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی تو کچھ روز بعد ہی آپؐ نے فرمایا:

"کیا تم لوگ مجھ سے بیعت نہیں کرو گے؟

یعنی غیر مومن کھانے کے لیے زندہ رہتا ہے اور مومن زندہ رہنے کے لیے کھاتا ہے۔ مومن اسی نظریہ کے ساتھ رزق کے حصول کی کوشش کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قارون سے یہ نہیں فرمایا تھا کہ اپنے خزانوں سے دستبردار ہو جاؤ تو میں تجھ سے راضی ہو جاؤں گا بلکہ یہ فرمایا تھا کہ:

وَابْتَغِ فِيمَا آتَاكَ اللَّهُ الدَّارَ الْآخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِيبَكَ مِنَ الدُّنْيَا۔ (القصص۔ ۷۷)

جو مال اللہ نے تجھے دیا ہے اس سے آخرت کا گھر بنانے کی فکر کر اور دنیا میں سے بھی اپنا حصّہ فراموش نہ کر۔

اگر دنیا کو صرف دنیا کے لیے طلب کیا جائے تو یہ ایسا ہی ہے جیسے ریشم کا کیڑا ریشم کے تار بنتا رہتا ہے یہاں تک کہ اسی میں پھنس کر مر جاتا ہے۔

آخر موت کے پنجے سب کچھ چھین لیتے ہیں اور انسان کا نام و نشان بھی مٹ جاتا ہے۔

وَلَقَدْ جِئْتُمُونَا فُرَادَىٰ كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ وَتَرَكْتُمْ مَا خَوَّلْنَاكُمْ وَرَاءَ ظُهُورِكُمْ۔ (الانعام ۹۴)

لو اب تم ویسے ہی تن تنہا ہمارے سامنے حاضر ہو گئے جیسا ہم نے تمہیں پہلی مرتبہ پیدا کیا تھا جو کچھ ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب تم پیچھے چھوڑ آئے ہو۔

زندگی کی پرستش اور اسی کو سب کچھ سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے اور اسی غلطی کی تصحیح کے لیے بار بار دنیا کی حقارت بیان کی گئی ہے لیکن دنیا کو آخرت کا ذریعہ سمجھ کر کام کیا جائے تو یہ خوش آیند چیز ہے۔

ایک شریف انسان شریفانہ طریقوں سے ہی دنیا حاصل کرتا ہے ظلم و جور اور فریب کاری کے ذریعہ نہیں کیونکہ "جنت میں وہ خون و گوشت داخل نہیں ہوں گے جن کی نشو و نما حرام سے ہوئی ہے ان کے لیے زیادہ مناسب جگہ جہنّم ہے۔" (ترمذی)

اور جو مال حلال ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے اس میں برکت و نجات ہے۔

اسلام نے جس عفت و قناعت کا حکم دیا ہے اس میں خود کفالت کے قانون کی پابندی بہت مددگار ہوتی ہے اکثر مسائل استطاعت سے زیادہ خرچ کرنے سے اور مہیا اسباب کے بغیر عیش و آرام

وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ

(هود ۱۵-۱۶)

کے طالب ہوتے ہیں ان کی کارگزاری کا سارا پھل ہم یہیں ان کو دے دیتے ہیں اور اس میں ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جاتی مگر آخرت میں ایسے لوگوں کے لیے آگ کے سوا کچھ نہیں ہے (وہاں معلوم ہو جائے گا) جو کچھ انھوں نے دنیا میں بنایا وہ سب ملیامیٹ ہو گیا اور اب ان کا سارا کیا دھرا محض باطل ہے۔

جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے نہ اس کے لیے کوئی تیاری کرتے ہیں ان کی محرومی فطری چیز ہے۔ کیونکہ انھوں نے جب کچھ بویا ہی نہیں تو کاٹیں گے کیا؟

ہاں دنیا میں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعَاجِلَةَ عَجَّلْنَا لَهٗ فِيْهَا مَا نَشَآءُ لِمَنْ نُّرِيْدُ ثُمَّ جَعَلْنَا لَهٗ جَهَنَّمَ يَصْلٰهَا مَذْمُوْمًا مَّدْحُوْرًا وَمَنْ اَرَادَ الْاٰخِرَةَ وَسَعٰى لَهَا سَعْيَهَا وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ كَانَ سَعْيُهُمْ مَّشْكُوْرًا كُلًّا نُّمِدُّ هٰٓؤُلَآءِ وَهٰٓؤُلَآءِ مِنْ عَطَآءِ رَبِّكَ وَمَا كَانَ عَطَآءُ رَبِّكَ مَحْظُوْرًا

(بنی اسرائیل ۱۸-۲۰)

جو کوئی (اس دنیا میں) جلدی حاصل ہونیوالے فائدوں کا خواہش مند ہو اسے ہم یہیں دے دیتے ہیں۔ جو کچھ بھی جسے دینا چاہیں پھر اس کے مقسوم میں جہنم لکھ دیتے ہیں جسے وہ تاپے گا ملامت زدہ اور رحمت سے محروم ہو کر اور جو آخرت کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے سعی کرے جیسی کہ اس کے لیے سعی کرنی چاہیے اور ہو وہ مومن تو ایسے ہر شخص کی سعی مشکور ہو گی ان کو اور ان کو بھی دونوں فریقوں کو ہم (دنیا میں) سامانِ زیست دیے جا رہے ہیں یہ تیرے رب کا عطیہ ہے اور تیرے رب کی عطا کو کوئی روکنے والا نہیں ہے۔

آخرت کی کامیابی تو اسی کو مل سکتی ہے جو اس کے لیے کوشاں ہو اور اس کے لیے راستہ حقیقی ایمان ہی کا ہے۔ اور پھر اس کی جزا کا بھی کیا ٹھکانا:

ہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! ہم تو آپ سے بیعت کر چکے ہیں اب کس بات پر بیعت کریں۔

آپؐ نے فرمایا: اس پر کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو گے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کرو گے اور پانچوں نمازیں ادا کرو گے اور اطاعت کرو گے اور آپؐ نے چپکے سے ایک بات کہی: لوگوں سے کچھ نہیں مانگو گے۔"

اس تربیت کا نتیجہ کیا تھا؟

ابن ابی ملیکہ بیان کرتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اونٹنی پر سوار کہیں جا رہے تھے کہ ہاتھ سے کوڑا گر گیا آپ نے اونٹنی بٹھائی اور خود اسے اٹھایا۔

لوگوں نے عرض کیا: آپ نے ہم سے کیوں نہ کہہ دیا کہ ہم اٹھا کر دے دیتے۔

فرمایا: میرے محبوب صلے اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دے رکھا ہے کہ لوگوں سے کوئی چیز نہ مانگوں۔ (مسلم)

اس میں نفس کو بے نیازی کی عادت ڈالنے اور لوگوں سے کچھ نہ طلب کرنے کا جذبہ کارفرما تھا۔

مومن جب دنیا اس لیے کماتا ہے کہ آخرت کے لیے اس سے مدد لے اور اپنے رب کی خوشنودی حاصل کرے تو وہ اس دنیا کے لیے اپنے دین یا مردانگی و شرافت کو قربان نہیں کر سکتا اگر دنیا حلال طریقہ سے ملتی ہے تو لے گا ورنہ مسترد کر دے گا اور پرواہ بھی نہیں کرے گا اور اگر مل جائے گی تب بھی اسے اللہ تعالیٰ سے غافل کرنے کا موقعہ نہیں دے گا کیونکہ وہ دنیا کو مقصود کے بجائے صرف ذریعہ سمجھے گا۔

جب اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کے حقوق نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں تو انسان میں حیوانی جذبات غالب آنے لگتے ہیں۔ ایک احمقانہ مادی کشمکش شروع ہو جاتی ہے اور مجنونانہ تگ و دو سے خود اپنی اور دوسروں کی زندگی اجیرن ہو جاتی ہے۔

قادرِ مطلق نے جس کے لیے جتنا رزق مقرر کر دیا ہے نہ اس سے زیادہ مل سکتا ہے نہ کم۔ اس لیے جائز طریقوں سے پوری جدّوجہد کے ساتھ اپنی قسمت پر قانع رہنا چاہیے۔ ناجائز طریقے اختیار کر کے اپنے آپ کو دنیا و آخرت کی بربادی میں نہیں ڈالنا چاہیے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا جو لوگ بس اس دنیا کی زندگی اور اس کی خوشنمائیوں

عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ۔ (الاحقاف ۔۲)

اٹھالیا، اب جو تکبر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلت کا عذاب دیا جائے گا۔

اسلام آخرت کو نظر انداز کر کے دنیا ہی میں مگن ہو جانے کی مذمت کرتا ہے۔

بلاشبہ اہلِ ایمان کو دنیا میں پاک چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا پورا حق ہے۔

يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَآ اُحِلَّ لَهُمْ ۗ قُلْ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ ۔ (المائدہ ۔۴)

لوگ پوچھتے ہیں کہ ان کے لیے کیا حلال کیا گیا ہے کہو تمہارے لیے ساری پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔

گرفت اس بات پر ہے کہ اس زندگی میں اللہ تعالیٰ کے حق کو نہ پہچانا جائے۔ ایمان عفت و قناعت اور اعتدال و توازن کی ہدایت دیتا ہے دنیا سے محروم نہیں کرتا۔

انسان اور خواہشاتِ نفس کے درمیان کشمکش ہوتی ہی ہے لیکن مومن بے لگام خواہشات کو قابو میں رکھنے کی جدّوجہد کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ یہی اس کی عادت بن جاتی ہے وہ دنیا کی چیزوں پر اسی طرح توجہ نہیں دیتا جیسے کوئی طالب علم امتحان دینے جا رہا ہو تو سڑک پر اِدھر اُدھر متوجہ نہیں ہوتا۔

حضرت عبداللہؓ ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ حضرت عمرؓ ایک بار رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہوئے تو آپؐ چٹائی پر استراحت فرما رہے تھے اور چٹائی کے نشانات آپؐ کے جسم مبارک پر ظاہر ہو رہے تھے، انھوں نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ کاش آپ اس سے بہتر بستر لے لیتے، آپؐ نے فرمایا: مجھے دنیا سے کیا سروکار؟ میری اور دنیا کی مثال تو ایسی ہے جیسے گرمی کے دن میں کوئی مسافر سواری سے اتر کر ایک گھڑی کسی درخت کے سایہ میں دم لے لے اور پھر اسے چھوڑ کر چلا جائے۔

(احمد)۔

وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ۔ (الشوریٰ ۲۰)

جو کوئی آخرت کی کھیتی چاہتا ہے اس کی کھیتی کو ہم بڑھاتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اللہ تعالیٰ (فرشتوں سے) فرماتا ہے: جب میرا بندہ کوئی برائی کرنے کا ارادہ کرے تو اسے مت لکھو یہاں تک کہ وہ برائی کر بیٹھے۔

اور جب کرلے تو ایک برائی لکھو۔

اگر وہ (ارادہ کے بعد) وہ برائی میرے لیے چھوڑ دے تو ایک نیکی لکھ لو

اور اگر میرا بندہ کوئی بھلائی کرنے کا ارادہ کرے تو ایک نیکی لکھ لو۔

اور اگر وہ وہ بھلائی کرلے تو دس نیکیوں سے لے کر سات سو نیکیاں تک لکھ دو۔ (بخاری)

○

مشرق سے لے کر مغرب تک آجکل ہر طرف معیارِ زندگی بڑھانے کے پُرشور نعرے سنائی دیتے ہیں۔

بلاشبہ معیارِ زندگی بڑھانا ایک انسانی مقصد ہے کیونکہ غربت بہت تکلیف دہ مرض ہے اور کوئی بھی صاحبِ ضمیر و کردار شخص لوگوں کی غربت پسند نہیں کرے گا۔ ہم اس راہ میں جدّوجہد کرنے والوں کی حمایت کرتے ہیں۔

لیکن یہ سوال ضرور کریں گے کہ غربت سے نجات اور تنگدستی و مشقت سے اوپر اٹھنے کے بعد پھر کیا؟

کیا ان مصلحین کا مقصد اتنا ہی ہے کہ لوگ بہترین غذائیں کھانے لگیں گانوں سے لطف اندوز ہونے لگیں اور عیش و آرام کی جدید ترین چیزیں حاصل کرلیں اور آخرت کے لیے ان کی تیاری صفر یا ناقابلِ ذکر رہے کیونکہ وہ ایمان کی دولت سے ہی غافل و محروم ہوں؟

ظاہر ہے یہ انجام تو قابلِ قبول نہیں نہ دین اسے گوارا کرسکتا ہے۔

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ

پھر یہ کافر آگ کے سامنے لاکھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا "تم اپنے حصّے کی نعمتیں اپنی دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لطف تم نے

کے حصے ایک دوسرے پر پلے پڑ رہے تھے انھوں نے (لوٹ کر) عرض کیا: آپ کی عزت کی قسم جو بھی اس کے بارے میں سن لے گا وہ اس میں نہ داخل ہونے کی پوری کوشش کرے گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور جہنم کو پسندیدہ و مرغوب چیزوں سے ڈھانک دیا گیا پھر جبریلؑ سے فرمایا اب جاکر دیکھو۔ انھوں نے جاکر دیکھا تو وہ مرغوب چیزوں سے ڈھانکی جاچکی تھی۔ انھوں نے لوٹ کر عرض کیا: آپ کی عزت کی قسم اب اس سے کوئی نہ بچ پائے گا۔" (ترمذی)

یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے کہ اس نے انسانوں کے لیے ایسے ماحول میں زندگی گزارنے کا بندوبست فرمایا ہے جس میں جدّوجہد لازمی ہو اور وہ بونے کے بعد ہی فصل کاٹ سکے، کیونکہ اسی جدّوجہد سے وہ درجۂ کمالات تک پہنچ سکتا ہے اور اسی سے انسان کی عظمت و پستی، خوش بختی و بدبختی اور خوشی و غم کے نتائج نکلتے ہیں۔

اگر سارے انسان یکساں ہوتے تو زندگی بے رنگ ہوتی۔

ایک بزرگ کا قول ہے کہ روزمرّہ کی زندگی ایک گلاس کی طرح ہے جس میں آدھا پانی بھرا ہو اور آدھا خالی اسے نہ پورا بھرا کہا جاسکتا ہے نہ پورا خالی۔ اسی طرح انسان کی زندگی نہ بالکل بھرپور ہوتی ہے نہ یکسر خالی۔ ہر انسان کے حصّے میں کچھ خوش بختی اور کچھ بدبختی ہوتی ہے انسان اگر گلاس کے بھرے ہوئے حصّے پر نگاہ ڈالتا ہے تو خوش بختی محسوس کرتا ہے اور خالی حصّے پر نگاہ ڈالتا ہے تو بدبختی۔

زندگی کی مشقّتوں پر صبر کرنے، فرائض کی ادائیگی کی مشقت اٹھانے اور خواہشاتِ نفس سے بچنے کی عادت ڈالنے کے لیے عزم اور طاقتور ارادہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ مصائب پر رونے دھونے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ انسان کو پوری حوصلہ مندی سے ان کا سامنا کرنا چاہیے آخر ہر اندھیری رات کی صبح ضرور ہوتی ہے۔

گویا صبر ایک قلبی و نفسیاتی ریاض ہے جس کے خوشگوار نتائج نکلتے ہیں۔ پھر مومن تو جانتا ہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت کے بغیر کچھ نہیں ہوسکتا ہے۔ اس لیے وہ شدّتِ حالات میں اپنے پروردگار سے اور زیادہ رجوع کرتا ہے۔ اور اس سے دعائیں بھی کرتا ہے اور اپنی رضا و تسلیم بھی ظاہر کرتا ہے۔ ہر مصیبت پر اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن کہنے کا یہی مطلب ہے

صبر و شکر

کیا کوئی شخص صبر سے بے نیاز ہو سکتا ہے؟

یہ تو انسان کے معنوی وجود کے لیے ویسے ہی لازمی ہے جیسے مادی وجود کے لیے پانی یا ہوا۔ انسان جب سے ہوش سنبھالتا ہے اسے بہت سی پسندیدہ چیزوں کو چھوڑنا اور بہت سی ناپسندیدہ چیزوں کو کرنا پڑتا ہے۔ بچپن کے کھیل کود کے مرحلے کو چھوڑ کر تعلیم و تربیت حاصل کرنے اور پھر زندگی کے سنجیدہ مسائل کا سامنا کرنے کے مرحلے میں قدم قدم پر صبر کی ضرورت پڑتی ہے۔

دانشمند وہی ہے جو مشکلات سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ پیدا کرے اور پورے شعور اور پامردی کے ساتھ اپنی منزلِ مقصود کی طرف قدم بڑھائے نہ راہ کی دشواریوں سے گھبرائے۔ نہ گمراہ کن دل فریبیوں میں پھنس کر رہ جائے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے، کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب اللہ تعالیٰ نے جنّت و جہنّم کی تخلیق کی تو جبریلؑ کو جنت کی طرف بھیجا اور فرمایا کہ جنّت کو دیکھو اور اس میں اہلِ جنّت کے لیے جو کچھ تیار کیا گیا ہے اس پر نظر ڈالو۔ جبریلؑ جب دیکھ کر لوٹے تو عرض کیا، آپ کی عزّت کی قسم، جو بھی اس کے بارے میں سُن لے گا وہ اس میں داخل ہونے کی کوشش کرے گا۔ تب اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اور جنّت کو ناپسندیدہ اور پُر مشقّت چیزوں سے ڈھانک دیا گیا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے جبریلؑ سے فرمایا، اب جا کر دیکھو، انھوں نے جا کر دیکھا تو وہ ناپسندیدہ چیزوں سے ڈھانکی جا چکی تھی۔ تب انھوں نے عرض کیا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ اب اس میں کوئی داخل ہونے کی کوشش نہیں کرے گا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اب جا کر جہنم کو دیکھو اور اس میں اہلِ جہنم کے لیے جو کچھ تیار کیا گیا ہے اس پر نظر ڈالو۔ جبریلؑ نے جا کر دیکھا تو جہنّم

وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّیّٰتِهِمْ وَالْمَلٰٓئِكَةُ یَدْخُلُوْنَ عَلَیْهِمْ مِّنْ كُلِّ بَابٍ سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ۔ (الرعد ۲۲-۲۴)

ان کی بیویوں اور اولادوں میں سے جو صالح ہیں وہ بھی ان کے ساتھ وہاں جائیں گے ملائکہ ہر طرف سے ان کے استقبال کے لیے آئیں گے اور ان سے کہیں گے تم پر سلامتی ہے تم نے جس طرح دنیا میں صبر سے کام لیا ہے۔

در حقیقت صبر یقینہ تمام اعمال کا ایک اہم عنصر ہے۔ اگر حرام شہوت پرستی سے صبر کیا جائے تو اس کا نام عفت اور اس کی ضد بدکاری وزنا ہے۔ اگر پیٹ کی شہوت اور نامناسب انداز سے کھانے سے صبر کیا جائے تو اس کا نام شرافتِ نفس اور آسودگی ہے اور اس کی ضد کمینگی اور گھٹیا پن ہے۔

اگر اس بات کے اظہار سے صبر کیا جائے جس کا ظاہر کرنا مناسب نہیں تو اس کا نام رازداری ہے اور اس کی ضد افشائے راز ہے۔

اگر زندگی کی غیر ضروری چیزوں سے صبر کیا جائے تو اس کا نام زہد و قناعت ہے اور اس کی ضد حرص ہے۔ اگر غصہ بھڑکانے والی چیزوں پر صبر کیا جائے تو اس کا نام حلم و بردباری ہے اور اس کی ضد جلد بازی۔ اگر جلد بازی سے صبر کیا جائے تو اس کا نام وقار و ثبات ہے اور اس کی ضد غضب اور ہلکا پن ہے۔ اگر فرار سے صبر کیا جائے تو اسے شجاعت کہیں گے اور اس کی ضد بزدلی ہے۔

اگر انتقام سے صبر کیا جائے تو اسے درگزر کہیں گے اور اس کی ضد انتقام ہے اگر جزرسی سے صبر کیا جائے تو اسے سخاوت کہیں گے اور اس کی ضد بخل ہے۔ اگر مخصوص وقت میں کھانے پینے سے صبر کیا جائے تو اسے روزہ کہیں گے۔ اگر درماندگی و کاہلی سے صبر کیا جائے تو اسے دانشمندی کہیں گے۔ اگر دوسروں پر بوجھ نہ ڈال کر دوسروں کا بوجھ خود اٹھایا جائے تو اسے مردانگی کہیں گے۔ اگر دو فریقوں کے درمیان ظلم سے صبر کیا جائے تو اسے عدل کہیں گے۔

گویا صبر ان ساری چیزوں کے لیے جامع لفظ ہے اور اخلاق و کردار وعبادات سب میں شامل ہے۔

صبر کا یہ بڑا عامیانہ تصور ہوگا کہ اسے محض مصیبت تک محدود سمجھا جائے۔ صبر تو مسلمان پر

اور اسی سے وہ رحمتِ الٰہی کا مستحق ہوتا ہے، نہ وہ کشادگی میں اپنے پروردگار سے تعلق کمزور کرتا ہے نہ تنگدستی میں، نہ صحت میں نہ مرض میں۔ صبر کا محور یہی ہے۔

حضرت انس رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"دنیا میں زہد کا مطلب نہ حلال کو حرام سمجھنا ہے نہ مال کو ضائع کرنا بلکہ زہد یہ ہے کہ جو کچھ تمہارے ہاتھ میں ہو اس پر تمہارا بھروسہ اس سے زیادہ نہ ہو جو کچھ اللہ تعالیٰ کے پاس ہے۔"

(ترمذی)

اللہ تعالیٰ کے لیے صبر ایمان کی روح ہے اور آزمائش پر صبر کا بڑا اجر ہے۔

اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَھُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ (الزمر ۴۰-۳۹)	صبر کرنے والوں کو تو ان کا اجر بے حساب دیا جائے گا۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ ہم حضرت معاویہ رضؓ کے پاس تھے ایک طبیب آپ کی پشت پر کسی زخم کا علاج کر رہا تھا اور آپ سے اظہارِ تکلیف ہو رہا تھا۔ میں نے کہا اگر ہمارا کوئی جوان بھی اس طرح (اظہارِ تکلیف) کرتا تو ہم اسے ملامت کرتے۔ انھوں نے فرمایا کہ میں اس سے خوش نہیں ہو سکتا کہ یہ تکلیف نہ ہو۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا ہے کہ جس مسلمان کے جسم میں کوئی تکلیف ہوتی ہے وہ اس کے گناہوں کا کفّارہ بن جاتی ہے۔ (احمد)

اس مفہوم کی بہت سی روایتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْہِ رَبِّہِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰھُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً وَّیَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَۃِ السَّیِّئَۃَ اُولٰٓئِکَ لَھُمْ عُقْبَی الدَّارِ جَنّٰتُ عَدْنٍ یَّدْخُلُوْنَھَا	ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے رب کی رضا کے لیے صبر سے کام لیتے ہیں نماز قائم کرتے ہیں ہمارے دیے ہوئے رزق میں سے علانیہ اور پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور برائی کو بھلائی سے دفع کرتے ہیں آخرت کا گھر انھیں لوگوں کے لیے ہے یعنی ایسے باغ جو ان کی ابدی قیام گاہ ہونگے وہ خود بھی ان میں داخل ہونگے اور ان کے آبار اجداد

قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ۔ (الانعام - ۱۴)

کہو اللہ کو چھوڑ کر کیا اور کسی کو اپنا سرپرست بنالوں اس خدا کو چھوڑ کر جو زمین و آسمان کا خالق ہے اور جو روزی دیتا ہے اور روزی نہیں لیتا ہے۔ کہو مجھے تو یہی حکم دیا گیا ہے کہ سب سے پہلے میں اس کے آگے سر تسلیم خم کروں (اور تاکید کی گئی ہے کہ کوئی شرک کرتا ہے تو کرے) تو بہر حال مشرکوں میں شامل نہ ہو۔

جب آپ الحمد للہ کہتے ہیں تو آپ اپنے پروردگار کے احسانات کا قلب کی گہرائیوں سے شکر ادا کرتے ہیں کہ ہر بھلائی اسی سے ملتی ہے اور وہی شکر کے لائق ہے اور خود اللہ تعالیٰ نے بندوں کو شکر ادا کرنے کا حکم دیا ہے کیونکہ شکر نہ ادا کرنا ایک بخل اور بُرائی ہے

آپ دنیا میں کسی پر احسان کریں اور وہ نگاہ پھیرلے تو آپ کے جذبات کیا ہوں گے؟ اور پروردگار کے احسانات سے تو روگردان جکڑا ہوا ہے اس کی ناشکری کتنا بڑا جرم ہو گی؟ پھر احسان مندی اور شکر ہی سے تو مزید نعمتوں کا استحقاق پیدا ہوتا ہے۔

وَاِذْ تَاَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ۔ (ابراھیم - ۷)

تمہارے رب نے خبردار کیا تھا کہ اگر شکر گزار ہو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا اگر کفرانِ نعمت کرو گے تو میری سزا بہت سخت ہے۔

شکر زبان کی حرکت سے پہلے دل کے احساس و شعور کا نام ہے الفاظ تو اس احساس کی ترجمانی کے لیے ہیں۔

ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی زندگی پر نظر ڈالیں تو ہر قدم پر اللہ تعالیٰ کے شکر کے مظاہر ملیں گے۔ سوتے، جاگتے، کھانا کھانے کے بعد، نیا کپڑا پہننے کے بعد، سفر سے لوٹنے کے بعد غرض ہر موقع پر آپ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے۔

حضرت ابوہریرہ رضؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم رات میں اس قدر نماز پڑھتے تھے کہ قدم مبارک پر ورم آجاتا تھا آپؐ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہؐ آپ ایسا کرتے ہیں جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کے لیے یہ بشارت آچکی ہے کہ اس نے آپ کے تمام اگلے پچھلے گناہ

ہر بھلائی یا برائی اور نفع یا نقصان کی صورت میں واجب ہے۔ یعنی ہر حال میں اپنے نفس کی لگام کو اپنے قابو سے باہر نہ ہونے دینا۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ۔ (ھود ۹ - ۱۱)

اور کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے اور اگر مصیبت کے بعد جو اس پر آئی تھی ہم اسے نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہتا ہے میرے تو سارے دلدّر پار ہو گئے پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں اور وہی ہیں جن کے لیے درگذر بھی ہے اور بڑا درجہ بھی۔

صبر کا یہ مطلب نہیں کہ انسان مسلسل آلام کا شکار رہے اور اس سے ہمدردی کی ضرورت نہ ہو۔ انسانی زندگی اس سے زیادہ بلند ہے۔ انسان اس طرح نہیں رہتے جیسے کسی ظالم و بے حس حکمراں کے زیر سایہ اس کی رعایا رہتی ہے۔

شکر

دنیا میں انسان کے لیے گود سے گور تک دن رات کتنی نعمتیں ملتی رہتی ہیں۔ اگر ان ذمّے داریوں پر نگاہ ڈالی جائے جو صبر کی طالب ہوتی ہیں تو واضح ہو جائے گا کہ آزمائش سے کہیں زیادہ انسان نعمت سے بہرہ مند ہے۔

جن چیزوں پر پابندی ہے جو ذمّے داریاں عائد ہیں اور جو تکلیفیں عارضی طور پر پیش آتی ہیں وہ انسانی کمال کے زینے ہیں۔ پروردگار عالم انسان کو طرح طرح سے نوازتا ہے ان میں سے کس کس نوازش کو جھٹلایا جا سکتا ہے اور کیسے کسی صاحب ضمیر انسان کا دل شکر کے جذبات سے بھر نہیں جاتا۔

الْخَلْقِ بَسْطَةً فَاذْكُرُوْا آلَاءَ اللّٰهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ (الاعراف - ۶۹)

خوب تنومند کیا پس اللہ کی قدرت کے کرشموں کو یاد رکھو امید ہے کہ فلاح پاؤ گے۔

اور ثمود سے کہا گیا:

وَاذْكُرُوْا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَكُمْ فِى الْاَرْضِ تَتَّخِذُوْنَ مِنْ سُهُوْلِهَا قُصُوْرًا وَّتَنْحِتُوْنَ الْجِبَالَ بُيُوْتًا فَاذْكُرُوْا آلَاءَ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ۔ (الاعراف ۷۴)

یاد کرو وہ وقت جب اللہ نے قوم عاد کے بعد تمہیں اس کا جانشین بنایا اور تمہیں زمین میں یہ منزلت بخشی کہ آج تم اس کے ہموار میدانوں میں عالیشان محل بنواتے ہو اور اس کے پہاڑوں کو مکانات کی شکل میں تراشتے ہو پس اس کی قدرت کے کرشموں سے غافل نہ ہو جاؤ اور زمین میں فساد برپا نہ کرو۔

لیکن اس کے باوجود نعمت واحسان کا اعتراف کرنے والے کتنے کم ہوتے ہیں۔

وَقَلِيْلٌ مِّنْ عِبَادِيَ الشَّكُوْرُ۔ (سبا - ۱۳)

میرے بندوں میں کم ہی شکر گزار ہیں۔

جبکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو شکر کی توفیق دیتا ہے تو پھر (نعمت میں) اضافہ سے محروم نہیں کرتا کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ:

لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ۔ (ابراهیم ۔ ۷)

اگر شکر گزار ہو گے تو میں تم کو اور زیادہ نوازوں گا۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے اتنے ہی پر راضی ہو جاتا ہے کہ وہ کھانا کھائے تو اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے۔

اسی لیے پہلے لوگ شکر کو "حافظ" یعنی نعمتوں کی حفاظت کرنے والا کہا کرتے تھے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر کے اس کی نعمتوں کو پابند کرلو۔

حضرت حسن بصریؒ کہا کرتے تھے کہ ان نعمتوں کا ذکر کثرت سے کیا کرو۔ کیونکہ ان کا ذکر کرنا شکر ہے۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (الضحیٰ - ۱۱)

اور اپنے رب کی نعمت کا اظہار کرو۔

معاف کردیے؟ آپؐ نے فرمایا: کیا میں شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ (بخاری)

اور یہی شکر کا جذبہ آپؐ سے آپؐ کے صحابہؓ میں بھی منتقل ہو گیا تھا۔

○

آسمان سے بھگائے جانے کے بعد ابلیس کی جدّ و جہد کیا تھی؟

اس کی جدّ و جہد یہی تھی کہ وہ اولادِ آدمؑ کو انکار اور اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمتوں کو بھول جانے کے لیے بہکائے اور انھیں طرح طرح سے غفلت میں مبتلا کر دے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں سے لطف اندوز تو ہوں لیکن اس کا شکر نہ ادا کریں اور اللہ تعالیٰ کی عظمت کی نشانیوں کو دیکھتے ہوئے بھی اس کی تعظیم نہ کریں۔

حیوانوں کا حال یہ ہوتا ہے کہ انھیں چارہ مل جاتا ہے تو کھا لیتے ہیں اور نہیں ملتا تو بھوک کی تکلیف محسوس کرتے ہیں اس کے علاوہ انھیں کوئی پرواہ نہیں ہوتی نہ وہ نعمت پر شکر ادا کرنا جانتے ہیں نہ مصیبت پر صبر۔

شیطان چاہتا ہے کہ انسان بھی اسی طرح زندگی گزاریں۔ ذکر و شکر سے دُور دُور رہیں۔

لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ۔ (الاعراف ۱۶-۱۷)

میں بھی اب تیری سیدھی راہ پر ان انسانوں کی گھات میں لگا رہوں گا آگے اور پیچھے دائیں اور بائیں ہر طرف سے ان کو گھیروں گا اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔

پھر یہ انکار اگر اجتماعی شکل اختیار کرے اور قوم کی قوم اس میں مبتلا ہو جائے کہ گویا سب نے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے انکار پر ساز باز کر لی ہے تو انجام ظاہر ہے۔ عاد و ثمود آخر کس لیے ہلاک کیے گئے۔

عاد سے کہا گیا:

وَاذْكُرُوْٓا اِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنْۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّزَادَكُمْ فِى

بھول نہ جاؤ کہ تمہارے رب نے نوح کی قوم کے بعد تم کو اس کا جانشین بنا دیا اور تمہیں

خوف و رجا

اللہ تعالیٰ کا خوف اس کی صحیح معرفت کے سرچشمہ سے نکلتا ہے کیونکہ ایسی صورت میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی قدرت بے پایاں اور عظمت و جلال کا احساس ہوتا ہے۔

قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔
(المائدہ ۱۷)

ان سے کہو کہ اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں اور تمام زمین والوں کو ہلاک کر دینا چاہے تو کس کی مجال ہے کہ اس کو اس ارادے سے باز رکھ سکے اللہ تو زمین اور آسمانوں اور ان چیزوں کا مالک ہے جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور اس کی قدرت ہر چیز پر حاوی ہے۔

اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ جُنْدٌ لَّكُمْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اِنِ الْكٰفِرُوْنَ اِلَّا فِيْ غُرُوْرٍ اَمَّنْ هٰذَا الَّذِيْ يَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ بَلْ لَّجُّوْا فِيْ عُتُوٍّ وَّنُفُوْرٍ۔
(الملک ۲۰ - ۲۱)

بتاؤ، آخر وہ کونسا لشکر تمہارے پاس ہے جو رحمٰن کے مقابلے میں تمہاری مدد کر سکتا ہے حقیقت یہ ہے کہ یہ منکرین دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں یا پھر بتاؤ کون ہے جو تمہیں رزق دے سکتا ہے؟ اگر رحمٰن اپنا رزق روک لے؟ دراصل یہ لوگ سرکشی اور حق سے گریز پر اڑے ہوئے ہیں۔

جی ہاں خوف کا تعلق جانکاری اور معرفت سے ہے اگر آپ دیکھیں کہ ایک شخص بجلی کے

امام شعبیؒ کا قول ہے کہ شکر نصف ایمان ہے اور یقین پورا ایمان۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندے پر اپنی نعمت کا اثر دیکھنا پسند کرتا ہے کیونکہ یہ زبان حال سے شکر ہے۔

○

کچھ لوگ ایسے کند ذہن ہوتے ہیں کہ اُن پر آپ احسان پر احسان کرتے جائیں لیکن ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا جیسے پتھر پر پانی ڈال دیا ہو۔

ایسے لوگ سمجھتے ہیں کہ زندگی ان کی خدمت کے لیے پیدا کی گئی ہے وہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کر جو چاہیں لے لیں۔ اگر آپ انھیں کوئی چیز دینے سے انکار کر دیں تو چیخنے چلّانے لگیں گے۔

جب وہ محرومی پر چلاتے ہیں تو پانے کی صورت میں شکر گزار کیوں نہیں ہوتے؟

بہت سے لوگوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایسا ہی احمقانہ ہوتا ہے۔

آخر ہم انسان نعمتوں کا احساس اور شکر کیوں نہ کریں جبکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں بے شمار ہیں اور ایک پل کے لیے بھی انسان ان سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

عَلٰی قُلُوْبِھِمْ فَھُمْ لَا یَسْمَعُوْنَ۔ (الاعراف ۹۷-۱۰۰)

قصوروں پر انھیں پکڑ سکتے ہیں) مگر وہ سبق آموز حقائق سے تغافل برتتے ہیں، ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں پھر وہ کچھ نہیں سنتے۔

خوف احساس کی بیداری کا نام ہے اور اللہ تعالیٰ پر گہرے ایمان سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے کہ جن سات لوگوں کو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن سایہ میں رکھے گا ان میں ایک شخص وہ بھی ہوگا جسے کسی صاحبِ حیثیت اور خوبصورت عورت نے دعوت دی لیکن اس نے یہ کہہ کر قبول نہیں کی کہ میں اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہوں۔

اگر کوئی شخص محض بدنامی سے بچنے یا اپنے نفس پر کنٹرول کے لیے کسی برائی سے بچتا ہے تو بے شک یہ شرافت کی بات ہوگی لیکن ایمان کے اثر سے خوفِ خدا کی وجہ سے برائی ترک کرنے کی بات ہی کچھ اور ہے کیونکہ مومن کو جہاں بدنامی کا ڈر نہیں ہوگا وہاں بھی برائی سے دُور رہے گا۔

قُلْ اِنِّیْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ۔ (الزمر - ۱۳)

کہو اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے ایک بڑے دن کے عذاب کا خوف ہے۔

○

انسانی طرزِ عمل کو پاکیزہ بنانے اور اسے سیدھی راہ پر لگانے کے تعلق سے خوفِ خدا کی تاثیر کے بہت سے نمونے ہمیں سُنّتِ رسولؐ سے ملتے ہیں۔ مثلاً بنی اسرائیل کے ایک شخص کے واقعہ میں ملتا ہے کہ ایک عورت مفلسی سے یہاں تک مجبور ہوگئی کہ اپنے آپ کو ایک بے کردار دولتمند کے سپرد کرنے کے بارے میں سوچنے لگی۔ لیکن جب برائی بالکل سامنے آگئی تو اپنی بے عزّتی کے خوف سے اس کا بدن کانپنے لگا اور وہ بے اختیار رو پڑی۔ اس شخص نے کہا کس لیے رو رہی ہو، عورت نے کہا اس لیے کہ میں نے کبھی یہ کام نہیں کیا۔ صرف مجبوری مجھے یہاں تک لائی ہے۔ اس شخص نے کہا کہ جب تم خوفِ خدا کی وجہ سے ایسا کر رہی ہو تو میں (اس برائی سے بچنے کا) زیادہ حقدار ہوں۔ جاؤ۔ جو کچھ میں نے دیا ہے وہ تمہارا ہے۔ آج کے بعد میں کبھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ دیکھئے ایک پاکیزہ نفس عورت کس طرح ایک ایسے شخص میں انقلاب برپا کرنے میں کامیاب

کرنٹ سے چھیڑ چھاڑ کر رہا ہے یا چلتی ہوئی ریل گاڑی کے سامنے کھڑا ہو گیا ہے تو یا تو وہ نا واقف ہوگا یا پھر پاگل۔

جسے اللہ تعالیٰ کی یقینی معرفت حاصل ہوگی اس کے دل میں خوف پیدا ہونا لازمی ہے اور پھر اس کا اثر اس کے اعمال اور طرزِ عمل پر بھی لازماً ہوگا۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ جَزَاؤُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ جَنَّاتُ عَدْنٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ذَٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهُ ۔ (البینۃ ۔ ۷ ۔ ۸)

جو لوگ ایمان لے آئے اور جنھوں نے نیک عمل کیے وہ یقیناً بہترین خلائق ہیں ان کی جزا ان کے رب کے ہاں دائمی قیام کی جنتیں ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے یہ کچھ ہے اس شخص کے لیے جس نے رب کا خوف کیا ہو۔

انسان کتنی ہی غلط کاریوں میں اسی لیے پڑتا ہے کہ وہ خوفِ الٰہی سے محروم ہوتا ہے۔

أَفَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَاتًا وَهُمْ نَائِمُونَ أَوَأَمِنَ أَهْلُ الْقُرَىٰ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ اللَّهِ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَاسِرُونَ أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِن بَعْدِ أَهْلِهَا أَن لَّوْ نَشَاءُ أَصَبْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَنَطْبَعُ

پھر کیا بستیوں کے لوگ اب اس سے بے خوف ہو گئے ہیں کہ ہماری گرفت کبھی اچانک ان پر رات کے وقت نہ آجائے گی جب کہ وہ سوئے پڑے ہوں گے یا انھیں اطمینان ہو گیا ہے کہ ہمارا مضبوط ہاتھ کبھی یکایک ان پر دن کے وقت نہ پڑے گا جب کہ وہ کھیل رہے ہوں؟ کیا یہ لوگ اللہ کی چال سے بے خوف ہیں؟ حالانکہ اللہ کی چال سے وہی قوم بے خوف ہوتی ہے جو تباہ ہونے والی ہے اور کیا ان لوگوں کو جو سابق اہلِ زمین کے بعد زمین کے وارث ہوئے ہیں اس امرِ واقعی نے کچھ سبق نہیں دیا کہ اگر ہم چاہیں تو ان کے

تمنّا پوری کی جاسکتی ہے؟

بیشتر لوگ اپنی دعاؤں میں اسی درجہ تک اُتر جاتے ہیں اور اگر ان کی دعائیں قبول ہوجائیں تو وہ ہمیشہ بچے ہی بنے رہیں کسی ذمّے داری کا بوجھ اٹھائیں ہی نہیں۔

بیشک اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ وہ آپ کے دل کی ساری آرزوئیں پوری کردے۔ اگر وہ بے مانگے اتنی ساری ضرورتیں پوری کرتا ہے تو وہ کیا اسے اپنے دروازے سے ناکام لوٹا دے گا جو امیدیں لے کر وہاں مانگنے آئے؟

لیکن کچھ عقل و فہم سے کام لینا بھی ضروری ہے۔

حضرت ربیعہؓ بن کعب کی ایک عجیب روایت نظر سے گزری۔ فرماتے ہیں:

"میں دن میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا اور جب رات ہوجاتی تو میں آپ کے دروازے پر رات گزارتا۔ میں برابر سنتا رہتا کہ آپؐ فرما رہے ہیں "سبحان اللہ سبحان ربی"، یہاں تک کہ مجھے نیند آجاتی۔

آپ نے ایک روز فرمایا: ربیعہ! مانگ لو کیا مانگتے ہو۔

میں نے عرض کیا: یارسول اللہ! میری درخواست ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے دُعا فرمادیں کہ وہ مجھے جہنم سے نجات دے اور جنت میں داخل کردے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سکوت فرمایا، پھر ارشاد ہوا: تمہیں کس نے اس کا مشورہ دیا؟

میں نے عرض کیا: مجھے کسی نے مشورہ نہیں دیا۔ لیکن میں نے یہ جان لیا کہ دنیا تو مٹنے ہی والی ہے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کے یہاں ایسا مقام حاصل ہے تو میری خواہش ہوئی کہ آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے دُعا فرمادیں۔

آپؐ نے فرمایا: میں ایسا کروں گا۔ اب کثرتِ سجود کے ذریعہ اپنے سلسلے میں میری مدد کرنا"،

(مسلم)

انسان کیا امیدیں کرتا ہے اور اس کی ہمت کیا کہتی ہے اس کے سلسلے میں امام ابن جوزی لکھتے ہیں:

"میں نے ایک دن دُعا کی اور گزارش کی اے میرے رب! علم و عمل کے سلسلے میں میری

ہوگئی جس کی زندگی ہی گناہوں میں گزری تھی۔

خوفِ خدا بہت بڑی چیز ہے۔

انسان کو عدم سے وجود میں لانا اور پھر اس کی زندگی اور آسائش کے لیے بے شمار اسباب مہیا کرنا محض فضلِ الٰہی ہے اگر انسان کی خواہشوں کے مطابق نظامِ عالم چلتا تو بالکل انارکی اور انتشار پھیل جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر خود ان سے زیادہ مہربان ہے اور ان کی مصلحتوں سے بھی زیادہ واقف ہے پھر اپنی قدرت کے شایانِ شان ہی اس کی نوازش بھی ہوتی ہے۔ اس لیے وہی سب سے زیادہ حقدار ہے کہ اس سے امید لگائی جائے۔

○

وہ عظیم چیزیں کیا ہیں جنھیں حاصل کرنے کی امید میں ہم اللہ تعالیٰ کی چوکھٹ پر کھڑے ہوتے ہیں۔ وہ عظیم انعامات کیا ہیں جنھیں ہم اللہ تعالیٰ سے پانے کی تمنّا کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کو اس کے لائق سمجھتے ہیں کہ وہ ایسے انعامات سے بلکہ ان سے کہیں بڑھ کر نواز سکتا ہے؟

ہر آدمی چاہتا ہے کہ وہ دنیا و آخرت کی ہر بھلائی حاصل کرلے۔

اگر اللہ تعالیٰ بندوں کی ساری خواہشات پوری کردے تو بھی اس کے خزانے میں سے کچھ بھی کم نہیں ہوگا، ہاں یہ بات بالکل واضح رہنی چاہیے کہ کسی ناجائز چیز کی تمنّا نہیں کرنی چاہیے۔ اس کو ایک مثال سے سمجھئے۔

دنیاوی زندگی آزمائش کی جگہ ہے، یہ مستقل ٹھکانہ نہیں بلکہ گزرگاہ ہے۔ آخرت اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ پاکیزہ اور دیرپا چیز ہے۔ اب اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے کچھ ایسی امیدیں کرتا ہے جو ان حقائق کے برعکس ہیں یعنی وہ دنیا کو آخرت پر ترجیح دیتا ہے اور اس کی ساری تمناؤں کا محور صرف دنیاوی خواہشات کی تکمیل ہے تو ایسے جاہل شخص کو نامرادی کے سوا کیا حاصل ہوسکتا ہے؟

سب سے پہلے لوگوں کے ذہنوں میں یہ مسئلہ حل ہونا چاہیے کہ دونوں زندگیوں (دنیاوی واخروی) کے حقائق پیش نظر ہوں۔

یہ بات بھی ہے کہ اگر کوئی بچہ یہ چاہے کہ وہ ہمیشہ شیر خوار بچّہ ہی رہے تو کیا اس کی

مشغول تھے اور اسی کام سے تقدیر نے مجھے بھی مشرف کیا۔

لوگ جنھیں اہلِ دین کا نام دیتے ہیں ان کے بارے میں یہ گمان رکھتے ہیں کہ وہ بے حس، بد مزاج اور ذوقِ زندگی سے محروم ہوتے ہیں۔

بلاشبہ اس طرح کی بات ان لوگوں میں پائی جاتی رہی ہے جو قدیم و جدید دور میں مختلف منحرف مذاہب اور فرقوں سے تعلق رکھتے رہے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ الزام صرف اسلام کے حامیوں ہی پر لگایا جاتا ہے۔

بسا اوقات مجھے اس عجیب و غریب صورت حال پر ہنسی آتی ہے کہ بہت سے بیمار ذہن کے لوگ جو معمولی صلاحیتیں رکھتے ہیں، معاشرے میں اپنے طاقتور مقام کی بنا پر ہم لوگوں کو تنقیص کا نشانہ بنائیں اور ہمارے گرد و پیش ایسی آہنی دیواریں کھڑی کر دیں کہ ہم ان کے اندر ان کی مرضی کے مطابق ہی زندگی گزاریں اور اپنی صلاحیتوں اور تجربات کے تقاضوں کو نظر انداز کر دیں۔

انسان کے دل میں خوبصورتی، عزت و منزلت اور تونگری کا شوق موجزن ہوتا ہے پھر وہ جب اپنے گرد و پیش نگاہ اٹھاتا ہے تو اسے پھوہڑپن، بے عزتی اور مفلسی کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا تو وہ کتنے رنج و الم کا شکار ہو جاتا ہے۔

لوگوں کا حال بھی کتنا دلچسپ ہے وہ دنیا کے خواہش مند ہوتے ہیں اور جو لوگ دنیا پر قابض ہوتے ہیں ان کے سامنے ذلت کے ساتھ جھک جاتے ہیں اور پھر وہ ان کی غربت و بیچارگی کی وجہ سے انھیں حقیر بھی سمجھتے ہیں۔

انسان محسوس کرتا ہے کہ وہ دو مصیبتوں کے درمیان پھنسا ہوا ہے۔ اگر وہ زندگی میں اپنے حق کے تعلق سے خاموشی اختیار کرتا ہے تو عوام اس کے سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ اور اگر مخالف ماحول میں اپنے حق کے لیے جدّوجہد کرتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ دنیا پرستی میں لگ گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے ہم جیسے لوگ گندگیوں سے بھرے راستے پر پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں صرف اللہ تعالیٰ ہی دامن آلودہ ہونے سے بچاتا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ہی ہم دُعا بھی کرتے ہیں اور امید بھی لگائے رہتے ہیں۔

میں اپنے بارے میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ میں دنیا کو پسند کرتا ہوں البتہ اگر کسی

مرادیں پوری فرما اور میری عمر اتنی دراز کر کہ میں علم و عمل کے تعلق سے اپنی تمنا پوری کر سکوں۔ اتنے میں ابلیس نے وسوسہ پیدا کیا، پھر کیا ہوگا؟ کیا پھر وہی موت کا سامنا نہیں ہوگا؟ پھر درازئ عمر سے کیا فائدہ؟

میں نے کہا: احمق! اگر تو میرا سوال سمجھ لیتا تو یہ جان لیتا کہ وہ رائگاں نہیں ہے۔ کیا ہر روز میرے علم و معرفت میں اضافہ نہیں ہوگا، ہر روز میں نیکیوں کے بیج نہیں بوؤں گا کہ فصل کاٹنے کے دن اس کا فائدہ ہو؟

کیا یہ اچھا ہوتا کہ میں بیس برس کی عمر میں مر جاتا؟ تب تو مجھے اللہ تعالیٰ کی وہ معرفت حاصل نہ ہوتی جو آج حاصل ہے۔

یہ معرفت تو اتنے دنوں کی کوششوں سے حاصل ہوئی ہے جن کے دوران میں وحدانیت کی دلیلیں اکٹھا کرتا رہا اور بصیرت کی پختگی تک پہنچا اور ایسے علوم حاصل ہوئے جن سے مجھے بلندی حاصل ہوئی۔

پھر آخرت کے لیے میری کھیتی بڑھی، اور علم کی نشر و اشاعت کا موقع ملا۔

خود اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے فرمایا "کہو اے میرے پروردگار میرے علم میں اضافہ فرما" (طٰہٰ۔ ۱۱۴)

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مومن کی عمر میں اضافہ اس کی بھلائی میں اضافہ کا سبب ہوتا ہے۔

حضرت جابرؓ بن عبداللہ کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ سعادت کی بات ہے کہ بندے کی عمر دراز ہو اور اللہ تعالیٰ اسے توبہ و انابت کی توفیق دے۔"

اے کاش مجھے حضرت نوحؑ کی عمر ملتی کیونکہ علم بہت ہے اور جتنا بھی حاصل ہو، بلندی و نفع کا ذریعہ ہوتا ہے۔

میں نے جب امام ابن جوزیؒ کی کتاب "صید الخاطر" پڑھی تو مجھے محسوس ہوا کہ انھوں نے ان خیالات کی بڑی بالغ نظری کے ساتھ ترجمانی کی ہے جو خود میرے دل میں خلش پیدا کرتے رہے ہیں۔ پھر یہ بات بھی ہے کہ امام صاحب بھی اسلام کی تعلیم عام کرنے اور عوام کی خیر خواہی میں ہی

آتی تھی۔ اس سے وجہ دریافت کی گئی تو کہنے لگا، ذہن یکسو ہے، فکر دور کی ہے اور نفس بلند چیزوں کا طلبگار ہے جبکہ میری زندگی بالکل عوام والی ہے۔

کہا گیا: کہ تمہاری تمنا کس طرح پوری ہو سکتی ہے۔

کہا : جب حکومت مل جائے۔

کہا گیا : تب اس کی طلب میں لگ جاؤ۔

کہا : اس کی طلب میں خطرات حائل ہیں۔

کہا گیا : تو خطرات کو پار کرنے کی کوشش کرو۔

کہا : عقل روکتی ہے۔

کہا گیا : تب کیا کروگے۔

کہا : میں اپنی عقل کو جہالت سے بدل دوں گا اور اس طرح وہ خطرات پار کرنے کی کوشش کروں گا، جو صرف جہالت کے ساتھ ممکن ہے ساتھ ہی عقل کو ناگزیر تدبیروں میں لگاؤں گا۔ کیونکہ گمنامی کی زندگی عدم وجود کے برابر ہے۔

میں نے اس بے چارے کی حالت پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ اس نے اہم ترین چیز یعنی آخرت کو تو پس پشت ڈال دیا اور امارت و گورنری کی طلب میں لگ گیا اس کے لیے کس قدر لوگوں کے خون بہائے۔ پھر کچھ دنیاوی لذتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

لیکن یہ مدت صرف آٹھ سال تک رہی۔ اس کے بعد خود اسے قتل ہونا پڑا اور بدترین حال میں آخرت کے سفر پر روانہ ہوا۔

متنبی شاعر کو زندگی بھر یہی رونا رہا کہ لوگ تو عام زندگی پر مطمئن ہو جاتے ہیں لیکن خود اس کے سینے میں ایسا دل ہے جو اپنی مراد پاتے تک مطمئن نہیں ہو سکتا۔

اور اس کی مراد کیا تھی ؟ صرف دنیا سے متعلق۔

میں نے خود اپنی بلند ہمتی پر غور کیا تو عجیب صورتِ حال سامنے آئی۔ مجھے اتنا علم حاصل کرنے کا شوق ہے جو یقیناً ممکن نہیں۔ کیونکہ میں تمام علوم و فنون حاصل کرنا چاہتا ہوں اور ہر علم و فن میں انتہائی مہارت کا خواہاں ہوں جبکہ عمر چند علوم ہی میں انتہائی مہارت حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں۔

برائی سے چشم پوشی اور کسی ظالم کی حمایت ہی اس کا مقصد ہو کر رہ جائے تو دنیا انتہائی بری چیز ہے۔

برائی کو ہم برا سمجھتے ہیں اور اسے تلخ محسوس کرتے ہیں اور اس بات پر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ہمیں برائی سے نفرت عطا کی ہے۔

لیکن زندگی کی خوشگوار چیزیں جن کی تعریف سے زبانیں نہیں تھکتیں اور اعضائے بدن جن پر شکر ادا کرتے ہیں وہ کتنی بہترین ہیں اور انھیں حاصل کرنے اور ان سے لطف اندوز ہونے میں ہمیں کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی۔

بعض لوگ کھردری زندگی اور اہل و مال میں غم انگیز صورت حال پر صبر کا حوصلہ رکھنا پسند کرتے ہیں لیکن مجھے تو خدا کی قسم اس سے تنگی محسوس ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ سے میں اس سے پناہ مانگتا ہوں۔

میں اللہ تعالیٰ سے ایسی کشادگی نہیں مانگتا جو اس سے غافل کر دے بلکہ ایسی کشادگی مانگتا ہوں جو اس سے اور قریب کرنے کا ذریعہ بنے اور متکبرین اور احمقوں کے کھلواڑ سے بچائے۔

میرے دل میں یہ خیالات آرہے تھے اور میں امام ابن جوزیؒ کی کتاب "صید الخاطر" کی وہ سطریں پڑھ رہا تھا جن میں انھوں نے اپنی زندگی اور امیدوں کے بارے میں لکھا ہے:

"انسان کو ہمت کی بلندی سے زیادہ کسی اور چیز سے آزمائش میں نہیں ڈالا گیا۔ کیونکہ جس کی ہمت بلند ہوگی وہ بلند چیزیں اختیار کرے گا۔ بسا اوقات وقت اس کا ساتھ نہیں دے گا۔ کبھی وسائل سازگار نہیں ہوں گے۔ تب وہ ذہنی عذاب میں مبتلا رہے گا۔

مجھے بلند ہمتی کا صرف ایک حصہ ملا ہے اور اسی نے مجھے ذہنی پریشانی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ پھر بھی میں یہ نہیں کہتا کہ کاش یہ بلند ہمتی نہ ملی ہوتی۔ زندگی اسی قدر خوشگوار محسوس ہوتی ہے جتنی کم عقلی ہو اور عقل مند آدمی عقل کی کمی کے بدلے لذت میں اضافہ نہیں پسند کر سکتا۔

بہت سے لوگوں نے اپنی بلند ہمتی بیان کی ہے میں نے جب غور کیا تو وہ کسی ایک ہی میدان میں نظر آئی زیادہ اہم میدانوں میں نقص کی طرف ان کا دھیان بھی نہیں جاتا۔ مثلاً شریف رضی نے اپنی بلند ہمتی سے پیدا شدہ ذہنی اذیت کا ذکر کیا ہے لیکن میں نے غور کیا تو ان کی آرزوؤں کا منتہا امارت کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ابو مسلم خراسانی کو اپنی جوانی کے زمانے میں اکثر نیند نہیں

کا ذریعہ بن جائے۔ کیونکہ میری بلند ہمتی ان بلند امور کی طلبگار ہے جو اللہ تعالیٰ سے تقرب کا سبب بنیں۔

بسا اوقات طلب میں پراگندگی حصولِ مقصود کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ میں کوشاں ہوں کہ میری ایک سانس بھی بلا فائدہ ضائع نہ ہو۔

اگر میری ہمّت مقصود و مراد تک پہنچاتی ہے تو فبہا ورنہ مومن کی نیت اس کے عمل سے زیادہ دور رس ہوتی ہے۔"

O

اللہ تعالیٰ سے امید اور خوش گمانی اسی صورت میں قابلِ قبول ہے جب اس کے ساتھ ضروری عمل اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے ممکنہ جدّ و جہد بھی ہو۔

بے عملی اور سستی کے ساتھ نہ امید کی گنجائش ہو سکتی ہے نہ خوش گمانی کی۔

اللہ تعالیٰ کے اس فرمان پر غور کیجیے:

اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِیْنَ هَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ یَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (البقرہ - ۲۱۸)

جو لوگ ایمان لائے اور جنھوں نے خدا کی راہ میں اپنا گھر بار چھوڑا اور جہاد کیا ہے وہ رحمتِ الٰہی کے جائز امیدوار ہیں اللہ ان کی لغزشوں کو معاف کرنے والا ہے اور اپنی رحمت سے انھیں نوازنے والا ہے۔

یعنی ایمان، ہجرت اور جہاد ان تینوں صفات کے حامل ہی اللہ تعالیٰ کے فضل کے امیدوار تھے۔ شک و شبہ، بے عملی اور آرام طلبی کسی امید کو بار آور نہیں کر سکتی بلکہ ان سے صرف برائی ہی پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک دوسری جگہ نیکی کی ان دیگر قسموں کا ذکر کیا گیا ہے جو حسنِ قبول کا حقدار بناتی ہیں:

اِنَّ الَّذِیْنَ یَتْلُوْنَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِیَةً

جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انھیں رزق دیا ہے اس میں سے کھلے اور چھپے خرچ کرتے ہیں

اگر کوئی ایسا بلند ہمت نظر آتا ہے جو کسی فن میں انتہائی مہارت حاصل کر چکا ہو لیکن دوسرے علوم وفنون میں ناقص ہو تو مجھے اس کی بلند ہمتی ناقص نظر آتی ہے مثلاً کوئی محدث جو فقہ کا ماہر نہ ہو، کوئی فقیہ جو حدیث کا ماہر نہ ہو۔ مجھے ایسا لگتا ہے کہ کسی علم میں نقص کم ہمتی کا نتیجہ ہے۔

پھر میری یہ بھی تمنّا ہے کہ علم پر مکمل عمل ہو۔ یعنی بشر ؒ کا تقویٰ و پرہیز گاری اور معروف کرخیؒ کا زہد حاصل ہو اور کتابوں کے مطالعہ اور مخلوق کو فائدہ پہنچانے اور ان کے درمیان زندگی گزارنے کے ساتھ یہ چیز ممکن نظر نہیں آتی۔

پھر میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ مخلوق سے بے نیاز رہوں بلکہ خود انھیں نوازوں خود اپنی کمائی کے ذریعہ علم کا شغل رکھوں اور کسی کا احسان نہ قبول کروں۔

پھر یہ بھی جی چاہتا ہے کہ اولاد ہو جیسے تصانیف ہوں تاکہ میرے بعد دونوں چیزیں میری نمائندگی کریں اور اس میں تنہائی پسند دل کے لیے دیگر مشغولیت کا سامان ہے۔

پھر دل یہ بھی چاہتا ہے کہ خوبصورت عورتوں سے نکاح کروں۔ اس میں قلّتِ مال حائل ہے۔ پھر اگر ایسا ممکن ہو جائے تو یکجوئی پر اثر پڑے گا۔

اسی طرح بدن کے لیے کھانے پینے کی اچھی چیزیں درکار ہیں کیونکہ بدن اسی کا خواہاں ہوتا ہے جبکہ قلّتِ مال اس میں رکاوٹ ہے۔ پھر یہ سب چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

پھر جس کی بلند ہمتی کی انتہا دنیا ہی ہو اس کا میرا کیا جوڑ؟

میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی دنیاوی چیز کا حصول میرے دین میں نقص کا سبب بن جائے یا میرے علم وعمل پر اثر انداز ہو۔

شب بیداری کی طلب، علم کی تکرار کے ساتھ تقویٰ و پرہیز گاری کی جستجو، تصانیف میں دل کے انہماک اور بدن کے لیے مناسب کھانے پینے کی چیزوں کے حصول، ان سب کے لیے دل میں کتنی تڑپ ہے۔

لوگوں سے ملاقاتوں اور ان کی تعلیم کے ساتھ خلوت میں مناجات چھوٹنے پر کتنا افسوس ہوتا ہے۔ اہلِ خانہ کے لیے ضروری روزی کی طلب کے ساتھ پرہیز گاری و تقویٰ کتنا متاثر ہوتا ہے۔

تاہم میں نے اپنے آپ کو ذہنی اذیت کے سپرد کر دیا ہے۔ شاید یہ ذہنی اذیت ہی مجھے سنوارنے

جب جناب یزید بن اسود نے جناب وائلہ کو دیکھا تو اشارہ کرتے ہوئے اپنا ہاتھ بڑھایا۔

جناب وائلہ آکر بیٹھ گئے تو جناب یزید نے ان کی ہتھیلیاں پکڑ کر اپنے چہرے پر رکھ لیں۔

جناب وائلہ نے دریافت کیا: اللہ تعالیٰ سے تمہارا گمان کیسا ہے؟

انھوں نے فرمایا: خدا کی قسم! اللہ تعالیٰ سے مجھے اچھا گمان ہے۔

انھوں نے کہا: تمہیں خوش خبری ہو۔ کیونکہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا: میرا بندہ مجھ سے جو گمان رکھتا ہے میں اسی کے پاس ہوتا ہوں۔ اگر وہ نیک گمان کرتا ہے تو ویسا ہی ہوگا اور اگر برا گمان کرتا ہے تو ویسا ہی ہوگا۔ (احمد)

لیکن فرض سے غفلت یا حرام چیزوں میں جلدی سے آلودہ ہو جانے کا تصوّر اس شخص کے بارے میں نہیں کیا جا سکتا جو اللہ تعالیٰ سے نیک گمان رکھتا ہو۔ یہ صورت تو اس شخص کے بارے میں ہو سکتی ہے جس کے تعلق سے ابلیس کا گمان سچ ثابت ہو رہا ہو۔

یہ تو الفاظ سے کھیلنا ہوگا کہ آپ ایسے لوگوں کو جو اللہ تعالیٰ کی معرفت سے دُور ہیں اور اس کی حدود کو پامال کرتے ہیں اس بنیاد پر اس کی نعمتوں کے امیدوار دیکھیں کہ وہ نیک گمان رکھتے ہیں۔

تدین کے بعض دعویدار ایسے بھی ملتے ہیں جو دینی اصولوں کی پرواہ نہیں کرتے اور خواص و عوام میں رحمت و حسنِ ظن کے نام پر انحرافات کی جرأت پیدا کرتے ہیں۔ یہ سب نظریاتی و اخلاقی انتشار کی ایک قسم ہے جس پر خاموشی نہیں اختیار کی جا سکتی۔ ائمہ دین ہمیشہ سے اس طرح کے رجحان کی مزاحمت اور اس طرح کے لوگوں پر نکیر کرتے رہتے ہیں۔ حجۃ الاسلام امام غزالیؒ لکھتے ہیں:

یحییٰؒ بن معاذ کا قول ہے کہ میرے نزدیک یہ زبردست فریب خوردگی ہے کہ بغیر ندامت کے بخشش کی امید میں گناہوں کا ارتکاب کیا جاتا رہے، اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ سے تقرب کی توقع رکھی جائے، جہنم والے بیج بو کر جنّت کی فصل کا انتظار کیا جائے۔ گناہوں کے ساتھ فرمانبرداری کے ٹھکانے میں جگہ طلب کی جائے، عمل کے بغیر جزا کی توقع رکھی جائے اور کوتاہیوں و زیادتیوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے تمنائیں کی جائیں۔ کیونکہ:

خشکیوں پر تو سفینہ کبھی چلتا ہی نہیں

يَرۡجُوۡنَ تِجَارَةً لَّنۡ تَبُوۡرَ ۝ لِيُوَفِّيَهُمۡ اُجُوۡرَهُمۡ وَيَزِيۡدَهُمۡ مِّنۡ فَضۡلِهٖ ؕ اِنَّهٗ غَفُوۡرٌ شَكُوۡرٌ ۝
(فاطر ۲۹-۳۰)

یقیناً وہ ایک ایسی تجارت کے متوقع ہیں جس میں خسارہ ہرگز نہ ہوگا (اس تجارت میں انھوں نے اپنا سب کچھ اس لیے لٹایا ہے) تاکہ اللہ ان کے اجر پورے کے پورے ان کو دے اور مزید اپنے فضل سے ان کو عطا فرمائے۔ بیشک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔

تلاوتِ کلام پاک یعنی اس کی تعلیمات کو سمجھنا اور ان پر عمل پیرا ہونا، وہ اخراجات جو معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتے ہیں، باجماعت نمازوں کی پابندی جن سے زندگی میں اللہ تعالیٰ کی یاد پر توجہ ہوتی ہے، اس کے نام کو بلند کرنا جوامت کی وحدت کا شعار ہے یہ سب صحیح امید کے اسباب اور کامیابی و بامرادی کے اسباب ہیں۔

انسانی فطرت کے تقاضوں کی بنا پر لوگوں سے غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ وہ خود اپنے آپ پر اور دیگر لوگوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں جو غضب الٰہی کا سبب ہو سکتے ہیں لیکن اگر وہ اپنی غلطیوں کا احساس کر کے اللہ تعالیٰ سے معافی کے طلب گار ہوتے ہیں تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی مغفرت کا موقع ہوتا ہے۔

مومن کو اپنی زندگی کے کسی لمحہ میں یہ گر مجوشانہ امید نہیں چھوڑنی چاہیے چاہے وہ جوانی کی طاقت سے بھرپور ہو یا اپنی زندگی کے آخری ایام میں سفر آخرت کا منتظر ہو۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم ایک نوجوان کے پاس تشریف لے گئے وہ مرض الموت میں گرفتار تھا آپؐ نے فرمایا: کیا محسوس کر رہے ہو؟ اس نے عرض کیا: یارسول اللہ! اللہ تعالیٰ سے امید رکھتا ہوں لیکن اپنے گناہوں سے خوف بھی آتا ہے۔

آپؐ نے فرمایا: یہ دونوں کیفیتیں اگر کسی بندے کے دل میں ایسے موقع پر جمع ہوں تو اللہ تعالیٰ اس کی امید پوری کرے گا اور اسے خوف سے نجات دے گا۔ (ترمذی)

جناب حبان ابوالنضر سے روایت ہے کہ میں جناب یزید بن اسود کی عیادت کے لیے گیا راستے میں جناب واثلہ بن اسقع سے ملاقات ہو گئی وہ بھی انھیں کی عیادت کے لیے جا رہے تھے۔

رکھا اور دنیا کی لذّتیں حاصل کرنے میں مشغول رہا پھر بخشش کی توقع لگاتا ہے تو ایسا کرنا حماقت وخود فریبی ہی ہوگی۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "دانشمند وہ ہے جو اپنے نفس کا محاسبہ کرے اور موت کے بعد کے لیے عمل کرتا رہے اور احمق وہ ہے جو اپنے نفس کی خواہشات کی پیروی کرتا رہے اور اللہ تعالیٰ سے تمنائیں کرے۔" (ترمذی)

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ (مریم ۔ ۵۹)

پھر ان کے بعد وہ ناخلف لوگ ان کے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو ضائع کیا اور خواہشات نفس کی پیروی کی پس قریب ہے کہ وہ گمراہی کے انجام سے دوچار ہوں۔

فَخَلَفَ مِنۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا۔ (الاعراف ۱۶۹)

پھر اگلی نسل کے بعد ایسے ناخلف انکے جانشین ہوئے جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اسی دنیائے دنی کے فائدے سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے کہ ہمیں معاف کر دیا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ اس باغ والے کی مذمت فرماتا ہے جس نے اپنے باغ میں داخل ہوتے ہوئے کہا تھا:

مَاۤ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖۤ اَبَدًا ۙ وَّمَاۤ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّىْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝ (الکھف ۳۵ - ۳۶)

میں نہیں سمجھتا کہ دولت کبھی فنا ہوگی اور مجھے توقع نہیں کہ قیامت کی گھڑی آئے گی تاہم اگر میں اپنے رب کے حضور پلٹایا بھی گیا تو ضرور اس سے شاندار جگہ پاؤں گا۔

اس طرح واضح ہوجاتا ہے کہ جو بندہ اطاعتوں میں کوشاں رہے اور گناہوں سے پرہیز کرتا رہے وہ اس لائق ہے کہ یہ توقع رکھے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے نعمت کو پورا فرمائے گا۔ یعنی وہ جنت میں داخل ہو جائے گا۔

اہلِ دین جانتے ہیں کہ دنیا آخرت کی کھیتی ہے، دل زمین کی طرح ہے اور ایمان کی حیثیت بیج کی، اطاعتوں کی حیثیت زمین کو ہموار کرنے، صاف ستھرا کرنے، اور اس کی آبپاشی کے انتظامات کرنے کی ہے، دنیا میں غرق دل ایک بنجر زمین کی طرح ہے جس میں کوئی بیج نہیں اُگتا، قیامت کا دن فصل کاٹنے کا دن ہے اور ہر شخص وہی کاٹے گا جو اس نے بو رکھا تھا۔ اس کھیتی میں ایمان کا بیج ہی نشو ونما پاتا ہے، دل کی خباثت اور برے کردار کے ساتھ ایمان کم ہی مفید ہو سکتا ہے۔

جس طرح بنجر زمین میں بیج نشو ونما نہیں پاتا اسی طرح بندہ کی بخشش کی امید کو بھی قیاس کرنا چاہیے۔ جس نے اچھی زرخیز زمین حاصل کی پھر اس میں اچھا بیج بویا پھر آبپاشی کا انتظام کیا اور پودے کو نقصان پہنچانے والی گھاس پھوس کو صاف کرتا رہا پھر اللہ تعالیٰ سے یہ امید لگاتا ہے کہ وہ فصل کو قدرتی و ناگہانی آفات سے بچائے گا تو اسے واقعی امید قرار دیا جائے گا۔

اگر بیج بنجر زمین میں بویا گیا جہاں پانی بھی نہیں پہنچ سکتا۔ پھر پودے کی دیکھ بھال بھی نہیں کی جاتی۔ بلکہ فصل تیار ہونے کا انتظار کیا جاتا ہے تو اسے امید نہیں حماقت و فریب خوردگی قرار دیا جائے گا۔

اور اگر بیج تو اچھی زمین میں بویا گیا لیکن آبپاشی کا انتظام نہیں ہے اور بارش کا موسم بھی نہیں ہے۔ پھر بھی بارش کا انتظار رہتا ہے تو اسے محض تمنا کا نام دیا جا سکتا ہے۔

لہٰذا سچی امید اسی وقت قرار دی جائے گی جب بندے نے اپنے اختیار والے سارے اسباب اختیار کر لیے ہوں اور صرف وہی چیز باقی رہ گئی ہو جو اس کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے یعنی آفات سے بچانے والا اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم۔

بندہ نے جب ایمان کا بیج بو دیا، پھر اطاعتوں سے اس کی آبپاشی کرتا رہا، دل کو برے کردار و اخلاق سے صاف رکھا اور پھر اللہ تعالیٰ سے اس کی توقع لگائے رہا کہ وہ موت تک اسے ثابت قدم رکھے گا اور ایسا حسنِ خاتمہ نصیب کرے گا جو بخشش تک پہنچائے، تو اس کی امید حقیقی اور قابل قدر ہوگی اور ایمان کے تقاضوں کو مسلسل پورا کرتے رہنے پر دمِ آخر تک آمادہ کرے گی۔

اگر ایمان کا بیج بو کر پھر اطاعتوں سے اس کی آبپاشی نہیں کی، دل کو بری عادتوں پر چھوڑے

کیا یہی حال آپ کے پہلو میں دھڑکتے ہوئے دل کا بھی ہے؟

اس کی دھڑکنیں کبھی نہیں رکتیں چاہے آپ چاہیں یا نہ چاہیں وہ دن رات، سوتے جاگتے اپنا کام کرتا رہے گا کیا اس پر آپ کو کوئی اختیار حاصل ہے؟

اب اگر آپ گھر سے نکلتے ہیں اور دل کی دھڑکنوں کا مالک انھیں روک دینا چاہے تو اسے کوئی باز رکھ سکتا ہے؟

فرض کر لیجیے آپ اپنے ظاہری و باطنی آلات کے مالک ہیں اور ان پر آپ کو مکمّل اختیار بھی حاصل ہے۔ لیکن بیرونی زندگی کے حالات پر آپ کو کیا اختیار حاصل ہے؟ سڑک پر وسیع پیمانہ پر جاری نقل و حرکت آپ کے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ آپ کا احساس انتہائی بیدار بھی ہو تب بھی آپ ہر چیز پر قابو نہیں پا سکتے۔ ہو سکتا ہے کیلے کا کوئی چھلکا ہی آپ کے پیروں کے نیچے آجائے یا کوئی نوآموز ڈرائیور اپنی کار ہی آپ سے ٹکرا دے اور آپ کو شدید نقصان پہنچ جائے۔

بہت ساری ایسی چیزیں ہیں جن کی فراہمی کے بغیر انسان کا مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ اور ان سب چیزوں کی فراہمی کسی انسان کے اختیار میں نہیں۔ ہم اہلِ ایمان اسے اندھے اتفاق سے منسوب نہیں کرتے بلکہ اس عظیم خالق کی مشیت کے تابع سمجھتے ہیں جو ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے۔

اِلَیۡہِ یُرۡجَعُ الۡاَمۡرُ کُلُّہٗ فَاعۡبُدۡہُ وَتَوَکَّلۡ عَلَیۡہِ وَمَا رَبُّکَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ۝ (ھود - ۱۲۳)	معاملہ اسی سے رجوع کیا جاتا ہے بس اے نبیؐ تم اس کی بندگی کرو اور اسی پر بھروسہ رکھو جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو تمہارا رب اس سے بے خبر نہیں۔

اسی لیے کتاب و سنّت میں کثرت سے اللہ تعالیٰ پر توکل کرنے کا حکم آیا ہے۔ کیونکہ توکل اس پر دلالت کرتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ اور اس کی صفات سے آگاہ ہے۔

اس ذہنی و نفسیاتی بیداری کے ساتھ توکل کرنے والا اس لائق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی توفیق، نگرانی اور محبت سے بہرہ مند ہو۔

اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُتَوَکِّلِیۡنَ ۝ (آل عمران ۱۵۹)	اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے ہیں۔
وَمَنۡ یَّتَوَکَّلۡ عَلَی اللّٰہِ فَہُوَ حَسۡبُہٗ ؕ	جو اللہ پر بھروسہ رکھے اس کے لیے وہ کافی ہے

توکل

توکل نام ہے اس شعو و احساس کا کہ اللہ تعالیٰ کو زندگی پر مکمّل غلبہ و اختیار حاصل ہے اور زندگی کی ساری حرکات و سکنات اسی کے تابع ہیں۔ اس سے سر مو انحراف نہیں کر سکتیں۔

دل میں جب یہ احساس جاگزیں ہو جائے تو انسان کا اپنے پروردگار سے تعلق گہرا ہو جائیگا اور اس پر انحصار عیاں ہو جائے گا۔

اس شعور کی عقلی بنیاد کو سمجھنے کے لیے آیئے ہم ایک نظر گرد و پیش کے حالات اور ان کے تعلق سے اپنے موقف پر ڈالیں۔

ایک آدمی صبح اپنے گھر سے کام کے لیے نکلتا ہے وہ خود اختیار ہے اور سمجھتا ہے کہ اسے اس کے سوا کچھ نہیں کرنا ہے کہ وہ اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے اپنے پیروں کو حرکت دے۔ اور ایسا کرنا اس کے بس میں بھی ہے۔

شاید مادہ پرست لوگ کہیں کہ جب وسائل اس کے اختیار میں ہیں تو اب آگے سوچنے کی ضرورت نہیں۔

کیا واقعی منزل تک پہنچانے والے وسائل ہمارے اختیار میں ہیں؟

آپ کی کلائی میں اگر چابی دینے والی گھڑی ہے اور آپ کے گھر میں الارم والا ٹائم پیس ہے تو جب تک آپ ان میں روزانہ چابی نہ بھر لیں وہ چل نہیں سکتے۔ اگر آپ بھول گئے تو گھڑی کی سوئیاں رُک جائیں گی اور ٹِک ٹِک کی آواز رک جائے گی۔

انتظار نہیں کرنا چاہیے کہ آسمان سے کوئی فرشتہ آکر اس کا کام انجام دے گا۔

اگر راستہ پر چل رہا ہے تو ٹریفک کے توانین کی پوری پابندی کرے۔ انتشار پھیلا کر توکل کے نام پر سلامتی چاہنا جہالت ہے۔

اگر وہ کسی مقابلہ میں حصّہ لیتا ہے تو اس کی کماحقہٗ تیاریاں کرے۔

رات میں گھر آکر آرام کرنا ہے تو دروازے وغیرہ ٹھیک سے بند کرے کہ چور نہ گھس سکیں۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ایک دیہاتی نے سوال کیا تھا کہ میں اپنی اونٹنی باندھ کر توکل کروں یا توکل کے سہارے یونہی چھوڑ دوں تو آپؐ نے یہی جواب مرحمت فرمایا تھا کہ باندھ کر توکل کرو۔

خود اللہ تعالیٰ مجاہدین کو ہدایت فرماتا ہے کہ وہ میدانِ جنگ میں پوری طرح چوکنا رہیں:

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَکُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا جَمِیْعًا ٥ (النساء ۷۱)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو مقابلے کے لیے ہر وقت تیار رہو پھر جیسا موقع ہو الگ الگ دستوں کی شکل میں نکلو یا اکٹھے ہو کر۔

جب اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو توکل کا حکم دیتے ہوئے فرماتا ہے کہ:

فَاعْبُدْہُ وَتَوَکَّلْ عَلَیْہِ ؕ (ھود ۱۲۳)	پس اے نبیؐ تو اس کی بندگی کر اور اسی پر بھروسہ رکھ۔

تو پہلے یہ فرماتا ہے:

وَقُلْ لِّلَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰی مَکَانَتِکُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ. وَانْتَظِرُوْا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ٥ (ھود ۱۲۱ ۱۲۲)	وہ لوگ جو ایمان نہیں لائے تو ان سے کہہ دو تم اپنے طریقہ پر کام کرتے رہو اور ہم اپنے طریقے پر کیے جاتے ہیں انجام کار کا تم بھی انتظار کرو اور ہم بھی منتظر ہیں۔

یعنی توکل کا حکم مسلسل عمل اور طویل ثابت قدمی وصبر کے اعلان کے بعد آیا ہے۔

کسی امام نے کسی فقیر کو بغیر زادِ راہ کے حج کے لیے جاتے ہوئے دیکھا تو پوچھا:

اِنَّ اللّٰہَ بَالِغُ اَمْرِہٖ ؕ قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لِکُلِّ شَیْءٍ قَدْرًا (الطلاق - ۳)

اللہ اپنا کام پورا کر کے رہتا ہے اللہ نے ہر چیز کے لیے ایک تقدیر مقرّر کر رکھی ہے۔

یعنی جو بھی اللہ تعالیٰ پر انحصار کرے اور اس کی پناہ لے اللہ تعالیٰ اس کے لیے کفایت کرے گا۔

وہ کائنات کو اپنے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ہی چلاتا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا خَزَآئِنُہٗ وَمَا نُنَزِّلُہٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ۝ (الحجر ۲۱)

کوئی چیز ایسی نہیں جس کے خزانے ہمارے پاس نہ ہوں اور جس چیز کو بھی ہم نازل کرتے ہیں ایک مقررہ مقدار میں نازل کرتے ہیں۔

یہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے ناواقفیت کی بات ہوگی ـــ اور یہ ناواقفیت کفروانکار کا راستہ ہے ـــ کہ کوئی شخص اللہ تعالیٰ سے تعلق کے باوجود نامرادی و بربادی کی توقع کرے قرآن کریم عجیب وغریب انداز میں سوال کرتے ہوئے اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے۔

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ ؕ وَیُخَوِّفُوْنَکَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِہٖ ؕ وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ ہَادٍ ۝ وَمَنْ یَّہْدِ اللّٰہُ فَمَا لَہٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ ۝ (الزمر ۳۶-۳۷)

اے نبیؐ کیا اللہ اپنے بندے کے لیے کافی نہیں ہے؟ یہ لوگ اس کے سوا دوسروں سے تم کو ڈراتے ہیں۔ حالانکہ اللہ جسے گمراہی میں ڈال دے اسے کوئی راستہ دکھانے والا نہیں ہے اور جسے وہ ہدایت دے اسے بھٹکانے والا بھی کوئی نہیں۔ کیا اللہ زبردست اور انتقام لینے والا نہیں ہے۔

○

توکل کا لفظ ایک مظلوم لفظ ہے۔ توکل کا مطلب ہے کہ جس چیز کی انسان کو طاقت نہیں اور وہ اسے انجام نہیں دے سکتا اس کو اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دے۔ لیکن جو کچھ اس کی طاقت میں ہے اور جتنا کچھ وہ کر سکتا ہے وہ کر ڈالے۔ اس میں توکل کا کوئی مطلب نہیں۔

رات آئے تو وہ اپنے کمرے میں اٹھ کر بلب جلا دے۔ یہ اس کا کام ہے۔ اس کے لیے یہ

جن وسائل کو شریعت نے متعیّن کر دیا ہے وہی باعزّت وسائل ہیں جنھیں اختیار کر کے نتائج پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

اس طرح کے معاملات میں تقویٰ کی پابندی مؤثر نتائج پیدا کرنے والی چیز ہے۔

وَمَنْ يَتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَهُ مَخْرَجًا وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۚ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ ۚ (الطلاق ۲-۳)

جو کوئی اللہ سے ڈرتے ہوئے کام کرے گا اللہ اس کے لیے مشکلات سے نکلنے کا کوئی راستہ پیدا کر دے گا اور اسے ایسے راستے سے رزق دے گا جدھر اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو جو اللہ پر بھروسہ کرے گا اس کے لیے وہ کافی ہے۔

یہاں تقویٰ کا مطلب کمانے میں باعزّت طریقے کا لحاظ اور رزق کی طلب میں استقامت سے کام لینا ہے۔ دولت کی بے مہابا طلب کبھی ذلت و کج رفتاری تک پہنچا دیتی ہے۔

ان مہلک چیزوں سے روکنے کے لیے ہی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

"رزق کے حصول میں تاخیر تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے ذریعہ حاصل کرنے لگو، اللہ تعالیٰ کے پاس جو کچھ ہے اسے اس کی اطاعت کے ذریعہ ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔" (بزار)

حصولِ رزق کے تعلق سے توکل کے سلسلہ میں امام غزالیؒ نے "احیاء العلوم" میں کچھ اقوال درج کیے ہیں:

حضرت خواصؒ نے یہ آیت پڑھی:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ وَسَبِّحْ بِحَمْدِهِ ۚ وَكَفَىٰ بِهِ بِذُنُوبِ عِبَادِهِ خَبِيرًا ۚ (الفرقان ۵۸)

اے نبی اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔ اس کی حمد کے ساتھ اس کی تسبیح کرو اپنے بندوں کے گناہوں سے بس اسی کا باخبر ہونا کافی ہے۔

پھر فرمایا: اس آیت کے بعد بندہ کو سوائے اللہ تعالیٰ کے کسی اور سے لو نہیں لگانا چاہیے
کسی عالم کا قول ہے: رزق کی ضمانت تمہیں اس عمل سے نہ روکے جو تم پر فرض ہے

تمہارا زادِ راہ کہاں ہے؟

اس نے کہا : میں اللہ تعالیٰ پر توکل کیے ہوئے ہوں۔

انھوں نے پوچھا: کیا اکیلے سفر کر رہے ہو؟

اس نے کہا : نہیں بلکہ قافلہ کے ساتھ ہوں۔

انھوں نے فرمایا: تب تم قافلہ پر توکل کیے ہوئے ہو۔

امام صاحب نے سچ فرمایا: یہ توکل نہیں ٹکر گدائی ہے۔ بلکہ اس طرح کے لوگ اسلام سے ناواقف اور معرفتِ الٰہیہ سے نابلد ہیں۔ اور اس ناواقفیت میں بہت سی حماقتیں بھی شامل ہیں۔

توکل تو نام ہے ظاہری دنیا میں تمام مقررہ وسائل کو اختیار کرنے کے بعد غیبی مدد پر یقین رکھنے کا۔ یعنی انسان پر جتنی چیزیں لازم ہیں انھیں ادا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نصرت پر ایمان رکھنا۔

اور توکّل اپنی مناسب جگہ پر سکون واطمینان کا موجب بنتا ہے۔ اسے مثال سے سمجھئے۔

تمام زندہ وجودوں کے لیے رزق کی جستجو فطری بات ہے۔ صبح کی کرنیں پھوٹتے ہی کسان کاریگر، تاجر اور پیشہ ور حضرات چھوٹی بڑی جدّوجہد کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ تاکہ ہر شخص اپنے اور اپنے اہلِ خاندان کے لیے رزق حاصل کر سکے۔

یہ جدّوجہد اخلاق وکردار اور سلوک ورویّہ کے لیے بھی فیصلہ کن عامل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر رزق کی ضمانت فراہم کر دی جائے تو لوگ طرح طرح کی خرافات، تلون مزاجی اور جھوٹ وغیرہ جیسی برائیوں میں پڑ جائیں گے اور بسا اوقات کمزور لوگ طاقتور لوگوں کی چاپلوسی میں پڑ جائیں گے اور چھوٹے لوگ بڑے لوگوں کے دم چھلّے بن کر رہ جائیں گے۔

اسلام اس بات کو مسترد کرتا ہے کہ رزق کے لیے مشقت بہت سارے گناہوں میں ملوث ہونے کا ذریعہ بن جائے۔ اس لیے وہ صاف صاف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ رزق حلال راستوں سے حاصل کیا جائے۔ اور مسلمان جو کچھ چاہے کسی بھی حال میں ذلّت، فریب دہی اور غلط ذریعہ سے نہ حاصل کرنے لگے۔

وہ شر پسند طاقتیں جن کا سامنا رسولوں کو کرنا پڑتا ہے کوئی آسان دشمن نہیں ہوتیں ان طاقتوں کے شکنجوں سے بڑے حقائق اور پامال حقوق کو بچانا ایسا مشکل کام ہوتا ہے جو معجزہ ہی نظر آتا ہے۔ ان طاقتور شر پسندوں کا خوف لوگوں پر اس قدر غالب ہوتا ہے کہ مصلحین کے لیے ان کا سامنا کرنا اور ان کے استیصال کے لیے معرکہ میں کودنا نہایت مشکل ہوتا ہے۔

اسی لیے جب حضرت موسیٰؑ اور ان کے بھائی کو فرعون کے پاس جانے کا حکم ملا تو انھوں نے عرض کیا:

رَبَّنَا اِنَّنَا نَخَافُ اَنْ یَّفْرُطَ عَلَیْنَا اَوْ اَنْ یَّطْغٰی۔ قَالَ لَا تَخَافَآ اِنَّنِیْ مَعَکُمَآ اَسْمَعُ وَ اَرٰی۔ (طٰہٰ - ۴۵ - ۴۶)

پروردگار ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ ہم پر زیادتی کرے گا یا بل پڑے گا۔ فرمایا ڈرو مت میں تمہارے ساتھ ہوں سب کچھ سن رہا ہوں اور دیکھ رہا ہوں۔

ظاہر ہے کہ یہ احساس کہ اللہ تعالیٰ ساتھ ہے وحشت کو ختم کرنے والا اور خوف کو دور کر کے ہمت دلانے والا ہے۔ اس طرح کی پوزیشن میں توکل کا یہی مفہوم ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آغازِ وحی ہی میں یہ ہدایت دی گئی:

وَاذْکُرِ اسْمَ رَبِّکَ وَتَبَتَّلْ اِلَیْہِ تَبْتِیْلًا۔ رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ھُوَ فَاتَّخِذْہُ وَکِیْلًا وَاصْبِرْ عَلٰی مَا یَقُوْلُوْنَ (المزمل ۸-۹-۱۰)

اپنے رب کے نام کا ذکر کیا کرو اور سب سے کٹ کر اسی کے ہو رہو۔ وہ مشرق و مغرب کا مالک ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے لہٰذا اسی کو اپنا وکیل بنا لو۔ اور جو باتیں لوگ بنا رہے ہیں ان پر صبر کرو۔

یعنی خدا کا بھروسہ اور توکل وہ چیز ہے جس کا جدّوجہد کرنے والے سہارا لیتے ہیں اور چاروں طرف پھیلی ہوئی تاریکیوں میں اسی کی بدولت انھیں روشنی کی کرن نظر آتی ہے اور مستقبل تابناک نظر آتا ہے۔

یہ دل کے زخموں کو برداشت کرنے کی روحانی قوت ہی نہیں فراہم کرتا بلکہ ایک نغمہ کی صورت میں ان کی زبانوں پر جاری ہوتا ہے جسے ان کے دشمن بھی سنتے ہیں۔

ورنہ آخرت برباد ہو جائے گی۔

حضرت ابراہیمؒ بن ادہم فرماتے ہیں: میں نے ایک راہب سے پوچھا، تمہیں کھانا کہاں سے ملتا ہے؟ اس نے جواب دیا: اس کا علم میرے پاس نہیں ہے۔ یہ سوال میرے رب سے کرو کہ وہ کہاں سے مجھے کھلاتا ہے۔

جناب ہرمؒ بن حیان نے حضرت اویس قرنیؒ سے دریافت کیا: آپ مجھے کہاں رہنے کا حکم فرماتے ہیں؟ انھوں نے شام کی طرف اشارہ فرمایا۔ جناب ہرم نے دریافت کیا: وہاں گزر بسر کی صورت کیسی ہے۔ حضرت اویسؒ نے فرمایا: ان دلوں پر افسوس ہے جن میں شک و شبہ نے گھر کر لیا ہے اور نصیحت ان پر اثر نہیں کرتی۔ کسی بزرگ کا قول ہے: جب تم اللہ تعالیٰ کو اپنا حامی و مددگار بنانے پر رضامند ہو جاؤ گے تو ہر بھلائی کا راستہ پا جاؤ گے۔

ان اقوال کا مقصد مایوسی و نامرادی اور طمع و حرص کے جذبات کو دبانا ہے کیونکہ اس پہلو سے انسان کو سخت علاج کی ضرورت ہے۔

اہلِ فقر کی ذلّت اور اہلِ دولت کی سرکشی بہت سی گمراہیوں تک پہنچا دیتی ہے، مذکورہ اقوال کا مقصد اسی انتہا پسندی کو ختم کرنا اور سیدھے راستہ پر لانا ہے۔ تاکہ انسان کے دل میں بھروسہ اور یقین پیدا ہو اور گھبراہٹ کا شکار نہ ہو۔

لیکن ان سے بعض لوگ غلط مطلب نکالنے لگتے ہیں مثلاً یہ کہ کوشش کرنا بیکار ہے اور بے عملی ہی دین ہے۔ اس طرح کا مفہوم نکالنا یقیناً باطل ہے۔

○

توکل کی ایک اور جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ کو یاد کرنا اور اسی پر تکیہ کرنا مستحب ہے اور جہاں غیب پر ایمان طاقت کا ذریعہ ہوتا ہے۔

یہ جگہ ہے اس جدوجہد کی جس کا بار اللہ کے رسول اٹھاتے ہیں اور اس سلسلے میں انھیں ہولناک حالات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بھروسہ کی بنیاد پر ہی وہ ثابت قدم رہتے ہیں اور یہ بھروسہ ان کی نگاہوں کے سامنے حاضر کی تاریکیوں کا پردہ چاک کر کے مستقبل کی روشنی دکھاتا ہے اور سرکش طاقتوں کا عزم کے ساتھ مقابلہ کرنے کی جرأت پیدا کرتا ہے۔

اہلِ ایمان تو خدا ہی پر بھروسہ کریں گے اور اسی سے لَو لگائیں گے۔

اِنْ يَّنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ وَاِنْ يَّخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِىْ يَنْصُرُكُمْ مِّنْۢ بَعْدِهٖ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ٥ (آل عمران ۱۶۰)

اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں اور وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کرسکتا ہے؟ پس جو سچے مومن ہیں ان کو اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے۔

غیر اللہ پر بھروسہ بے فائدہ ہے جبکہ اللہ تعالیٰ سے تعلّق کا مطلب ہے بھلائی کے دائمی سرچشمہ سے تعلق جوڑنا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِىْ لَا يَمُوْتُ۔ (الفرقان ۵۸)

اے نبی اس خدا پر بھروسہ رکھو جو زندہ ہے اور کبھی مرنے والا نہیں۔

وَمَا كَانَ لَنَآ اَنْ نَّاْتِيَكُمْ بِسُلْطٰنٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ○ وَمَا لَنَآ اَلَّا نَتَوَكَّلَ عَلَى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰنَا سُبُلَنَا ؕ وَلَنَصْبِرَنَّ عَلٰى مَآ اٰذَيْتُمُوْنَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ؏

(ابراھیم ۱۱-۱۲)

یہ ہمارے اختیار میں نہیں ہے کہ تمہیں کوئی سند لادیں۔ سند تو اللہ ہی کے اذن سے آسکتی ہے اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے اور کیوں نہ اللہ پر بھروسہ کریں جبکہ ہماری زندگی کی راہوں میں اس نے ہماری رہنمائی کی ہے جو اذیتیں تم لوگ ہمیں دے رہے ہو ان پر ہم صبر کریں گے اور بھروسہ کرنے والوں کا بھروسہ اللہ پر ہونا چاہیے۔

اور جب ان ثابت قدم مومنین سے یہ مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ایمان چھوڑ کر اور پرانی گمراہی میں واپس آکر اپنی زندگی بچالیں اور راحت و سکون حاصل کرلیں تو وہ اسے مسترد کردیتے ہیں اور حق پر قائم رہنے اور اس راہ میں مصائب جھیلنے کا اعلان کرتے ہیں:

قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِىْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَمَا يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَىْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ○

(الاعراف ۸۹)

ہم اللہ پر جھوٹ گھڑنے والے ہوں گے اگر تمہاری ملت میں پلٹ آئیں جبکہ اللہ ہمیں اس سے نجات دے چکا ہے۔ ہمارے لیے تو اس کی طرف پلٹنا اب کسی طرح ممکن نہیں اِلّا یہ کہ خدا ہمارا رب ہی ایسا چاہے ہمارے رب کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔ اسی پر ہم نے اعتماد کرلیا، اے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان ٹھیک ٹھیک فیصلہ کردے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔

اس امید اور ثابت قدمی کی بنیاد یہ ہے کہ چاہے جتنا وقت لگے آخرکار تمام امور کا انجام اللہ تعالیٰ کے ہاتھوں ہی میں ہے اگر وہ مدد عطا کرتا ہے تو اسے کون روک سکتا ہے اور وہ بہرحال اپنے لشکر کو مدد فراہم کرے گا۔ باطل کو اپنا چکر لگا کر آخرکار نامراد ہی ہونا ہے۔

اسلام سے منحرف شمار کیے گئے۔

ارتداد وانحراف جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا ذریعہ ہے، میرے خیال میں اچانک ہی نہیں پیدا ہوجاتا بلکہ افراط وتفریط کے ایک طویل سلسلہ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ پہلا مرحلہ فرائض کو بوجھ سمجھنے اور گناہوں کو خوشگوار سمجھنے سے شروع ہوتا ہے۔ پھر فرائض کے ترک اور گناہوں سے آلودگی کا سلسلہ چلتا ہے پھر انسان بھلے لوگوں سے کنارہ کش اور برے لوگوں کے قریب ہوجاتا ہے۔ اس کا رجحان غلط کاروں کے ساتھ ہوجاتا ہے اور انھیں کی مدد کرنے لگتا ہے تب وہ یقیناً اسلام سے روگرداں یعنی مرتد ہوجاتا ہے۔

جب کوئی انسان کسی دین کی تعلیمات سے نفرت کرنے لگے اور ملّت سے غداری کرنے لگے تب وہ اس دین پر کیسے برقرار رہ سکتا ہے؟

أُولٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ أَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ (المائدہ ۴۱)	یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں سخت سزا۔

اور جب اس طرح کے لوگ اللہ تعالیٰ اور اس کے حقوق سے روگردانی کرتے ہیں تو دوسرے لوگ سامنے آجاتے ہیں جن کے دل زندگی اور محبت سے بھرے ہوتے ہیں وہ اپنے رب سے محبّت کرتے ہیں اور اس کے احکام کو گرمجوشی اور عزت کے ساتھ بجالاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے ان کی وفاداری انھیں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے والے ہر شخص سے قریب کرتی اور ہر نافرمان سے متنفر کرتی ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے وفاداروں کی مدافعت اور اس کے دشمنوں کی مخالفت پر آمادہ کرتی ہے۔ ان کے ذریعہ بھلائی فروغ پاتی ہے اور برائیاں ان کے سامنے دم توڑتی ہیں۔

اگر کسی انسان کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت گھر کرے تو وہ کمال کی چوٹی پر پہنچ جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کے بہترین انعام کا اہل ہوجاتا ہے۔

اس جذبہ کی نشو ونما منتخب لوگوں کا حصّہ ہے ہر انسان کو یہ نعمت نہیں ملتی ہے یہ بلندی اسی کو ملتی ہے جسے اللہ تعالیٰ چاہے اسی لیے آیت میں کہا گیا ہے:

محبّت

اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِي اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ يُجَاهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔

(المائدہ ۵۴)

اے لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے، اللہ اور بہت سے ایسے لوگ پیدا کردے گا جو اللہ کو محبوب ہوں گے اور اللہ ان کو محبوب ہوگا۔ جو مومن پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے۔ اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

یہ آیت تاریخ اسلام کے ایک خاص دور میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کے عملی نتائج پر روشنی ڈالتی ہے۔

وہ لوگ جنھیں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمایا اور جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرتے تھے انھیں ان لوگوں کی جگہ دی گئی تھی جو اس مرتبہ سے نیچے گر گئے تھے ان کی عادات و اطوار نے انھیں اللہ تعالیٰ کی نظر میں پسندیدگی کے اہل باقی نہیں چھوڑا تھا بلکہ وہ برابر برائیوں میں دھنستے جا رہے تھے یہاں تک کہ

بِاللّٰہِ وَرُسُلِہٖ ط ذٰلِکَ فَضْلُ اللّٰہِ یُؤْتِیْہِ مَنْ یَّشَآءُ ط وَاللّٰہُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ۔ (الحدید - ۲۱)	لائے اللہ پر اور اس کے رسولوں پر یہ فضل اللہ کا ہے۔ دے اس کو جس کو چاہے اور اللہ کا فضل بڑا ہے۔

بلاشبہ کوئی صاحبِ مال صدقہ دیتا ہے تو یہ ایک اچھا کام ہے جس پر قیامت کے دن اجر ملے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ پہلا کام تو اس ذات کا ہی ہے جس نے اسے مال عطا کیا اور اسے اپنی راہ میں خرچ کرنے کی صلاحیت دی۔

بندہ کی نیت اور اس کا عمل قادرِ مطلق کے احسان کو پس پشت نہیں ڈال سکتے۔ اسی لیے ہم جو بہت سے کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں ان کی نسبت اللہ تعالیٰ کے احسان کی طرف کرتے ہیں۔

اگر کسی مومن کے دل میں محبت الٰہی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہی ہے جس نے اسے اس نعمت اور شرف سے نوازا۔ کوئی شخص یہ اختیار تو نہیں رکھتا کہ وہ اللہ تعالیٰ پر زبردستی دوستی و محبت تھوپ دے۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس شخص کی قربت ضائع نہیں کرتا ہے جو اس سے محبت کرنا چاہتا ہو تاہم وہ اپنی محبت اپنے چنیدہ بندوں کو اپنے فضل سے عنایت کرتا ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی کو دے گا جو لینے کی کوشش کرے۔ وہ اپنی طرف پھیلے ہوئے ہاتھوں کو ہی نوازے گا۔

جو خود روگردانی کرے اسے تو راندۂ درگاہ اور ذلیل ہی ہونا ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت اسے پہچاننے والوں کے دلوں میں نشو و نما پاتی ہے۔

یہ معرفت جس طرح ذکر و فکر اور غور و خوض کے تعلق سے انسانی جد و جہد سے حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کے جمال کی عظمت کے تعلق سے مومنین کی نگاہوں میں جو حقائق خود ذاتِ حق منکشف کرتی ہے ان سے بھی حاصل ہوتی ہے۔ جس قدر یہ حقائق منکشف ہوں گے اسی قدر تعظیم، محبت اور فداکاری بھی ہوگی۔

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ۔ (المائدہ-۵۴)	یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔

یہ نعمت کسبی سے پہلے اللہ تعالیٰ کے جود وکرم کا احسان ہوتی ہے۔

آپ سوال کر سکتے ہیں کہ ایسا کیسے؟ کیا یہ بات لوگوں کو مایوسی کی طرف نہیں لے جائے گی۔

جواب ہے: ہر گز نہیں۔ لیکن اس کی مزید تشریح درکار ہوگی۔

انسان کی بلند صلاحیتیں اصلاً انسان کی اپنی پیدا کردہ نہیں ہوتیں بلکہ ان کی فطری استعداد قدرتی طور پر پہلے سے ہوتی ہے۔

جتنے ممتاز اور عبقری انسان گزرے ہیں ان کی عظمت کا سرچشمہ اصلاً ان میں فطرت کی عطا کردہ فکری ونفسیاتی صلاحیتیں ہوتی ہیں جو دوسروں میں نہیں ہوتیں پھر وہ ان صلاحیتوں کو آگے پروان چڑھاتے ہیں۔

پھر قدرتی صلاحیتوں کے ساتھ ماحول کا فرق بھی ہوتا ہے کسی ماحول میں فطری صلاحیتیں دب کر رہ جاتی ہیں اور کسی ماحول میں ان کو اور جِلا ملتی ہے۔

یعنی ہمارے محدود ارادہ کے بجائے قدرت کی کارفرمائی ہے۔

اسی طرح ایمان بھی ایک نعمت ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم ایسی جگہ پیدا ہوتے جہاں ایمان اور کتابِ الٰہی کے بارے میں کچھ جان ہی نہ پاتے۔

اور اگر اسی حالت میں موت آجاتی تو اللہ تعالیٰ ہمارے ساتھ اپنے قانونِ عدل کے ساتھ معاملہ فرماتا، یعنی ہمیں بس عذاب نہ دیتا۔

مستقل نعمت کے اہل بننے کے لیے یقین وصلاح وفلاح اور جدّ وجہد ضروری ہے اور یہ سب کسی ماحول میں ممکن ہے کسی میں نہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ ایمان کی توفیق کو اپنا فضل قرار دیتا ہے۔

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ لا اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا	دوڑو اپنے رب کی معافی کی طرف کو اور بہشت کو جس کا پھیلاؤ ہے جیسے پھیلاؤ آسمان اور زمین کا تیار رکھی ہے واسطے ان کے جو یقین

اس جذباتی کشمکش کے نتیجہ پر ہی ایمان کے انجام کا دارومدار ہو گا۔ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت غالب آتی ہے تو کامیابی ہے ورنہ نامرادی۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ؑ (التوبہ - ۲۴)

تو کہہ دے اگر تمہارے باپ اور بیٹے اور بھائی اور عورتیں اور برادری اور مال جو تم نے کمائے ہیں اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور حویلیاں جن کو پسند کرتے ہو تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور لڑنے سے اس کی راہ میں تو انتظار کرو یہاں تک کہ بھیجے اللہ اپنا حکم اور اللہ رستہ نہیں دیتا نافرمان لوگوں کو۔

درحقیقت بہت سی چیزوں کی محبت ہی انسان کو بہت سے فرائض سے غافل کرتی ہے خاص طور پر جب کوئی خواہش اس کے ذہن پر چھا جائے اور اس کی فکری صلاحیت کو متاثر کر دے تو وہ اپنے فیصلوں اور اعمال میں توازن کھو دے گا۔ بلکہ کبھی تو عمر دراز ہونے کے باوجود بچوں کی سطح تک گر جائے گا کیونکہ بچے بے سوچے سمجھے اپنی خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں۔

پرانی مثل ہے کہ: کسی چیز کی محبت اندھا کر دیتی ہے۔

کتنے ایسے آدمی ہوتے ہیں جن کی مال و دولت، تعریف و ثنا خوانی اور اہل و عیال کے درمیان آرام سے رہنے کی خواہش و محبت انھیں بڑے کام انجام دینے سے روک دیتی ہے اور وہ جان و مال سے حق کی حمایت و مدد کرنے سے رہ جاتے ہیں۔

اسی لیے انسان کا سب سے خوفناک دشمن اس کا اپنا نفس ہوتا ہے اور جب وہ اہل و عیال کے ساتھ زندگی گزارنے ہی کو ترجیح دیتا ہے اور فرض کی پکار سے کان بند کر لیتا ہے تو اہل و عیال بھی انجام کار اس کے دشمن ہی ثابت ہوتے ہیں۔ یہی اس آیت کا مطلب ہے کہ:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ (التغابن ۱۴)

اے ایمان والو تمہاری بعض بیویاں اور اولاد دشمن ہیں تمہارے۔ سو ان سے بچتے رہو۔

تمام انسان کچھ چیزوں سے محبت رکھتے ہیں اور ان کی سیرت و کردار پر اس محبت کی چھاپ ہوتی ہے اور ان کے اقوال و افعال میں ان کی جھلک نظر آتی ہے۔

کسی خاص چیز کی طرف انسان کا جھکاؤ، اگر عادۃً یا ضرورۃً ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ بشرطیکہ مشروع حدود کے اندر ہو۔

لیکن یہ جائز نہیں ہو سکتا ہے کہ یہ جھکاؤ انسان پر اس طرح غالب آجائے کہ اس کے تصرفات پر چھا جائے اور دوسری چیزوں سے اسے بیگانہ کر دے۔

جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرے گا وہ اس کے مقابلہ میں کسی اور کو ترجیح نہیں دے گا۔ جب انسان پر غلبہ اور اس کی سمتِ سفر اور طرزِ عمل تعین کرنے کے لیے مختلف احساسات میں کشمکش ہو، تب تو لازم ہے کہ ہر جذبہ کو پسِ پشت ڈال کر فیصلہ کن انداز میں اللہ تعالیٰ کی طرف مائل ہو جائے۔

ہم عام زندگی میں دیکھتے ہیں کہ بہت سے لوگ مختلف اصولوں، اشخاص اور چیزوں سے تعلق رکھتے ہیں اور یہ تعلق اور میلان ان کے طرزِ زندگی، اوقات کے استعمال اور خاص و عام فیصلے کرنے میں اثر انداز ہوتا ہے۔

اس طویل نفسیاتی کشمکش ہی میں اپنے رب کی طرف انسان کے میلان کی قدر و قیمت متعین ہو سکتی ہے۔

یہ لازم ہے کہ اپنے رب سے انسان کی محبت ہر دوسرے جذبہ سے زیادہ طاقتور ہو۔

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ط	اور بعضے لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو ان کی محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی اور ایمان والوں کو اس سے زیادہ تر ہے محبت اللہ کی۔
(البقرۃ ۱۶۵)	

یہ چیز اس وقت زیادہ واضح ہو جاتی ہے جب انسان کے دل میں دو متضاد احساسات باہم ٹکرائیں۔ مثلاً ایک طرف اس کے دل میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ گھر میں آرام کرنے کی خواہش موجیں لے رہی ہو دوسری طرف فرض پکار رہا ہو کہ وہ یہ سب چھوڑ کر میدانِ جہاد میں پہنچ جائے۔ اور اپنی جان اور خواہشات کو داؤ پر لگا دے۔

رُک جانے سے بلب نہ جل سکے۔

ظاہر ہے انسان اپنے آپ سے محبت کرتا ہے اور اس کی ضرورتوں کا لحاظ رکھتا ہے۔ لیکن کبھی ایسے مرض میں گرفتار ہو جاتا ہے جس سے زندگی میں خطرہ پڑ جائے۔ ڈاکٹر اسے کوئی عادت ترک کرنے کا مشورہ دیتا ہے تاکہ مرض دُور ہو جائے لیکن وہ اس مشورہ پر عمل نہیں کر پاتا اور مرض اپنا کام کر جاتا ہے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس آدمی کو اپنے آپ سے نفرت تھی۔ یہی کہا جائے گا کہ اس عادت کے اثرات نے اس کی قوتِ ارادی مفلوج کر رکھی تھی۔

بعض گناہ گار مومن نہ اپنے رب سے نفرت کرتے ہیں نہ اپنے آپ سے لیکن وہ اس طرح کی بیماری کی حالتوں کے زیرِ اثر گناہ میں پڑ جاتے ہیں۔

بلاشبہ گناہوں کا ارتکاب کرتے وقت وہ مکمل ذہنی صحت کی حالت میں نہیں ہوتے ان کی مثال اس شخص کی ہوتی ہے جو تھکن سے چور چور ہو کر رات میں بھی نیند سے محروم رہ جائے اس کی سوچ صحیح فکر کے بجائے پریشان خوابوں کی سی ہوگی۔

○

آیئے محبت کے نتائج چھوڑ کر پہلے اس کے اسباب پر گفتگو کریں۔

ہم اللہ تعالیٰ سے محبت کیوں کرتے ہیں یا یہ کہ ہمیں کس لیے اس سے محبت کرنی چاہیے؟

غور و فکر سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ محبت کیے جانے کے لائق ہے اور اس محبت سے کہیں زیادہ جتنی محبت باپ اپنی اولاد سے یا انسان اپنے آپ سے کرتا ہے۔

انسان پر اللہ تعالیٰ کے جتنے احسانات ہیں وہ انسان کو اپنے محسن کے ساتھ ٹھوس دلی روابط سے مربوط کرتے ہیں۔ انسان جتنی نعمتوں سے بہرہ مند ہے وہ ساری کی ساری اللہ تعالیٰ ہی کی عطا کردہ تو ہیں۔

وَمَا بِكُم مِّن نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللَّهِ ثُمَّ إِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فَإِلَيْهِ تَجْأَرُونَ ○ (النحل ۵۳)	تم کو جو بھی نعمت حاصل ہے اللہ کی ہی طرف سے ہے پھر جب کوئی سخت وقت تم پر آتا ہے تو تم لوگ اپنی فریادیں لے کر اس کی طرف دوڑتے ہو۔

یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے اہل وعیال اور اہلِ خاندان کے ساتھ نرمی ومحبت کا معاملہ کرے۔ لیکن یہ چیز اسے فرض کی ادائگی سے نہ روکے۔

وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (التغابن ۱۴-۱۵)

اور اگر تم عفو ودرگزر سے کام لو اور معاف کردو تو اللہ غفور رحیم ہے۔

پھر بیٹھ رہنے کے خلاف انتباہ دیا گیا:

اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (التغابن ۱۵)

تمہارے مال اور تمہاری اولاد تو ایک آزمائش ہیں اور اللہ ہی ہے جس کے پاس بڑا اجر ہے۔

اللہ تعالیٰ کی محبت کا تقاضا ہے کہ انسان اس کے حکم کی فرمانبرداری کرے، اس نے جس چیز سے منع فرمایا ہے۔ اسے چھوڑ دے اور اس کی خوشنودی کے حصول کے لیے کوشاں رہے۔ جب انسان کے اندر یہ جذبہ پیدا ہو جائے گا تو وہ اللہ تعالیٰ کے لیے بہت سے عمل کر کے بھی تکان محسوس نہیں کرے گا کیونکہ اس کے دل کا جذبہ بہت سی مشقتوں کو اس کے لیے آسان بنا دے گا۔

اللہ تعالیٰ کے حقوق کی پامالی اور اس کے رسولؐ کی پیروی کی بے قدری کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے محبت کا دعویٰ باطل ہے کیونکہ جو اللہ تعالیٰ سے محبت کرے گا وہ اس کے رسولؐ کی ہر معاملہ میں اطاعت کرے گا۔

قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ؕ (آل عمران - ۳۱)

اے نبیؐ لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔

محبت کرنے والا تو اپنے محبوب کے ہر حکم کی اطاعت ہی نہیں کرتا بلکہ چاہتا ہے کہ وہ اسے کوئی حکم دے تاکہ وہ شوق کے ساتھ اسے انجام دے۔

ہاں، انسان کبھی ایسی بیماری کی حالت سے دوچار ہو جاتا ہے جب اس کا طرزِ عمل متاثر ہو جاتا ہے اور وہ اس جذبہ کی تکمیل نہیں کر پاتا جیسے کہیں بجلی کا کرنٹ منقطع ہو جائے اور بجلی

رِزْقًا لَّكُمْ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْفُلْكَ لِتَجْرِيَ فِي الْبَحْرِ بِأَمْرِهِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ الْأَنْهَارَ ۚ وَسَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ دَائِبَيْنِ ۖ وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ ۚ وَآتَاكُم مِّن كُلِّ مَا سَأَلْتُمُوهُ ۚ وَإِن تَعُدُّوا نِعْمَتَ اللَّهِ لَا تُحْصُوهَا ۗ إِنَّ الْإِنسَانَ لَظَلُومٌ كَفَّارٌ ۚ

(ابراھیم ۳۲-۳۴)

طرح کے پھل پیدا کیے جس نے تمہارے لیے کشتی کو مسخر کیا کہ سمندر میں اس کے حکم سے چلے اور دریاؤں کو تمہارے لیے مسخر کیا جس نے سورج چاند کو تمہارے لیے مسخر کیا کہ لگاتار چلے جا رہے ہیں اور رات دن کو تمہارے لیے مسخر کیا جس نے وہ سب کچھ تمہیں دیا جو تم نے مانگا اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان بڑا ہی بے انصاف اور ناشکرا ہے۔

حسنِ سلوک شکر کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ یہ احساس تھوڑی مدت کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور طویل مدت کے لیے بھی۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اور حالتیں بدلتے رہنے کے باوجود بار بار احسان محبت پیدا کرتا ہے اور محبت ایسا جذبہ ہے جو دل کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے اور طرزِ عمل میں اس کے اثرات نمایاں ہو جاتے ہیں۔

اب جو احسان کو مانے اس پر بار بار مزید احسان کا ہونا بالکل ظاہر ہے۔

انسان بسا اوقات بہترین نعمتوں کا احساس کرتا ہے لیکن جلد ہی یہ احساس دھندلا پڑ جاتا ہے۔ اس کے باوجود اللہ تعالیٰ اس شخص سے اپنا فضل نہیں روکتا جو پچھلے احسان کو بھول کر پھر دستِ طلب آگے بڑھاتا ہے۔

انسانی فطرت کے اس پہلو کی قرآن کریم نے متعدد جگہ تصویر کشی کی ہے جس سے عیاں ہو جاتا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ تمام تر محبت کے لائق اور انسان تمام تر ملامت کے لائق ہے۔

بار بار کے احسانات اور نوازش اور پھر شکر و ثنا خوانی نیز محبت و وفاداری کے استحقاق کے باوجود انسان کس طرح بھولتا ہے اس آیت میں پڑھیے۔

وَإِذَا مَسَّكُمُ الضُّرُّ فِي الْبَحْرِ ضَلَّ مَن تَدْعُونَ إِلَّا إِيَّاهُ ۖ

جب سمندر میں تم پر مصیبت آتی ہے تو اس ایک کے سوا دوسرے جن جن کو تم پکارا کرتے

یہ الہٰی نعمتیں انسان پر ہر پہلو سے چھائی ہوئی ہیں لیکن انسان اپنے رب کے ساتھ وہ معاملہ کرتا ہے جو نافرمان اولاد اپنے باپ کے ساتھ کرتی ہے۔ اولاد کی کوئی خواہش پوری نہ ہو تو وہ تنگ دلی محسوس کرتی ہے اور وہ سارے احسانات بھولنے لگتی ہے جن کے بغیر خود اس کا وجود و بقا خطرہ میں پڑ جاتے۔

اگر اللہ تعالیٰ انسان کی ہر خواہش پوری کرنے لگے تو انسان ہلاکت میں جا پڑے۔ میں خود اپنے طویل تجربات کی بنا پر یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ جن چیزوں سے میں تنگدلی محسوس کرتا تھا یا جو میرے شان و گمان میں نہیں تھیں انھیں کا میری شخصیت کی تکمیل میں سب سے زیادہ اہم رول رہا ہے۔

اگر حالات میری خواہش کے مطابق چلتے رہتے تو میں ایک رائگاں آدمی ہوتا، اور اگر میری ساری خواہشیں پوری کر دی گئی ہوتیں تو میں برباد ہو گیا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ نے کتنی سچی بات فرمائی ہے۔

وَعَسٰۤى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰۤى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ ۲۱۶)

ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں ناگوار ہو اور وہی تمہارے لیے بہتر ہو، اور ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند ہو اور وہی تمہارے لیے بری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

اگر انسان سمجھ سے کام لے تو آسائش و آزمائش دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ سے اس کی محبت یکساں رہے۔ کیونکہ انسان خود اپنے بارے میں جو اندازہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ کی تقدیر اس کے لیے زیادہ مناسب ہوتی ہے۔

پھر انسان ایک وسیع کائنات میں رہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں کے بغیر انسان کا وجود اس میں برقرار نہیں رہ سکتا۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ

اللہ وہی تو ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعہ سے تمہاری رزق رسانی کے لیے طرح

جَانِبَ الْبَرِّ اَوْ يُرْسِلَ عَلَيْكُمْ حَاصِبًا ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ وَكِيْلًا ۝ اَمْ اَمِنْتُمْ اَنْ يُّعِيْدَكُمْ فِيْهِ تَارَةً اُخْرٰى فَيُرْسِلَ عَلَيْكُمْ قَاصِفًا مِّنَ الرِّيْحِ فَيُغْرِقَكُمْ بِمَا كَفَرْتُمْ ثُمَّ لَا تَجِدُوْا لَكُمْ عَلَيْنَا بِهٖ تَبِيْعًا ۝

(الاسراء ۶۸ - ۶۹)

ہو کہ خدا کبھی خشکی پر ہی تم کو زمین میں دھنسا دے یا تم پر پتھراؤ کرنے والی آندھی بھیج دے اور تم اس سے بچانے والا کوئی حمایتی نہ پاؤ؟ اور کیا تمہیں اس کا اندیشہ نہیں کہ خدا پھر کسی وقت تم کو سمندر لے جائے اور تمہاری ناشکری کے بدلے تم پر سخت طوفانی ہوا بھیج کر تمہیں غرق کر دے تو ایسا کوئی نہ ملے جو اس سے تمہارے اس انجام کی پوچھ گچھ کر سکے؟

انسان مختلف پیچیدگیوں کے شکنجوں میں پڑ جاتا ہے جب گھبرا تنگ ہو جاتا ہے تب وہ اللہ تعالیٰ سے آہ و زاری کرنے لگتا ہے اور جیسے ہی وہ شکنجے ٹوٹتے ہیں اور اسے آزادی ملتی ہے وہ سب کچھ فراموش کر کے سرکشی پر آمادہ ہو جاتا ہے۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۝

(الانعام ۶۳ - ۶۴)

اے نبیؐ ان سے پوچھو، کہ صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں کون تمہیں خطرات سے بچاتا ہے؟ کون ہے جس سے تم (مصیبت کے وقت) گڑگڑا گڑگڑا کر چپکے چپکے دعائیں مانگتے ہو کس سے کہتے ہو کہ اگر اس بلا سے اس نے ہم کو بچا لیا تو ضرور شکر گزار ہوں گے کہو اللہ تمہیں اس سے اور ہر تکلیف سے نجات دیتا ہے پھر تم دوسروں کو اس کا شریک ٹھہراتے ہو۔

درحقیقت مسلسل اور بار بار عطا ہونے والی نعمتوں کے تعلق سے انسانوں کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔

ایک قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جو بے حس دل رکھتے ہیں ان کے لیے رنج و خوشی

فَلَمَّا نَجّٰكُمْ اِلَى الْبَرِّ اَعْرَضْتُمْ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا۔ (الاسراء ۶۷)

تھے وہ سب گم ہو جاتے ہیں مگر جب وہ تم کو بچا کر خشکی پر پہنچا دیتا ہے تو تم اس سے منہ موڑ جاتے ہو انسان واقعی بڑا ناشکرا ہے۔

جب انسان مشکلات میں گھر جاتا ہے تب وہ اپنے رب کی پناہ لیتا ہے۔ اور جب مطلوبہ مدد مل جاتی ہے اور اس کی جان بچ جاتی ہے تب وہ پھر اپنے پہلے طرزِ عمل کی طرف لوٹ جاتا ہے اور غفلت کی وہی زندگی پھر شروع کر دیتا ہے جس سے ان مشکلات کے ذریعہ اسے نکالنا مطلوب تھا۔

اکثر تکلیفیں انسان کے لیے اس کے اندر مخفی امراض کی دوا بن کر آتی ہیں۔ اور ان کی تلخیوں کو جھیلنا اس شخص کے لیے، جو فائدہ اٹھانا اور خوابِ غفلت سے بیدار ہونا جانتا ہو، شفا کا ذریعہ ہوتی ہیں۔

اگر خوشحالی انسانی وجود کے لیے غذا کی حیثیت رکھتی ہے تو پریشاں حالی ایک ناگزیر دوا ہے۔

ہم اپنی عام زندگی میں جس طرح مختلف قسم کی غذاؤں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اسی طرح مختلف قسم کی دواؤں کے بھی۔ دونوں کی اپنی اپنی جگہ اور اپنا اپنا کردار ہوتا ہے۔ پھر انسانی بدن کو لاحق ہونے والے امراض کے علاج سے کہیں زیادہ انسانی دل کو لاحق امراض اور اپنے رب سے اس کا تعلق پراگندہ کرنے والی آفات کا علاج ضروری ہو جاتا ہے۔

لیکن تکلیفوں کے تجربہ سے گزرتے ہوئے انسان کا موقف عجیب و غریب ہوتا ہے۔ وہ تیزی سے حق کی طرف لوٹتا ہے اور اپنے رب سے درگزر اور رحم طلب کرنے لگتا ہے لیکن جیسے ہی اللہ تعالیٰ وہ تکلیف دور کرتا ہے اس کی گریہ وزاری کی آواز مدھم ہونے لگتی ہے یہاں تک کہ بالکل بند ہو جاتی ہے اور وہ پھر سے غفلت میں جا پڑتا ہے اور پھر کبر و سرکشی کی باتیں کرنے لگتا ہے۔

انسان! کیا تجھے یہ ضمانت حاصل ہو گئی ہے کہ مشکلات ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئیں اور تو پھر کبھی ان کا شکار نہیں ہو گا؟

اَفَاَمِنْتُمْ اَنْ يَّخْسِفَ بِكُمْ

اچھا تو کیا تم اس بات سے بالکل بے خوف

ستائش ہے۔

کاغذ پر تصویر بنانے والے مصور سے تو لوگ متاثر ہوتے ہیں لیکن ایسا کیوں ہے کہ اس حقیقی مصور کی طرف ان کا دھیان نہیں جاتا جس نے یہ فضائے محیط بنائی، اس میں عظیم الشان سیارے بنائے، فطری زندگی کی سرگرمیاں پیدا کیں اور سورج اور زمین کو متحرک کیا۔

سورج کے طلوع و غروب اور رات دن کی گردش کیا اس کے لیے کافی نہیں کہ دل آسمانوں اور زمین کے خالق کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس کی عظمت کے آگے سجدہ ریز ہو جائیں جس نے اس عظیم الشان کائنات کی تصویر گری کی ہے۔

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو طلوع و غروب کے وقت مالکِ کائنات کی عظمت کا کلمہ پڑھنے لگتے تھے اور اس سے دعائیں مانگنے لگتے تھے۔

کیا یہ واقعی حیرتناک بات نہیں کہ انسان اگر کسی انسان کا بنایا ہوا کوئی مجسمہ دیکھتا ہے جس میں کچھ ظاہری نقوش ہی ملتے ہیں تو مجسم ساز کی مہارت کی تعریف و تحسین کرنے لگتا ہے اور خود اپنے زندہ جسم کو بنانے والے کی پرواہ بھی نہیں کرتا بلکہ بسا اوقات اس کا انکار ہی کر بیٹھتا ہے؟

ایک پتھر کے مجسمہ کے ظاہری نقوش اور اس زندہ جسم میں کتنا زبردست فرق ہے جس میں ہڈیاں، خون، گوشت اور اعصاب اور رگوں کا ایک لامتناہی اور پیچیدہ ترین سلسلہ ہوتا ہے۔ اور جس کی حسّاسیت کا یہ عالم ہے کہ کہیں ایک معمولی سا کانٹا بھی چبھ جائے تو پورے جسم میں درد کی لہر دوڑ جاتی ہے۔

انسان اگر خود اپنے جسم کی باریکیوں ہی پر غور کرلے تو فرشتوں کی طرح خالقِ کائنات کی حمد و ثنا کرنے لگے۔ لیکن بہت سے انسان ایسے ہیں جو نہ صرف منکر ہیں بلکہ سرکشی پر آمادہ رہتے ہیں۔ جن کے ضمیر سچی معرفت سے منور ہیں وہ تو خالق کی ہمہ گیر عظمت اور اس کی حیرتناک تخلیقات کو دیکھ کر اس کی طرف مائل ہو جاتے ہیں اور اس کی تعظیم و محبت سے ان کے دل بھر جاتے ہیں۔

جبکہ ہم بخوبی جانتے ہیں کہ کسی انسان سے فعلِ حقیقی صادر نہیں ہوتا۔ جس کی بنیاد پر اسے کسی مجسمہ کا خالق یا کسی آلہ کا موجد قرار دیا جائے۔ زیادہ سے زیادہ کسی انسانی ہاتھ نے اتنا ہی

یکساں ہیں۔ گویا انھوں نے کسی مصیبت سے چھٹکارا پانے کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا ہی نہیں کی تھی۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو بھی رنج یا راحت پہنچتی ہے وہ زندگی کا فطری معمول ہے۔

قَدْ مَسَّ اٰبَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَ السَّرَّآءُ (الاعراف ۹۵)

ہمارے اسلاف پر بھی اچھے اور برے دن آتے ہی رہے ہیں۔

یعنی یہ دنیا کا معمول ہے اور زمانہ اسی طرح رواں دواں ہے۔

اس قسم کے لوگ ناشکرے ہیں ان میں کوئی بھلائی نہیں، نہ دین سے انھیں سروکار ہے۔

دوسری قسم کے لوگ ان بے شمار نعمتوں پر غور کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مرحمت ہوتی ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جو نعمتیں مرحمت کر رہا ہے اس کے حق کو سمجھنا اور اس کا لحاظ کرنا چاہیے۔ ان کے دل قدردانی کے جذبے سے بھر جاتے ہیں اور ہر نعمت کے احساس کے ساتھ ان کے دل کھلتے جاتے ہیں۔ یہ مسلسل شعور انھیں اللہ تعالیٰ سے محبت اور اس سے تعلق جوڑنے پر آمادہ کرتا ہے۔

○

محبت کا ایک دوسرا سبب بھی ہوتا ہے، وہ یہ کہ انسان کا دل عظمت کی طرف مائل ہوتا ہے اور عظیم لوگ اسے پسند آتے ہیں اور وہ ان سے محبت کرنے اور ان کے کارناموں کو بنظرِ تحسین دیکھنے کی کوشش کرتا ہے۔

کتنے ہی عبقری لوگ گزرے ہیں جن سے ہم محبت کرتے ہیں اور ان کی امتیازی خصوصیات اور صلاحیتوں کا ہمارے دل و دماغ پر اثر ہے۔ یہ اثر ان سے محبت پر آمادہ کرتا ہے جس طرح ظاہری حسن و جمال عاشقوں کے دل و دماغ پر اثر انداز ہوتا ہے۔

اگر لوگ اس پہلو سے بھی غور کریں تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ان کا معاملہ کچھ اور ہی ہو۔

ایک بار ایک شخص نے مجھے سورج کے غروب ہونے کا منظر دکھایا۔ یہ منظر بڑا خوبصورت لگ رہا تھا۔ پہاڑیوں کی چوٹیوں پر سورج کی الوداعی کرنیں پڑ رہی تھیں اور آسمان پر سرخی سی چھا رہی تھی۔

میں نے کہا یہ ایک خوبصورت تصویر ہے جسے کسی ماہر ہاتھ نے بنایا ہے اور قابلِ

مَـآءً فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهٗ حُطَامًا ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ (الزمر۔ ۲۱)

برسایا پھر اس کو سوتوں چشموں اور دریاؤں کی شکل میں زمین پر جاری کیا، پھر اس پانی کے ذریعہ وہ طرح طرح کی کھیتیاں نکالتا ہے جن کی مختلف قسمیں ہیں پھر وہ کھیتیاں پک کر سوکھ جاتی ہیں پھر تم دیکھتے ہو کہ وہ زرد پڑ گئیں پھر آخر کار اللہ ان کو بھس بنا دیتا ہے درحقیقت اس میں ایک سبق ہے عقل رکھنے والوں کے لیے۔

انسان کو جتنے عظیم کارنامے معلوم ہوں اور جتنے عبقری لوگ اس کے ذہن میں ہوں ان سب کا جائزہ لے پھر مقابلہ کر کے دیکھے کہ ان وقتی صلاحیتوں اور عظمتوں اور خالق کائنات کی دائمی ولامحدود عظمتوں کے درمیان کتنا بڑا فرق ہے۔ تب وہ صاف سمجھ جائے گا کہ پروردگارِ عالم سب سے زیادہ تعظیم و پسندیدگی اور محبت و قربت کے لائق ہے۔

عقلی طور پر لوگ اس حقیقت میں شک نہیں کرتے لیکن یہ بات ان کے دماغوں سے ان کے دلوں میں منتقل نہیں ہوتی کہ وہ نظریہ کی بجائے شعور و احساس اور پھر طرزِ عمل میں بدل جائے۔

یہ حقیقت ان کے اندر اس طرح داخل ہوتی ہے جیسے معدہ کی خرابی والے پیٹ میں کھانا داخل ہو جو جسم میں طاقت و چستی پیدا کرنے کے بجائے بسا اوقات مہلک ہی بن جائے۔

انسان اللہ تعالیٰ کے بارے میں جتنا جانتا ہے اس سے اس کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت راسخ ہو جانی چاہیے۔ لیکن وہ غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے (دلالت کرنے والے ان کھلے کھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی)

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ

کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ اللہ کے سوا دوسروں کو اس کا ہمسر اور مدِّمقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسے کہ اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے حالانکہ اہلِ ایمان سب سے

تو کیا ہے کہ کسی موجود مادہ میں حرکت پیدا کر دی۔ اور موجود چیزوں کو جوڑ دیا۔ پھر اس کی صلاحیت پیدا کرنے والا بھی تو خالق حقیقی ہی ہے۔

کچھ دنوں پہلے ایک موجد نے ایک ایسا آلہ بنایا جس سے کھارے پانی کو صاف کر کے میٹھا بنایا جا سکتا ہے بلاشبہ یہ ایک اچھی ایجاد ہے جس سے بہت فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

لیکن وہ آلات کون سے ہیں جو ہزارہا مخلوقات کو میٹھا پانی فراہم کرتے ہیں اور وسیع آراضی کو سیراب کر کے قابل پیداوار بناتے ہیں؟

اَللّٰهُ الَّذِيْ يُرْسِلُ الرِّيٰحَ فَتُثِيْرُ سَحَابًا فَيَبْسُطُهٗ فِي السَّمَآءِ كَيْفَ يَشَآءُ وَيَجْعَلُهٗ كِسَفًا فَتَرَى الْوَدْقَ يَخْرُجُ مِنْ خِلٰلِهٖ ۚ فَاِذَآ اَصَابَ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْهِمْ مِّنْ قَبْلِهٖ لَمُبْلِسِيْنَ ۝ فَانْظُرْ اِلٰٓى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَيْفَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝

(الروم ۴۸ - ۵۰)

اللہ ہی ہے جو ہواؤں کو بھیجتا ہے اور وہ بادل اٹھاتی ہیں پھر وہ ان بادلوں کو آسمان پر پھیلاتا ہے جس طرح چاہتا ہے اور انھیں ٹکڑیوں میں تقسیم کرتا ہے پھر تو دیکھتا ہے کہ بارش کے قطرے بادل میں سے ٹپکے چلے آتے ہیں۔ یہ بارش جب وہ اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے برساتا ہے تو یکایک وہ خوش و خرم ہو جاتے ہیں حالانکہ ان کے نزول سے پہلے وہ مایوس ہو رہے تھے، دیکھو اللہ کی رحمت کے اثرات کہ مردہ پڑی ہوئی زمین کو وہ کس طرح جِلا دیتا ہے۔ یقیناً وہ مُردوں کو زندگی بخشنے والا ہے اور ہر چیز پر قادر ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اتنے وسیع پیمانہ پر انسان کو میٹھا پانی فراہم کرنا، کھارے سمندر کے پانی کو بھاپ بنا کر اڑانا، اور پھر میٹھے پانی کی صورت میں بادلوں سے برسانا، یہ سب کچھ دل میں خالقِ کائنات کی عظمت جاگزیں کرنے کے لیے کافی ہے۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ

کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ نے آسمان سے پانی

پڑھتا ہے تو محض جان کر ہی اس کے دل میں تحسین وتعریف اور محبت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

آپ ایسے اشخاص کا تصور کیجئے جو سب سے زیادہ طاقتور، سب سے وسیع بادشاہت والے، سب سے زیادہ لوگوں کو مغلوب کرنے والے، نفسیاتی برائیوں پر سب سے زیادہ قابو پانے والے اور سب سے ماہر پالیسی ساز ہوئے ہوں۔ ان کی صلاحیت کی انتہا کہاں تک ہے؟

زیادہ سے زیادہ یہی ناکہ کوئی شخص کسی معاملہ میں دوسروں سے زیادہ قدرت وصلاحیت رکھتا تھا۔ لیکن اس کے باوجود وہ خود اپنی زندگی وموت اور نفع وضرر کا مالک بھی نہیں تھا بلکہ یہ بھی قدرت نہیں رکھتا تھا کہ وہ اپنی آنکھوں کو اندھے پن سے، اپنی زبان کو گونگے پن سے، اپنے کانوں کو بہرے پن سے اور اپنے بدن کو امراض سے ہی بچا سکے چہ جائیکہ وہ آسمانوں اور ان کے سیاروں اور ستاروں اور زمین اور اس کے پہاڑوں، سمندروں، ہواؤں، بجلیوں، معدنیات ونباتات وحیوانات وغیرہ سے متعلق امور میں کوئی تصرف کر سکے۔ ان کے ایک ذرّہ پر بھی اسے کوئی قدرت حاصل نہیں۔

پھر اسے جتنی قدرت حاصل بھی ہے وہ خود اس کی اپنی ذاتی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ ہوتی ہے جو اس کے اسباب مہیا فرماتا ہے۔

آپ نے دیکھا! اگر ایک مچھر بھی اپنے وقت کے سب سے بڑے بادشاہ کے اوپر مسلّط کر دیا جائے تو وہ اسے ہلاک ہی کر کے چھوڑتا ہے۔ بندہ کو جو بھی قدرت حاصل ہوتی ہے وہ اس کے مولیٰ ہی کی نوازش ہوتی ہے جیسا کہ اپنے وقت کے سب سے بڑے بادشاہ ذوالقرنین کے بارے میں فرمایا:

اِنَّا مَكَّنَّا لَهٗ فِی الْاَرْضِ (الکہف ۸۴)
ہم نے اس کو زمین میں اقتدار عطا کر رکھا تھا۔

یعنی ان کی ساری سلطنت زمین کے ایک حصّہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ بادشاہت کی سوا کچھ نہیں تھی۔

پھر یہ زمین پوری کائنات کا ایک چھوٹا سا حصّہ ہے اور وہ بھی اللہ تعالیٰ ہی کی مرہونِ منت ہے۔

اب کیا یہ عجیب بات نہیں ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی بندہ سے تو اس کی

(البقرہ ۱۶۵) زیادہ اللہ کو محبوب رکھتے ہیں۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

"تمام اولین و آخرین کے علم کا مقابلہ اللہ تعالیٰ کے علم کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا علم اتنا زبردست و محیط ہے کہ آسمانوں اور زمین کا ایک ذرّہ بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں۔ وہ خود تمام مخلوقات کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَمَا اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ مگر تم لوگوں نے علم سے کم ہی حصّہ پایا ہے۔

(بنی اسرائیل ۸۵)

بلکہ ایک چیونٹی یا مچھر تک کی تخلیق کی جو تفاصیل ہو سکتی ہیں ان کی حکمت کا علم بھی آسمان و زمین کی تمام مخلوقات کو مل کر بھی نہیں ہو سکتا۔

وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖٓ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۔ اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کی گرفت ادراک میں نہیں آسکتی اِلّا یہ کہ وہ کسی چیز کا علم خود ہی ان کو دینا چاہیے۔

(البقرہ - ۲۵۵)

اور جو تھوڑا بہت علم مخلوقات کو حاصل ہوتا ہے وہ بھی اللہ تعالیٰ کے بتانے سے ہی ہو پاتا ہے۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ۝ (الرحمٰن ۳-۴) اسی نے انسان کو پیدا کیا اور بولنا سکھایا۔

اگر علم کا حسن اور اس کی عزّت قابلِ قدر چیزیں ہیں اور علم خود صاحبِ علم کو زینت و کمال بخشتا ہے تو اس سبب سے تو صرف اللہ تعالیٰ ہی سے محبّت لازمی ہے کیونکہ تمام اہلِ علم کے سارے علوم اللہ تعالیٰ کے علم کے مقابلہ میں بے علمی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر سب سے بڑے ذی علم کی محبت کیسے لازم نہ ہوگی کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم اور مخلوقات میں سب سے زیادہ ذی علم میں وہی نسبت ہے جو سب سے زیادہ علم رکھنے والے اور سب سے زیادہ ناواقف کے درمیان ہو سکتی ہے۔ مخلوق کا علم تو محدود ہی ہو سکتا ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کا علم لامحدود ہے۔

اسی طرح قدرت و صلاحیت کی صفت ہے، اس میں بھی کمال محبوب اور نقص غیر محبوب چیز ہے یہاں تک کہ انسان جب حضرت علیؓ و حضرت خالدؓ وغیرہ بہادروں کی حکایات

اِسلامی تصوّف

اسلامی تصوف کے تین بنیادی عناصر ہیں:

۱۔ نظریاتی ایمان کو گہرے قلبی شعور تک پہنچانا اور اسے ذہنی تصوّر سے متحرک و حساس دل میں بدلنا۔

۲۔ الٰہی نسبت کی روشنی میں نفس کو سنوارنا تاکہ وہ درجۂ کمال تک پہنچ کر بندگی کے لائق ہو جائے۔ یعنی یہ کہ انسان فضائل کا جامع اور رذائل سے پاک صاف ہو جائے تاکہ وہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی و رضامندی کے قابل ہو سکے۔

۳۔ زندگی کے اس چھوٹے سے وجود کو اس بڑے وجود کا حصّہ سمجھنا جو موت کے بعد تک پھیلا ہوا ہے۔ تاکہ دنیا سے دھوکہ میں مبتلا نہ ہو، اللہ تعالیٰ سے دوری نہ محسوس کرے اور اللہ کی طرف واپسی کے خیال سے تنگ دل نہ ہو۔

یہ تینوں عناصر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ کی سیرت میں بلکہ ہر دَور کے انبیائے کرامؑ اور ان کے حواریوں کی سیرت میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

حقائق کو کسی علمی اصطلاح کا نام دینا کوئی غیر معروف چیز نہیں۔

جاہلی دَور میں اور پھر اسلام کے ابتدائی دور میں علم عروض کو کوئی جانتا بھی نہیں تھا۔ باذوق لوگوں نے فطری موسیقی کے سہارے اشعار کہے۔ بعد کے لوگوں نے اس کے اسرار و رموز کا پتہ لگایا تو بحریں اور اوزان معرض وجود میں آئے۔

بادشاہت، اقتدار اور قدرت وصلاحیت کے لیے محبت کی جائے اور اللہ تعالیٰ سے نہ کی جائے جس کے بغیر کوئی پتہ نہیں ہل سکتا، جو جبار و قاہر اور علیم و قادر ہے، آسمان و زمین اس کی مٹھی میں ہیں اور تمام مخلوقات اس کے حکم کے دائرہ سے باہر نہیں۔ اگر وہ سب کو ہلاک کر دے تب بھی اس کی سلطنت میں ایک ذرہ کی بھی کمی نہ پیدا ہو۔ اور اگر وہ ہزار بار اس طرح کی مخلوقات پیدا کرے تو اسے کوئی تکان نہ ہو۔ قدرت و حسن، عظمت و کبریا اور غلبہ و اقتدار اسی کی صفات ہیں اگر انسان کسی قدرت کی وجہ سے کسی سے محبت کرتا ہے تو اصلاً اس محبت کے لائق وہ قادرِ مطلق ہی ہے۔

محبت کے اسباب میں ہر عیب و نقص سے بالاتر ہونا بھی ہے اور یہ صفت اللہ تعالیٰ ہی کے ساتھ خاص ہے۔ ہر مخلوق میں کوئی نہ کوئی نقص اور کمی پائی جاتی ہے۔ انتہائے کمال تو خالق ہی کا ہو سکتا بھی ہے۔ مخلوق تو ایک ناچار بندہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں کوئی خوبی ہوتی بھی ہے تو کسی دوسری مخلوق کے مقابلہ میں مثلاً یہ کہا جائے کہ گھوڑا گدھے سے زیادہ تیز رفتار ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا کوئی مقابل نہیں۔ وہ بے نیاز ہے۔ اسے کسی کی ضرورت نہیں۔ وہ قادر ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے حکم کو کوئی ٹالنے والا نہیں۔ اس کے علم سے آسمانوں اور زمین کا کوئی ذرہ بھی چھوٹ نہیں سکتا۔ اس کے قبضۂ قدرت سے بڑے بڑے سرکش بھی نہیں نکل سکتے۔ وہ ازلی و ابدی ہے۔ وہی ہر چیز کا خالق اور اسے قائم رکھنے والا ہے۔ اس کی صفات بیان کرنے سے زبانیں قاصر ہیں۔ عارفین کی معرفت کی انتہا یہ ہے کہ وہ اپنی عاجزی کا اعتراف کر لیں۔ اس کا وصف بیان کرنا ممکن نہیں جیسا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"کہ تو نے جس طرح اپنی تعریف بیان کی ہے تو ویسا ہی ہے۔ مجھ سے تیری تعریف کیا بیان ہو سکتی ہے"۔

اب کوئی شخص ان صفات و کمالات سے کس طرح آنکھیں پھیر سکتا ہے؟

حضرت عبدالقادر جیلانیؒ "الفتح الربانی" میں فرماتے ہیں :۔
"صوفی وہ ہے جس کا ظاہر و باطن کتاب و سنت کی پیروی کی بدولت پاک و صاف ہو جائے۔"

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں :
"تمام راستے بند ہیں سوائے اس شخص کے لیے جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرے۔ جو قرآن و حدیث کا علم نہیں رکھتا تصوف کی راہ میں بھی اس کی پیروی نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ ہمارا علم اور مسلک دونوں کتاب و سنت کے پابند ہیں۔"

حضرت بایزید بسطامیؒ نے اپنے کسی ساتھی سے کہا :
چلو دیکھیں کہ فلاں شخص جو زہد میں مشہور ہے اور اپنی ولایت کا پرچار کر رہا ہے کیسا ہے۔ ہم گئے۔ جب وہ شخص گھر سے نکل کر مسجد آ رہا تھا تو اس نے قبلہ کی طرف منہ کیے ہوئے تھوکا۔ حضرت بایزید لوٹ پڑے اور اسے سلام تک نہیں کیا۔ فرمایا یہ شخص جب سنت ہی سے آگاہ نہیں تو اور کسی چیز پر کیا بھروسہ کیا جائے۔

حضرت بایزیدؒ ہی فرماتے ہیں کہ :
"اگر تم دیکھو کہ کسی شخص کو بہت سی کرامتیں ملی ہیں یہاں تک کہ وہ ہوا میں اڑتا ہے تب بھی دھوکہ نہ کھاؤ۔ جب تک یہ نہ دیکھ لو کہ وہ امر و نہی اور شریعت کی حدود کی پابندی میں کیسا ہے۔"

حضرت ابوسلیمان دارانیؒ فرماتے ہیں :
صوفیہ کے نکات میں سے کوئی نکتہ کئی دن تک میرے دل میں جاگزیں رہتا ہے۔ لیکن قرآن و سنت کے سچے گواہوں کی شہادت کے بغیر میں اسے نہیں مانتا۔

حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں :
اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والے کی علامت احکام و سنن اور افعال و اخلاق میں اللہ تعالیٰ کے حبیبؐ کی پیروی ہے۔

حضرت بشر حافیؒ کہتے ہیں :

فنِ عروض کے مطالعہ سے شعر تخلیق کیا جاسکتا ہے، نہ ادب کا ملکہ پیدا ہوتا ہے۔ یہ ضرور ہے کہ نومشقوں کو اس سے غلطیوں سے بچنے میں مدد ملتی ہے۔

ہمارے سلفِ صالحین کی زندگیوں میں مذکورہ تینوں عناصر جلوہ گر تھے۔ اگرچہ وہ تصوف کے لفظ سے آشنا بھی نہیں تھے نہ کسی گروہ سے ان کا تعلق تھا۔

یہ حضرات نحو کے قواعد جانے بغیر صحیح اور بہترین گفتگو کرتے تھے، اسی طرح منطق پڑھے بغیر صحیح نتائج اخذ کرتے تھے۔

پھر ضرورت کے مطابق زبان و لغت کے علوم پیدا ہوئے اسی طرح دینی علوم سامنے آئے۔ تصوف علم سے زیادہ طرزِ عمل کی صورت میں سامنے آیا۔

چونکہ اسلام کے سرچشمے معروف تھے یعنی کتاب وسنت اس لیے کوئی بھی اسلامی علم ان سرچشموں سے فیضیاب ہوئے بغیر اور ان کی حدود کی پابندی کیے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ تصوف ایک عام انسانی رجحان کا نام ہے جو بعض لوگوں کی دلی کیفیت کی گہرے ایمان کے ساتھ ہم آہنگی کی ترجمانی کرتا ہے۔

یہ رجحان دیگر مذاہب کے ماننے والوں میں بھی رہا ہے۔

اسلامی تصوّف کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ سے مضبوط تعلق اور اسی کی طرف جھکاؤ پیدا کرتا ہے جس سے عبادت گزار، نماز روزہ کا عاشق، مال خرچ کرنے والا بہترین عادات اختیار کرنے والا، بری باتوں سے اجتناب کرنے والا، حق کی حمایت کے لیے پرجوش، بھلائی کا حکم دینے والا، برائی سے روکنے والا، نفس کے تقاضوں کو پسِ پشت ڈالنے والا، دنیا کی ترغیبات کو پائے حقارت سے ٹھکرانے والا اپنے آپ کو مخلوق کی خدمت و ہدایت کے لیے وقف کرنے والا اور انسانی جذبات کو قابو میں رکھنے والا بنتا ہے۔

دوسری صدی ہجری سے پہلے تصوف کا لفظ معروف نہیں تھا۔ صوفیہ کو زاہد کہا جاتا تھا۔

امام ابو حامد غزالیؒ تصوف کی تعریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

”دل کو اللہ تعالیٰ کے لیے خالی کرنا اور اللہ کے سوا ہر چیز کو حقیر سمجھنا۔“

ہے وہ ایمان کو پختگی و درستگی پر مبنی نظریات کے پہلو بہ پہلو محبت اور نیکی سے بھرپور جذبہ بناتا ہے۔

مکمل اسلام صرف علمی یا اقتصادی نظریہ نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے تعلق سے مجرد تصور کا نام ہے چاہے تخیل اور استدلال کے لحاظ سے وہ نظریہ کتنا ہی صحیح کیوں نہ ہو۔

یہ ایک ایسا دل ہوتا ہے جس کے تالے کھلے ہوئے ہوں، ہر طرف سے کشادگی ہو اور اس میں محبت کا چشمہ ابل رہا ہو۔ یہ دل اپنے پروردگار سے مضبوط تعلق رکھتا ہے۔ اس کی کائنات میں اس کی نشانیاں تلاش کرتا رہتا ہے۔ نیکی کا عاشق اور برائی سے متنفر ہوتا ہے۔ ہر اچھی چیز کا خیر مقدم کرتا ہے۔ اور ہر بری چیز سے گھٹن محسوس کرتا ہے۔

اللہ تعالیٰ صحابہؓ کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتا ہے:

وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۙ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ؕ (الحجرات ۷ - ۸)

مگر اللہ نے تم کو ایمان کی محبت دی اور اس کو تمہارے لیے دل پسند بنا دیا اور کفر و فسق اور نافرمانی سے تم کو متنفر کر دیا۔ ایسے ہی لوگ اللہ کے فضل و احسان سے راست رو ہیں۔

ذہن و فکر کے روشن ہونے اور قلبی ہدایت کے درمیان فرق کرنا دشوار ہے۔ بے شک ایسے لوگ پائے جاتے ہیں جن کے پاس تیز دماغ ہوتا ہے لیکن سیرت و کردار کے اعتبار سے گرے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ لوگ مریض ہوتے ہیں اور مختلف سنگین امراض کا شکار ہوتے ہیں۔

یہ بات فرض کی جاتی ہے کہ جو شخص یہ جانتا ہو کہ آگ کی خاصیت جلانا ہے وہ اسے چھونے سے بچے گا۔

لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ بعض لوگ ایک چیز کو اچھی طرح جانتے ہیں لیکن پھر بھی اس میں اس طرح مبتلا رہتے ہیں جیسے اس کے بارے میں کچھ جانتے ہی نہ ہوں۔

اس طرح کا تضاد ایک طرح کا پاگل پن ہے جو ہر جگہ پایا جاتا ہے البتہ اس طرح

"میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا:
بشر تم جانتے ہو کہ تمہیں اللہ تعالیٰ نے تمہارے ساتھیوں کے درمیان کس وجہ سے بلند فرمایا؟

میں نے عرض کیا: نہیں۔

آپ نے فرمایا: میری سنت کی پیروی، نیکوکاروں کی خدمت، بھائیوں کی خیر خواہی اور میرے ساتھیوں اور اہلِ بیت کی محبت کی وجہ سے۔ اسی چیز نے تمہیں ابرار کی منزل تک پہنچایا۔

حضرت ابوسعید حرازؒ فرماتے ہیں:

"ہر فیضِ باطنی جو ظاہرِ دین کے خلاف ہو، باطل ہے۔"

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ فرماتے ہیں:

"تمام اولیا صرف کتاب وسنت ہی سے رہنمائی حاصل کرتے ہیں اور ان کے ظاہری مفاہیم پر عمل کرتے ہیں۔"

تاہم زمانہ گزرنے کے ساتھ تصوّف میں کچھ ناپسندیدہ چیزیں بھی خلط ملط ہوگئیں انصاف کا تقاضا ہے کہ اس گرد و غبار کو صاف کیا جائے۔

بقیہ دینی علوم میں دل کی تربیت اور انسانی نفس کی جذباتی بیداری پیدا کرنے والی کوئی اور چیز نہیں ہے اور اسلام اس پہلو سے بھی بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

دینی علوم کے بہت سے ماہرین کو میں نے دیکھا ہے کہ ان کے دل ویران ہیں اور ان میں دنیاوی اغراض اور عام خواہشات بھری ہوئی ہیں۔

اس طرح کے لوگوں کے زبانی جمع خرچ سے دین کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ دین کو تو دلوں کو زندہ کر کے اور ان میں خوفِ خدا بھر کر ہی فائدہ پہنچایا جا سکتا ہے۔

اسلام اگرچہ عقل کو بنیادی اہمیت دیتا ہے، خالص تحقیق و جستجو اور بہترین فکر و خیال کا خیر مقدم کرتا ہے اور کائنات کے ساتھ علمی و نظریاتی اعتبار سے مادی و معنوی ربط و تعلق پر ابھارتا ہے تاہم وہ بیدار دل اور زندہ جذبات کے ساتھ مضبوط ترین تعلق قائم کرتا

انسان کیسے آسمانوں اور زمین میں اپنے پروردگار کا مشاہدہ کرنے لگے اور زمان و مکان کے سکون و حرکت میں اس کی تدبیر و کاریگری دیکھنے لگے۔

جب تک ان سوالوں کے صحیح جواب نہ مل جائیں ایمان مکمّل اور بار آور نہیں ہو سکتا۔

ہم جانتے ہیں کہ شرعی علوم نے اسلام کے پیغام کو واضح کرنے اور اس کے حقائق و حدود سے آگاہ کرانے میں بڑی مدد دی ہے لیکن مذکورہ سوالوں پر کس صنفِ علم نے خاطر خواہ توجہ دی؟

میں صوفی نہیں اور نہ یہ پسند کرتا ہوں کہ کسی گروپ کی طرف مجھے منسوب کیا جائے۔

لیکن انصاف کی بات کہنے پر مجبور ہوں کہ عام فقہاء و متکلمین نے اسلامی تعلیمات کے اس پہلو پر کما حقہٗ توجہ نہیں دی۔ جبکہ صوفیہ نے، اپنی غلطیوں کے باوجود، اس موضوع پر کافی گفتگو کی۔

ہمارے فقہاء نے طہارت و وضو کے بارے میں جلدوں پر جلدیں لکھ ڈالیں اگر وہ فقہی دلائل کے ساتھ اس پہلو پر بھی گفتگو کرتے تو کیا برا ہوتا۔

ہمارے متکلمین نے اللہ تعالیٰ کی ذات و صفات کے تعلق سے بہت سی ضروری و غیر ضروری بحثیں کیں لیکن علمی اسلوب میں لوگوں کے دلوں میں اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرنے پر بحث نہیں کی جبکہ یہ چیز اسلام اور اہلِ اسلام کے لیے کہیں زیادہ مفید ہوتی۔

مجھے عناوین سے دلچسپی نہیں موضوع سے دلچسپی ہے۔ مجھے دلچسپی اس بات سے ہے کہ وہ راستہ دکھایا جائے جس سے دلوں میں تقویٰ پیدا ہو، اس دنیا میں ذکرِ الٰہی سے انسیت اور اللہ تعالیٰ سے ملاقات کی تیاری کا جذبہ پیدا ہو اور یہ سب کچھ گہرے شوق، خندہ پیشانی اور روشن بصیرت کے ساتھ ہو۔

مسلمانوں کی روایتی تعلیمات کا سرچشمہ قرآن کریم اور سنتِ رسولؐ ہے۔

انھیں بنیادوں پر دینی علوم کی عمارت بھی کھڑی ہوتی ہے اور زندگی کے علوم و فنون میں بھی انھیں سے رہنمائی حاصل کی جاتی ہے۔

دورِ اول میں اسلامی تعلیمات کے مختلف شعبے ایک ایسی تہذیب قائم کرنے میں کامیاب ہوئے تھے جو مختلف پہلوؤں سے متوازن اور مقاصد کے لحاظ سے بھرپور ہو۔

کے پاگل پن میں مبتلا لوگوں کو پاگل خانوں میں داخل نہیں کیا جاتا۔

انسانی شخصیت کو لاحق ہونے والے امراض بہت سارے ہیں۔

یہ جزوی پاگل پن وہی ہے جس کی طرف قرآن کریم نے بڑے علماء کو مخاطب کرتے ہوئے اشارہ کیا ہے:

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتَابَ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ۔ (البقرہ ۴۴)

تم دوسروں کو تو نیکی کا راستہ اختیار کرنے کو کہتے ہو مگر اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟ حالانکہ تم کتاب کی تلاوت کرتے ہو کیا تم عقل سے بالکل کام نہیں لیتے۔

بے شک فرض یہی کیا جاتا ہے کہ صحیح فکر کے ساتھ عمل بھی صحیح ہونا چاہیے لیکن جب تطبیق کا وقت آتا ہے تو بہت سی رکاوٹیں حائل ہو جاتی ہیں جیسے بجلی کا کرنٹ تار کٹنے یا کسی رکاوٹ کے حائل ہو جانے کی وجہ سے آگے نہ بڑھ سکے۔

دینِ حق ان تمام امراض کا علاج ہے، کیونکہ وہ صحیح رخ پر چلنے والی عقل اور ایک بیدار دل کا ترجمان ہے۔ بے شمار نظریات اور شریفانہ احساسات اور رجحانات کا فقدان قابلِ قبول دینداری نہیں ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صحیح دیندار کیسے پیدا ہو۔

دلوں میں اللہ تعالیٰ کی عظمت و جلال کا احساس اور سپردگی کیسے نشو ونما پائے۔ یقین کو کیسے گہرائیوں میں اُتارا جائے۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت کو ایسے شیریں ذوق میں کیسے تبدیل کیا جائے جو دلوں میں رقت و نرمی پیدا کرے اور اس کو آلودگیوں سے پاک کر دے۔

انسان کے دل میں اپنے پروردگار کا شوق کیسے پیدا کیا جائے کہ وہ اپنے شوق کی بنا پر پروردگار کی اطاعت کرے اور اس کی رضامندی حاصل کرنے کی جستجو میں لگا رہے کیسے اس کے دل میں اتنا ڈر پیدا ہو کہ وہ پروردگار کی نافرمانی سے متنفر ہو جائے۔ اور اس کی ناراضگی سے کانپنے لگے۔

لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ پہلے کے فقہار ومفتی حضرات اور صوفیوں اور زاہدوں کے درمیان چپقلش رہی ہے اور دونوں نے ایک دوسرے سے استفادہ نہیں کیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ روح سے محروم فقہ اور محبت وجذبہ سے خالی دلوں والے علمار سامنے آئے اور علم سے محروم تصوّف اور بدعات وخرافات میں مبتلا عابد وزاہد نظر آئے۔

○

آپ کہہ سکتے ہیں کہ یہ تصویر بالکل صحیح نہیں ہے۔ یہ وہم ہوگا اگر آپ متکلمین وفقہار پر یہ الزام لگائیں کہ انھوں نے تربیت کے میدان میں اور لوگوں کے دلوں میں تقویٰ ومحبتِ الٰہی پیدا کرنے کے تعلق سے کوتاہی برتی اور اس خلا کو صوفیہ نے پُر کیا۔

میرے خیال میں یہاں مزید وضاحت کی ضرورت ہے۔

ہمارے پہلے کے علمار میں علم کی وسعت اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ سچّا تعلق دونوں موجود ہوتا تھا ان سے استفادہ کرنے والی نسلوں نے ان سے دونوں چیزیں ساتھ ساتھ حاصل کیں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ اور دل کی پاکیزگی اور راستہ روشن کرنے والا علم۔

وہ بیک علمار بھی تھے اور مربّی بھی۔

میرا دل محبت وعزت کے جذبہ سے بھر جاتا ہے جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ مثلاً امام بخاریؒ جیسے شخص اپنی کتاب (صحیح بخاری) اس حدیث سے شروع کرتے ہیں کہ:

"اعمال کا دارومدار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کو اسی کا اجر ملے گا جس کی اس نے نیت کی تھی۔"

اور پھر کتاب کا خاتمہ اس حدیث سے کرتے ہیں

"دو کلمے زبان کے لیے ہلکے ہیں لیکن وزن کے اعتبار سے بھاری ہیں۔

سبحان اللہ وبحمدہٖ سبحان اللہ العظیم

اس آغاز اور خاتمہ کے درمیان امام بخاریؒ نے اپنے زبردست علم اور حافظہ کا خزانہ جمع کر دیا۔

امام بخاریؒ کی شہرت عالم حدیث کی ہے لیکن یہ ان پر اور ان جیسے دوسرے ائمہ

نئے دَور میں علوم و فنون کی شاخیں بہت بڑھ گئی ہیں۔

فلسفے ہیں۔ ادب کی اقسام ہیں۔

ریاضی و ہندسہ کے علوم ہیں۔

تربیت و اخلاق کے موضوعات ہیں۔

خاص و عام قوانین و قواعد کی بحثیں ہیں۔

اور ہر میدان میں حقائق و دلائل کے اثبات کا اپنا اپنا اسلوب ہے۔

ان میدانوں سے متعلق کوئی بھی شخص یہ نہیں گمان کر سکتا کہ زندگی کے تعلق سے وہ دوسروں سے زیادہ حق رکھتا ہے اور سب سے بے نیاز رہ سکتا ہے۔

مثلاً قوانین کا معاشرہ میں ایک اہم مقام ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ دنیا وعظ و تربیت سے بے نیاز ہو گئی ہے۔

پھر قانون کے میدان میں دو ماہرین کسی عبارت کے الفاظ و تراکیب پر اختلاف کر سکتے ہیں اور جس میدان کا تعلق حقوق کے اثبات، خون کے تحفظ اور جھگڑے طے کرنے سے ہو۔ اس میں ایسا ہونا فطری بھی ہے۔

لیکن کیا اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ انسان کے معنوی و قلبی پہلوؤں کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی؟

آج کے دور میں ماہرین خلا کے اسرار و رموز کی تحقیق کے ساتھ زمین کی گہرائیوں میں پوشیدہ معدنیات اور ذرّہ کے پھوڑنے تک پہنچ چکے ہیں۔

زندگی ان سارے پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

وَلِكُلٍّ وِجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ

ہر ایک کے لیے ایک رُخ ہے جس کی طرف مڑتا ہے پس تم بھلائیوں کی طرف سبقت کرو۔

(البقرہ ۱۴۸)

علمی تحقیقات میں باہم ہم آہنگی ہونی چاہیے مختلف شعبوں کے درمیان کوئی وجہِ نزاع نہیں ہے۔

تک پہنچانا ہو۔ وہ علم جو ایسے ذہنی و قلبی امراض کا علاج کرے جو انسان کو اس کے پروردگار سے دور رکھتے ہیں اور اس کے دل و دماغ کو گرد آلود کرتے ہیں۔ یا جو عبادات کی حکمت و مقصد کے ساتھ ہم آہنگ کرے۔

اس علم کا نام کیا ہو؟

چاہے اس کا نام تصوّف رکھ لیجیے یا کوئی اور، اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لوگوں کے لیے سب سے بری چیز یہ ہے کہ اطاعتیں اور عبادتیں محض عادات بن کر رہ جائیں اور شعور و احساس کے بغیر ان کی ادائگی کی جائے۔

ایسی حالت میں دینی مراسم کا کوئی خاص نتیجہ بارآور نہیں ہوتا نہ ان سے اخلاق و کردار سدھر پاتے ہیں، نہ مزاج سنور پاتا ہے۔ غفلت و خفتگی کے شکار دل کو زندہ کرنے اور اسے حرارت و جوش سے بھرنے کا کام کیا چیز انجام دے سکتی ہے؟

چھوٹوں اور بڑوں کی امیدوں اور جذبوں کا رخ اللہ تعالیٰ کی طرف پھیرنا نہایت اہم کام ہے اور یہ کام قابلِ احترام فنّی بنیادوں پر ہونا چاہیے۔

آج کے دَور میں علم نفسیات اور انسانی تجربات سے استفادہ کرنا بھی ضروری ہے۔

میرے خیال میں اس طرز کی معرفت و تربیت کی ضرورت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا پہلے تصوّف کے حامیوں اور مخالفین کے درمیان جو اختلاف پیدا ہوا تھا وہ بعض ایسے تصرفات اور اقوال کی بنا پر ہوا تھا جن میں مقررہ اسلامی اصولوں کا پورا لحاظ نہیں کیا گیا تھا۔

میں اعتراف کرتا ہوں کہ مجھے اللہ تعالیٰ سے تعلق جوڑنے میں امام غزالیؒ، ابن جوزیؒ، ابن تیمیہؒ، ابن قیمؒ اور ابن عطاء اللہ سکندریؒ کی تحریروں سے بڑی مدد ملی۔

ان حضرات کے درمیان مشرب کے بعض اختلافات کے باوجود وہی قدر مشترک ہے جس کا ہم اوپر ذکر کر چکے ہیں یعنی کتاب و سنت پر مبنی راستہ جو ایمان و محبت سے دل کو بھر دے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی معیت کا احساس اُجاگر کر دے۔

○

ہمارے دَور کے لوگوں کو زندگی کے فتنوں نے اپنے شکنجوں میں اس طرح جکڑ لیا ہے

پر ظلم ہوگا کہ انھیں آج کی اصطلاح کے مطابق علومِ دین کی محض کسی ایک شاخ کا ماہر قرار دیا جائے۔

میری نگاہ میں امام بخاریؒ تفسیر و حدیث اور فقہ و سیرت وغیرہ تمام اسلامی علوم کے عالم ہیں حدیث کے فن میں ان کی شہرت ان کی امتیازی حیثیت اور کارنامہ کی وجہ سے ہے۔

یہی ان سے پہلے خلفائے راشدینؓ کے بارے میں بھی کہا جاسکتا ہے۔

اور یہی بات آگے چل کر ائمہ اربعہؒ وغیرہ پر بھی صادق آتی ہے۔

حضرت عمرؓ صرف سیاسی شخصیت کا نام نہیں۔ وہ حکمراں بھی ہیں، واعظ بھی، مربی بھی اور فقیہ بھی۔

امام ابو حنیفہؒ صرف فقیہہ ہی نہیں سیاستداں اور اللہ تعالیٰ کی طرف دعوت دینے والے بھی ہیں۔

کتاب وسنت سے ان حضرات کے براہِ راست تعلق کا اثر ان کے ارد گرد کے لوگوں پر ان ساری تعلیمات اور اثرات کی صورت میں پڑتا تھا جن سے ایک باشعور و پختہ کار اور صحیح راستہ پر گامزن اسلامی معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔

وحیِ الٰہی کے ساتھ ان کی روحانی وابستگی اور پیغمبرؐ اسلام سے روشنی و ہدایت حاصل کرنے کی پیہم کوشش نے انھیں اپنے تمام تر علمی و عملی کاموں کے ساتھ رات کے عبادت گزار اور دن کے شہسوار، زندگی کو اپنے سانچے میں ڈھالنے پر زبردست قدرت وصلاحیت رکھنے والے اور اللہ تعالیٰ کے نام پر قیادت و رہنمائی کرنے والے فرشتے بنا دیا تھا۔

اس مرتبہ و مقام پر فائز شخصیات کو آج کی علمی اصطلاحوں کے پیمانے سے ناپا ہی نہیں جاسکتا۔

○

جس طرح طب کی مختلف شاخوں کا مقصد انسانی بدن کا تحفظ ہے اسی طرح کتاب وسنت سے ماخوذ تمام علوم کا مقصد ایمان کے مقاصد کی خدمت ہے۔

ان علوم میں ایک علم یا شعبہ ضرور ایسا ہونا چاہیے جس کا مرکزِ توجہ انسان کو مقامِ احسان

معبود سمجھنے لگا۔

الیکسیس کاریل لکھتا ہے:

"تاریخ میں پہلی بار سائنس کی مدد سے انسانیت خود اپنی مالک ہوئی ہے لیکن کیا ہم اس علم کو اپنی حقیقی مصلحت کے لیے استعمال کرنے پر قادر ہوسکیں گے؟ یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے آپ کو از سرِ نو ڈھالے تا کہ دوبارہ ترقی کر سکے لیکن بغیر تکلیف جھیلے وہ ایسا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ وہ بیک وقت سنگ مرمر بھی ہے اور سنگ تراش بھی۔

اپنے حقیقی چہرہ سے پردہ ہٹانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اپنے مادہ کو خود اپنے ہتھوڑے کی ضربوں سے پاش پاش کر دے۔ لیکن انسان اس راہ کو نہیں اپنائے گا اِلّا یہ کہ ضرورت ہی اسے مجبور کر دے۔ اور یہ اس لیے کہ وہ جب تک خوشحالی، حسن و جمال اور ٹکنالوجی کے پیدا کردہ "میکانکی معجزات" میں گھرا رہے گا وہ خود اپنے نفس کا بندہ برقرار رہے گا۔ اس لیے اسے احساس ہی نہیں ہو گا کہ یہ عمل کتنا ضروری اور فوری اہمیت کا حامل ہے۔ وہ یہ سمجھنے میں ناکام رہے گا کہ وہ زوال کا شکار ہو رہا ہے۔ بلکہ یہ سوال کرے گا کہ اپنی زندگی کے وسائل اور طرزِ فکر میں تبدیلی کی جدّوجہد اس کے لیے کیوں ضروری ہے؟"

ایک دوسرا قلمکار اسی مفہوم کو ان الفاظ میں بیان کرتا ہے:

"بلاشبہ خلا کی طرف انسان کی پیش قدمی کی بات بڑی دلچسپ ہے لیکن ہمارے خیال میں ایک انسان کی اپنے دوسرے انسان بھائی کی طرف ایک قدم بھی پیش رفت کہیں زیادہ دلچسپ اور مؤثر ہوتی۔

پھر اس سب کچھ کے بعد ایک تاریک پہلو اور بھی ہے اور وہ ہے انسانی روح کا مخفی پہلو جس کی تلاش ہم نے شروع ہی نہیں کی۔

یہ بات کتنی افسوس ناک ہے کہ ہم اپنے اس تاریک پہلو کے ساتھ چاند کے روشن حصے پر قدم رکھنے کی کوشش کریں کیونکہ پہلے قافلے کے ساتھ ہی ہم وہاں خوف تعصب اور شک وشبہ کے تحفے بھی لے جائیں گے۔

حق بات تو یہ ہے کہ چاند کے روشن چہرے تک پہنچنے کی تیاری کے ساتھ ہمیں اپنے

کہ کسی بھی دوسری بلند تر چیز کی طرف نگاہ ڈالنے کے دروازے ہی بند سے ہو گئے ہیں۔

اس میں کوئی تعجب کی بات بھی نہیں، اللہ تعالیٰ اپنی کتاب میں ہمیں بتا چکا ہے کہ انسانوں کو اسی رنگ پر پیدا ہی کیا گیا ہے۔ درجۂ کمال تک پہنچنے کے لیے انسان کی آزمائش اس بنیاد پر ہے کہ وہ اپنی طبیعت کو سنوارے اور اس کی باگ ڈور پر اپنا قابو رکھے نہ یہ کہ اس کی خواہشات کے سامنے سپر انداز ہو جائے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ۝ (آل عمران ۔ ۱۴)

لوگوں کے لیے مرغوبات نفس، عورتیں، اولاد سونے، چاندی کے ڈھیر، چیدہ گھوڑے، مویشی اور زرعی زمینیں بڑی خوش آئند بنادی گئی ہیں مگر یہ سب دنیا کی چند روزہ زندگی کے سامان ہیں حقیقت میں جو بہتر ٹھکانہ ہے وہ اللہ کے پاس ہے۔

آج جو چیز پریشان کن ہے وہ یہ ہے کہ علمی و صنعتی میدان میں انسانی عقل نے ایسی زبردست پیش قدمی کرلی ہے جس کی وجہ سے انسان میں تکبر و غرور پیدا ہو گیا ہے۔

لیکن ایک طرف تو عقل نے کامیابی کے ساتھ یہ مراحل طے کیے دوسری طرف دوسری انسانی خصوصیات اپنی پہلی حالت ہی پر جامد رہ گئیں۔

اپنے نیک بھائی کے خلاف ابن آدم میں مہلک حسد ویسا ہی باقی ہے۔ ہاں لاش چھپانے کی طریقہ کے تعلق سے قدیم ناواقفیت اب ذہانت و تجربہ میں بدل گئی ہے۔

آج انسانیت سائنسی ترقی کے بہترین ثمرات کو اپنی ذلیل ترین خواہش کی تکمیل کے لیے استعمال کرنے لگی ہے۔

اے کاش انسان نے ذہنی و قلبی دونوں پہلوؤں سے ترقی کی ہوتی اور کاش اس نے دنیا کی زمام کار ہاتھ میں لیتے وقت آسمان کی طرف نگاہ اٹھانا بھی ضروری سمجھا ہوتا۔

لیکن وہ اس کے بدلے صرف دنیاوی زندگی کو پوجنے لگا، جو کچھ اس سے ماورا ہے اس کا انکار کرنے لگا، اپنے خالق کو نظر انداز کرنے لگا اور روئے زمین پر خود اپنے آپ کو

دی اور کیسے اپنے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں کامیابی حاصل کی۔

فوجیں اپنے نظریات کو عملی مشقوں سے عملی روپ دیتی ہیں۔ مدرسین تعلیم دینے سے پہلے ایسے طریقوں کی تربیت لیتے ہیں جن سے غلطیوں سے بچا جاسکے، اور ان سب کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ آدمی خیالی دنیا سے عملی دنیا میں پہنچ جائے۔

پھر دینداری کے میدان میں یہ کیسی آفت ہے کہ عبادت کے ساتھ جہالت، کم علمی اور تنگ نظری شامل ہو جائے؟

کوتاہ نظر عبادت گزاروں میں بدعات وخرافات کا دَور دَورہ ہوتا ہے اور ان کے دلوں میں غیر ضروری تعصّب وجوش اور بے جا اخلاص پایا جاتا ہے۔ ہوسکتا ہے ایسے لوگ زیادہ پاک دل بھی ہوں لیکن بے علمی کے ساتھ نہ دین درست ہوسکتا ہے نہ کوئی قوم کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہے۔

ایسے لوگوں کا علاج صرف یہی ہے کہ وہ علم حاصل کریں اور ذہن میں وسعتیں پیدا کریں قدیم زمانہ سے اہلِ دین کے ساتھ یہ مصیبت رہی ہے کہ محض اتنا کافی سمجھ لیا جاتا ہے کہ انسان نظریاتی علوم سے آگاہ اور دینی مسائل کی عبارتوں اور ان کی شرحوں سے واقف ہو اور بس۔ جب عملی دنیا میں اسے کسوٹی پر چڑھنا پڑتا ہے تو ایسا لگتا ہے کہ وہ کوئی دوسرا انسان ہے اور اسے کوئی علم حاصل نہیں۔

مرحوم احمد امینؒ نے اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے:

"یہ عجیب بات ہے کہ دنیا کی ہر شئے اپنی فطرت کے مطابق عمل کرتی ہے اور اس کے ظاہر وباطن میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اس کے اعمال ہمیشہ اس کی فطرت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ چاہے وہ جمادات ہوں، نباتات ہوں یا حیوانات۔ سوائے انسان کے کہ وہ دھوکہ دے سکتا ہے اپنی فطرت کے برعکس ظاہر کرتا ہے وہ کہتا وہ ہے جس کا اسے یقین نہیں ہوتا اور کرتا وہ ہے جو کہتا نہیں۔

پتھر، لوہا اور تانبہ ہر ایک اپنی فطرت پوری سچائی کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔

گلاب کے پودے، سیب اور ایلوے کے درخت ہمیشہ سچائی کے ساتھ اپنی فطرت کی

دلوں اور ہاتھوں کو پاک کرنا چاہیے اور اللہ تعالیٰ سے بخشش طلب کرنی چاہیے۔"

○

یہ بصیرت افروز جملے ہم دینداروں کو دعوت دے رہے ہیں کہ ہم وہ الٰہی پیغام پہنچانے کی ذمّے داری ادا کریں جو ہمیں کلامِ خدا اور حکمتِ انبیاءؑ سے وراثت میں ملا ہے۔

انسانیت جس دین کے لیے تڑپ رہی ہے وہ صرف ان علوم کا نام نہیں جن کی صحت کا یقین کرنے کے بعد عقل تصدیق کرتی ہے۔

دین اس کے پہلو بہ پہلو ذاتِ خدا کے وجود کے احساس کا بھی نام ہے جس سے رُوح کی تشنگی بجھتی ہے اور وہ رضا و سربلندی کی طرف آمادۂ سفر ہوتی ہے۔

یہ اخروی سعادت کا احساس ہوتا ہے جیسے بعض لوگ کوئی بڑا عہدہ یا زبردست دولت پانے کے بعد دنیاوی سعادت محسوس کرتے ہیں۔

یہ خشوع و خضوع سے بھرپور نماز اور دل کی پاکیزگی کے ساتھ روزہ میں اللہ تعالیٰ سے انسیت کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔

ہمارے اسلاف کرام نے اس میدان میں خاصی کوششیں کی ہیں۔ کاش ہم ان کی تحریروں کو گرد و غبار سے صاف شفاف کر کے خود بھی فائدہ اٹھاتے اور دوسروں کو بھی فائدہ پہنچاتے۔ ایسا کرنا ضروری بھی ہے۔

میں نے عقائد کے موضوع پر "عقائد نفسیہ" پڑھی۔ پھر تصوف کے موضوع پر ابن عطاء اللہ کی شرح "ابن عجیبہ" پڑھی اسی طرح ان موضوعات پر دیگر کتابوں کا مطالعہ کیا تو محسوس ہوا کہ بہت سے اعلیٰ خیالات کے ساتھ کچھ چند معمولی چیزیں خلط ملط ہو گئی ہیں جنھیں از سرِ نو صاف کرنے کی ضرورت ہے۔

بلاشبہ ضرورت ہے ایک ایسے علم کی جو نظریاتی دینی حقائق کو لازمی اخلاق و کردار، مسلسل عمل اور بامقصد و متوازن طرزِ زندگی میں بدلنا سکھائے۔

اس سلسلے میں دوسروں کے تجربات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا نہ یہ کہ کس طرح انھوں نے خواہشاتِ نفس کا مقابلہ کیا، کیسے دشواریوں کو دُور کیا، جو کچھ سیکھا تھا اسے کیسے عملی تطبیق

عمل کے بغیر نظریہ کی حیثیت یونانی مباحثوں، یونیورسٹی کی بحثوں اور پہلوانی کرتبوں سے زیادہ نہیں۔ نظریہ کی طاقت وحقانیت تو اسے عملی روپ دینے میں ہی ہے۔

انسان اگر کوئی اعتقاد رکھتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس پر عمل کرتا ہے اور اگر اس کی دعوت دیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود اس کا تجربہ کر کے صحیح سمجھ چکا ہے ورنہ صرف الفاظ کا کھیل، مجلسی گپ بازی، ذہنی قوت کا اظہار اور بحث ومباحثہ کی صورت رہ جاتی ہے اور اس کا کوئی نتیجہ نہیں نکل سکتا۔

آج بلند ترین اصولوں مثلاً "انسانی حقوق"، "بین الاقوامیت" "اقلیات کی حمایت و تحفظ، چھوٹے ملکوں کے حقوق کی حفاظت اور سماجی انصاف" وغیرہ کے ساتھ آفت یہی ہے کہ عملی دنیا سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ نعرے بلند کرنے والوں کے دلوں کی ترجمانی ہی ان سے ہوتی ہے اور جب تک انھیں نافذ نہیں کیا جاتا ان کی کوئی قیمت واہمیت نہیں ہوسکتی۔

ہمارے مفکرین ومصلحین کے کم از کم نوے فیصد افکار و نظریات رائگاں ہیں کیونکہ افلاطون کے فلسفہ کی طرح انھیں عملی روپ نہیں دیا جاتا۔

حکومتی نظام کی اصلاح، جہالت، فقر اور امراض کے خلاف جدّوجہد وغیرہ کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں اور یہ سب اس لیے کہ نظریہ اور عمل کے درمیان تار ہی کٹا ہوا ہے۔ کرنٹ کیسے دوڑے۔

اگر ہم واقعی اصلاح چاہتے ہیں تو سب سے پہلے ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ نظریہ کو عملی روپ کیسے دیا جائے۔

اس چیز کو صوفیہ "حقیقت" کا نام دیتے ہیں۔

ترجمانی کرتے ہیں اور ہمیشہ اپنی فطرت کے مطابق ہی پھول یا پھل دیتے ہیں۔ ایک بار بھی ایسا نہیں ہوتا کہ سیب کے درخت میں ایلوے پھل جائیں۔

گھوڑا، اونٹ اور بیل ہمیشہ اپنی فطرت کے مطابق ہی کھاتے پیتے اور کام کرتے ہیں۔ لیکن انسان ہمیشہ اپنی حقیقت ظاہر نہیں کرتا۔ کبھی وہ بھوک ظاہر کرتا ہے جب کہ اس کا پیٹ ضرورت سے زیادہ بھرا ہوتا ہے، کبھی وہ اظہارِ پسندیدگی کرتا ہے جبکہ دل میں نفرت بھری ہوتی ہے۔ کبھی وہ خلوص ظاہر کرتا ہے جبکہ دل میں فریب بھرا ہوتا ہے یا مثلاً کبھی وہ دل سے پکا سرمایہ پرست ہوتا ہے لیکن ظاہراً کمیونسٹ اور سوشلسٹ ہوتا ہے۔

انسان کے سوا ہر چیز وہی ہے جو وہ فطری طور پر ہے۔ لیکن انسان اکثر اپنی فطرت کے مطابق نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ ایک ظریف قلمکار کو لکھنا پڑا "زبان دل کے احساسات کی ترجمانی کے لیے نہیں ایجاد کی گئی ہے بلکہ اس لیے کہ دل کے محسوسات کو چھپا سکے اور لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر سکے تاکہ لوگ حقیقت کو نہ سمجھ سکیں"۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ انسان جتنا ذہین اور ماہر ہوتا ہے اتنا ہی اپنی صحیح ترجمانی سے دُور ہوتا ہے اور جتنا سادگی اور عدمِ مہارت سے قریب ہوتا ہے اتنا ہی وہ اپنی صحیح ترجمانی سے قریب ہوتا ہے"۔

انسان کی قیمت و اہمیت اس پر منحصر نہیں کہ وہ کتنے حقائق اور بلند نظریات تک پہنچ جاتا ہے بلکہ اپنے نظریات کو عملی روپ دینے اور اپنی داخلی و خارجی زندگی کو ہم آہنگ کرنے پر ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ انسان بڑا فلسفی ہو لیکن عملاً وہ ایک ذلیل اور کمینہ خصلت انسان ہو جیسا کہ بڑے انگریز فلسفی بیکن کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے۔

ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی آپ سے شراب و جوے کے بارے میں نہایت بلیغ گفتگو کرتا ہے اور ماہرانہ دلائل سے ان کی مضرت ثابت کرتا ہے لیکن عملاً وہ شرابی اور جوے باز ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے دل کی ترجمانی نہیں کرتا اس کے نظریات اور عمل میں کوئی مطابقت نہیں ہوتی۔

ہم میں سے کتنے اشخاص طوطوں کی طرح بڑے بڑے الفاظ زبان سے دہراتے رہتے ہیں لیکن کہنے والوں کے دلوں میں ان کی حقیقت تلاش کریں تو کچھ نہیں ملے گا۔

افسوس ناک بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا بیشتر معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔ یہ کتنی بری بات ہے کہ لوگ فرائض اور دیگر عبادات اس طرح ادا کریں کہ وہ ذہنی طور پر غائب ہوں نہ ان کے اذہان میں ان کے معانی و مطالب آئیں نہ ان کے دلوں میں ان کی حکمت جاگزیں ہو۔

ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ مختلف کام انجام دیتے وقت انسان کا احساس مختلف درجے پر ہوتا ہے، کبھی مکمل شعور کی حالت رہتی ہے اور کبھی نیم شعور یا لاشعور میں احساس رہتا ہے۔

جو کام عادتاً کیے جاتے ہیں ان میں نیم شعور کی حالت رہتی ہے اور یہ حالت جانوروں جیسی ہوتی ہے جو شعور کے بغیر متعین کام بخوبی انجام دیتے رہتے ہیں۔

جب دینی اعمال بھی محض عادت کی طرح انجام دیے جانے لگیں اور ان کے ساتھ مطلوبہ ذہنی شعور و بیداری نہ ہو تو وہ دوا سے زیادہ مرض بن جاتے ہیں۔

بلکہ اگر بیدار مغز، منکرینِ خدا بھی زندگی کے میدانوں میں اس طرح کے غافل و خفتہ ذہن عبادت گزاروں کے مقابلے میں آئیں گے تو بہت جلد ان پر غالب آ جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے دین کو موضوع اور ظاہری شکل، معنی و لفظ اور جسمانی حرکت کے ساتھ ذہنی بیداری و شعور، دونوں سے متعلق بنایا ہے اب جو باطن کو چھوڑ کر صرف ظاہر کو اختیار کرے گا وہ دین کے ساتھ کھلواڑ کرے گا۔

ایک سچا مومن جب سنجیدگی سے عبادت کرتا ہے تو نیک نیتی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہتا ہے۔

کبھی شیطان اس کی عبادت میں کچھ خلل ڈال کر توجہ ہٹانے کی کوشش کرتا ہے تو وہ غمزدہ ہوتا ہے اور اس سے بچنے کے طریقے سیکھتا اور اپناتا ہے۔

اس کی کوششوں کے بھی کئی درجے ہوتے ہیں۔

سب سے بہتر کامیابی اس شخص کی ہوتی ہے جو اپنے عمل کو ظاہری و معنوی دونوں اعتبار سے محفوظ کر لے جائے۔ اور سب سے درماندہ وہ شخص ہوتا ہے جسے شیطان غافل

شریعت و حقیقت

ایک دن نماز ختم ہوتے ہی میں اپنی جگہ بیٹھا ہوا اذکارِ مسنونہ کا ورد کر رہا تھا اور تسبیح وتحمید اور تکبیر کے مطالب پر غور کرتا جا رہا تھا کہ اچانک شیطان نے اپنا اثر دکھایا اور میرا دماغ ایک معاملہ کی طرف متوجہ ہو گیا اور اس کے مختلف پہلوؤں میں الجھ گیا پھر جب میں چونکا تو آخری کلمات میری زبان پر جاری تھے۔

میں نے قول وعمل میں تضاد کی اس حالت کو محسوس کیا اور میرے ضمیر نے سوال کیا:

کیا تم واقعی اپنے پروردگار کے ذکر میں مشغول تھے۔

جھوٹ کی کوئی گنجائش کہاں تھی، میرا دل دوسری ہی وادی میں گشت کر رہا تھا اگرچہ زبان حسب عادت ذکر کے کلمات ادا کر رہی تھی۔

گویا میں حاضر رہ کر بھی غائب تھا، یا غائب رہ کر بھی حاضر تھا۔ اور جو کچھ زبان سے ادا کر رہا تھا اس کی بنا پر میرا شمار ذکر کرنے والوں میں نہیں ہو سکتا۔

ظاہر ہے، ہم جو کلمات زبان سے ادا کرتے ہیں اور ان میں جو معانی ومطالب پنہاں ہوتے ہیں، دونوں کے درمیان بڑا فرق ہے۔

اگر ہونٹوں سے الفاظ کی ادائگی سے معانی ومطالب بھی فوراً حاصل ہو جاتے جیسے بٹن دباتے ہی بجلی کا بلب روشن ہو جاتا ہے تو بات دوسری ہوتی لیکن الفاظ اور ان کے مطالب کے درمیان بڑا فاصلہ ہے۔

کھول دے اور چاق و چوبند ہو کر اس کے مفہوم و مراد کو دل و دماغ میں جا گزیں کرے۔

اللہ نے اپنے بندوں کی صفت بیان فرمائی ہے:

وَالَّذِیْنَ اِذَا ذُکِّرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ لَمْ یَخِرُّوْا عَلَیْھَا صُمًّا وَّعُمْیَانًا ۝

(الفرقان ۷۳)

جنھیں اگر ان کے رب کی آیات سنا کر نصیحت کی جاتی ہے تو وہ اندھے اور بہرے بن کر نہیں رہ جاتے۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق درحقیقت یہ تقاضا کرتا ہے کہ اِدھر اُدھر کے خیالات، اداکاری اور تصنع سے دُور رہا جائے۔

ادھر ادھر کے خیالات میں مشغولیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو دھوکا دے رہا ہے اور بات کی اہمیت کو نہیں سمجھتا۔ ایمان کے قوانین پے در پے حادثوں کے ذریعے انسانی نفس کو آزمائش کی کسوٹی پر ڈالتے ہیں تاکہ یہ واضح ہو جائے کہ انسان ثابت قدم رہتا ہے یا شکست کھا کر پسپائی اختیار کر لیتا ہے۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جٰھَدُوْا مِنْكُمْ وَیَعْلَمَ الصّٰبِرِیْنَ ۝ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَیْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ع

(آل عمران ۱۴۲ - ۱۴۳)

کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی جنت میں چلے جاؤ گے حالانکہ ابھی تو اللہ نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ تم میں کون وہ لوگ ہیں جو اس کی راہ میں جانیں لڑانے والے اور اس کی خاطر صبر کرنے والے ہیں تم تو موت کی تمنائیں کر رہے تھے مگر یہ اس وقت کی بات تھی جب موت سامنے نہ آئی تھی تو وہ اب تمہارے سامنے آ گئی اور تم نے اسے آنکھوں سے دیکھ لیا۔

دشمن کے مقابلے سے پہلے شہادت کی تمنّا بڑی چیز ہے لیکن اس سے بڑی چیز مقابلے کے وقت ثابت قدمی اور زندگی کی محبت کو غالب نہ آنے دینا ہے۔

بے کار لفاظی کرنے والوں کو اللہ تعالیٰ پسند نہیں فرماتا۔

کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

کبھی میں ایسی نظمیں سنتا ہوں جن میں مناسکِ حج یا سیرتِ پاک کا بیان ہوتا ہے۔ تو میرا دل رقّت سے بھر جاتا ہے پھر جب پڑھنے یا گانے والے کا کردار ذہن میں آتا ہے تو محسوس ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اس کی عظمت اور کہنے والوں کے پست حال کے درمیان کتنی بڑی خلیج حائل ہے۔

دینی نغمے گانے والوں کی یہ ٹولیاں وہی ہوتی ہیں جو برے گانوں کے ذریعے لوگوں کے دلوں میں شہوت پرستانہ جذبات بھی بھڑکاتی ہیں۔

اسی لیے جب میں کسی گلوکار کی زبان سے اللہ تعالیٰ کی مناجات سنتا ہوں تو فوراً دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ واقعی اللہ کا ذکر ہے یا محض لفظی صنعت گری۔

آخر دینی نغموں میں اداکاری کی کیا ضرورت ہے؟

کیا آپ نے مشہور قاریوں کے منہ سے تلاوت کے جلسوں میں کلامِ پاک سنا ہے اور یہ دیکھا ہے کہ وہاں کس طرح شور شرابہ ہوتا ہے؟

قرآن کریم اور اس کے نازل کرنے والے کی عظمت وجلال کے ساتھ یہ ایک طرح کا مذاق اور آیتوں کو نغموں میں بدلنے کی کوشش سی ہے۔ اس طرح کی محفل سے نہ کسی کے دل میں اللہ تعالیٰ کی یاد پیدا ہوتی ہے، نہ کوئی آنکھ اشکبار ہوتی ہے، نہ طاعت کا جذبہ ابھرتا ہے۔ قاری اور سامع دونوں ویسے ہی اپنے اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔

ایک ذی ہوش آدمی سے یہ توقع کی جاتی ہے کہ جو کچھ کہتا ہے اسے سمجھتا ہے اس کا شعور رکھتا ہے اور وہی مراد لیتا ہے۔

نمازی سے یہی مطلوب ہے کہ جب انسان اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہو تو اسے اس کا احساس ہو کہ وہ کس سے سرگوشی کر رہا ہے جب وہ اللہ اکبر کہے تو ذاتِ پاک وباعظمت کا احساس اسے دوسری چیزوں کی طرف توجہ سے غافل کر دے۔ اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرنے کا راز یہی ہے۔

جو قرآن شریف کی تلاوت کرتا ہے اس سے یہ مطلوب ہے کہ وہ اپنے دل کے دریچے

ابن عجیبہ اپنی شرح میں لکھتے ہیں:

"صوفیہ کے نزدیک اعمال کی تین قسمیں ہیں۔ عملِ شریعت، عملِ طریقت اور عملِ حقیقت۔ یا دوسرے الفاظ میں عملِ اسلام، عملِ ایمان اور عملِ احسان۔ یا بالفاظِ دیگر مبتدیوں کا عمل متوسطین کا عمل اور کاملین کا عمل۔ گویا شریعت کا مقصد ظاہر کی اصلاح، طریقت کا مقصد باطن کی اصلاح اور حقیقت کا مقصد نیتوں کی اصلاح ہے"۔

اس طرح کی عبارتوں میں الفاظ کا کھیل اور معانی و مطالب کو خلط ملط کرنا زیادہ ہے شریعت تو ظاہر و باطن دونوں کی اصلاح کے لیے ہے اور دینی عبادت و احسان ایک دوسرے سے مربوط ہیں، انھیں ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

یہ تصور کہ قرآن و سنت میں دو قسم کے معانی ہوتے ہیں ایک قسم شریعت کی طرف اشارہ کرتی ہے دوسری حقیقت کی طرف باطل ہے۔ دین میں اہلِ شریعت اور اہلِ حقیقت کی کوئی تقسیم نہیں ہے۔

ابن عجیبہؒ کی یہ مثال صحیح نہیں کہ

اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ ٥ — جاؤ جنت میں اپنے اعمال کے بدلے۔

(النحل ۳۲)

میں اہلِ شریعت کی طرف اشارہ ہے۔

اور اس حدیث میں اہلِ حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ:

"تم میں سے کوئی شخص اپنے عمل کی بدولت جنت میں داخل نہیں ہو سکتا"۔

کیونکہ مسلمانوں کے ائمہ اس پر متفق ہیں کہ جنت میں جانے کے لیے عمل ناگزیر ہے اور یہ ایسا شرعی سبب ہے جس سے کوئی بھی انسان مستثنیٰ نہیں۔ قرآن و سنت میں اس کے بے شمار دلائل ہیں:

لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ — ان کے رب کے پاس ان کے لیے سلامتی کا گھر ہے اور وہ ان کا سرپرست ہے اس صحیح طرزِ عمل کی وجہ سے جو انھوں نے اختیار کیا۔

(الانعام ۱۲۷)

لِمَا تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ o كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ o (الصف ۲-۳)

تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو اللہ کے نزدیک یہ سخت ناپسندیدہ حرکت ہے کہ تم کہو وہ بات جو کرتے نہیں۔

دین کی حقیقت و روح سے دُور کرنے والی دوسری چیز ہے عبادت کو ظاہری رسومات سمجھنا اور انھیں کو بہتر طور پر ادا کرنے کی کوشش کرنا۔

یہ بات آسانی سے سمجھ میں آنے والی ہے کہ دل و دماغ کی بیداری کے ساتھ تھوڑی سی عبادت اس زیادہ عبادت سے بہتر ہے جو بے رُوح و بے جان ہو۔

حضرت ابراہیمؑ والا احساس دل میں جاگزیں رہنا چاہیے کہ :

اَلَّذِیْ خَلَقَنِیْ فَهُوَ یَهْدِیْنِ o وَالَّذِیْ هُوَ یُطْعِمُنِیْ وَیَسْقِیْنِ o وَاِذَا مَرِضْتُ فَهُوَ یَشْفِیْنِ o (الشعراء ۷۸-۸۰)

جس نے مجھے پیدا کیا پھر وہی میری رہنمائی فرماتا ہے جو مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے اور جب بیمار ہو جاتا ہوں تو وہی مجھے شفا دیتا ہے۔

معاملہ فصیح و بلیغ عبارتوں کی منہ سے ادائگی یا پیچیدہ فلسفوں کی تشریح کا نہیں معاملہ صرف اتنا ہے کہ مسلمان جب مثلاً سورۂ فاتحہ پڑھے تو ہر لفظ کو سمجھے، اس کا دل اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کا آئینہ بن جائے اور وہ اسی سے نعمت و ہدایت کی طلب میں یکسو ہو جائے۔

اس کو صوفیہ اور مربّی حضرات "حقیقت" کا نام دیتے ہیں۔

اس لفظ (حقیقت) کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں جو ہم نے اوپر بیان کیا ہے یعنی یہ کہ مسلمان لفظی و معنوی اعتبار سے شریعت کا پابند ہو، جسمانی و ذہنی و قلبی ہر پہلو سے شریعت کی تعلیمات کا اثر قبول کرے اور فکری، جذباتی اور علمی اعتبار سے شریعت کے معیار تک پہنچنے کی کوشش کرے۔

دوسرے الفاظ میں یہ کہ ذکرِ الٰہی کے وقت دل زبان کے ساتھ ہم آہنگ ہو اور حکمِ الٰہی کی اطاعت و پیروی میں رُوح و جسم ایک ہو جائیں۔

بعض صوفیہ کے کلام سے یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شریعت اور حقیقت الگ الگ چیزوں کے نام ہیں۔

کی قیمت تو نہیں ہو سکتی وہ بھی تب جب عبادت میں کوئی نقص نہ رہ جائے۔ جبکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ہم میں سے اکثر کا عمل اگر جانچا جائے تو اسی کے منہ پر مار دیا جائے۔ پھر انسان کو دنیا میں دی جانے والی نعمتوں کا حساب کر کے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ تمہارا عمل تو ان میں سے بعض نعمتوں کے برابر ہی ہے تب کیا ہوگا؟

حدیث مذکور نہ قرآنی آیات سے ٹکراتی ہے نہ دوسری حدیثوں سے بلکہ اس کا مقصد صرف انسانی غرور کو توڑنا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و درگزر کو یاد دلانا ہے۔

اس لیے جب بعض صوفیہ شریعت و حقیقت کے الفاظ استعمال کرتے ہیں تو ان کی اسلام میں کوئی اصل نہیں ہوتی کیونکہ اللہ کا دین اس کی تمام مخلوق کے لیے ہے۔

وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ○ لَكُمْ فِیْهَا فَاكِهَةٌ كَثِیْرَةٌ۔ (الزخرف ۷۲-۷۳)

تم اس جنت کے وارث اپنے اعمال کی وجہ سے ہوئے جو تم دنیا میں کرتے رہے تمہارے لیے یہاں بکثرت فواکہ موجود ہیں۔

اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا جَزَآءً بِمَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ○ (الاحقاف - ۱۴)

ایسے لوگ جنت میں جانے والے ہیں جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے اپنے اعمال کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے رہے۔

لیکن ساتھ ہی عبادت گزاروں سے یہ بھی مطلوب ہے کہ وہ تواضع اختیار کریں اور اللہ کے حق کو اتنا بڑا سمجھیں کہ اپنی نیکیوں کے باوجود اس کے سامنے پیشی سے سہمے رہیں۔

وَالَّذِیْنَ یُؤْتُوْنَ مَآ اٰتَوْا وَّقُلُوْبُهُمْ وَجِلَةٌ اَنَّهُمْ اِلٰى رَبِّهِمْ رٰجِعُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ یُسٰرِعُوْنَ فِی الْخَیْرٰتِ۔ (المومنون ۶۰)

اور جن کا یہ حال ہے کہ دیتے ہیں جو کچھ بھی دیتے ہیں اور دل ان کے اس خیال سے کانپتے ہیں کہ ہمیں اپنے رب کی طرف پلٹنا ہے وہی بھلائیوں کی طرف دوڑنے والے ہیں۔

یہاں مراد گناہ کرنا اور اس کے انجام سے ڈرنا نہیں بلکہ اطاعت کرنا اور اس کی عدم قبولیت سے ڈرنا ہے کیونکہ ہوسکتا ہے وہ اللہ تعالیٰ کو پسند نہ آئی ہو کہ اس کی پسندیدگی کے معیار سے کم ہو۔

حدیث شریف میں اسی مفہوم پر زور دیا گیا ہے کہ عمل پر مغرور نہ ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب عمل کی نفی نہیں بلکہ عمل پر اطمینان و غرور اور عمل کی انجام دہی کے بعد جرأت کی نفی ہے اس کی نفی بھی نہیں ہے کہ زیادہ سے زیادہ نیکی کی جائے۔

یہ بہت عجیب بات ہوگی کہ عام مسلمان یہ سمجھنے لگیں کہ عمل لازم ہی نہیں تب پھر قرآن کریم کس لیے نازل ہوا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قرآن کریم کی تبلیغ اور امت کو اس پر عمل پر تیار کرنے کے لیے چوتھائی صدی تک جدّوجہد کیوں فرمائی؟

حدیث اس بات کی نفی کرتی ہے کہ عمل جنت کی حقیقی قیمت ہے اس کی نفی نہیں کرتی کہ وہ جنت میں دخول کا سبب ہے۔ ظاہر ہے چند سال کی عبادت جنت میں دائمی قیام

یہ فطری بات ہے کہ جب آپ کوئی میٹھا پھل چکھتے ہیں تو کہتے ہیں یہ شیریں ہے اور جب کوئی کڑوا پھل چکھتے ہیں تو کہہ اٹھتے ہیں یہ تو تلخ ہے۔

اب اگر کوئی شخص شیریں پھل کو تلخ بتا کر اسے پھینکنے کے لیے کہے یا اس کے برعکس تلخ پھل کو شیریں بتا کر اسے کھانے کے لیے کہے تو وہ فریب کار اور جھوٹا ہو گا۔

اللہ کے نام پر ہر چیز کو اس کی اصل حالت و منزلت پر رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے محبت اور اسی کے لیے نفرت ایمان کا جز ہے اور وہ اسلام سے بیگانہ ہے جو ہمارے بڑوں کی عزت نہ کرے، چھوٹوں پر رحم نہ کرے اور علماء کا مقام نہ پہچانے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوقات میں صالح اور نیک لوگوں کی تعریف فرمائی ہے اور ان کے اخلاق اور طرزِ عمل کا تحسین کے ساتھ ذکر فرمایا ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَبِيًّا۔
(مریم ۴۱)

اور اس کتاب میں ابراہیم کا قصہ بیان کرو بے شک وہ ایک راست باز انسان اور ایک نبی تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِسْمَاعِيلَ إِنَّهُ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُولًا نَبِيًّا وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ (مریم ۵۴)

اور اس کتاب میں اسماعیل کا ذکر کرو وہ وعدے کا سچا تھا اور رسول نبی تھا وہ اپنے گھر والوں کو نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتا تھا۔

اچھے لوگوں کی تعریف نسل در نسل چلی آرہی ہے اور یہ ایک فطری قانون ہے جس کے ذریعہ عبادت گزاروں کی عبادت و تقویٰ اور بہادروں کی بہادری کو دوام حاصل ہوتا ہے۔

اللہ تعالیٰ حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں فرماتا ہے۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْآخِرِينَ سَلَامٌ عَلَىٰ نُوحٍ فِي الْعَالَمِينَ۔ إِنَّا كَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِينَ۔ إِنَّهُ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِينَ۔ (الصّٰفّٰت ۷۵)

اور بعد کی نسلوں میں اس کی تعریف و توصیف چھوڑ دی سلام ہے نوح پر تمام دنیا والوں میں۔ ہم نیکی کرنے والوں کو ایسی ہی جزا دیا کرتے ہیں۔ وہ ہمارے مومن بندوں میں سے تھا۔

یہ حقیقت ہے کہ بڑی رسالتوں کی کامیابی کا دارومدار دو چیزوں پر رہا ہے۔ ایک

اللہ تعالیٰ کے لیے محبّت و نفرت

عظیم لوگوں کا احترام ضروری ہے۔ میری مراد ارباب اقتدار اور اصحابِ ثروت و دولت سے نہیں۔ ان لوگوں میں بھی کچھ لوگ قابلِ احترام ہوتے ہیں اور کچھ لوگ قابلِ نفرت و حقارت۔ عظیم لوگوں سے میری مراد ایسے لوگوں سے ہے جو گہرا علم، بہترین اوصاف، بیدار ایمان اور مخلصانہ جدّوجہد کے حامل ہوں۔

انسانیت کے اسی پیش رو قافلے میں ائمہ و شہدا بھی ہیں، خاموشی سے قربانیاں دینے والے بھی اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں اپنے آپ کو فنا کر دینے والے بھی۔ اس میں مالدار بھی ہوسکتے ہیں اور غریب بھی، مریض بھی ہوسکتے ہیں اور صحت مند بھی، فوجی بھی ہوسکتے ہیں اور شہری بھی، حاکم بھی ہوسکتے ہیں اور محکوم بھی۔ مہربان اور صبر و تحمل سے کام لینے والی ماں بھی ہوسکتی ہے اور حیادار و وفادار بیوی بھی۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو بہت سی صلاحیتوں سے نوازا ہے اور ان صلاحیتوں کا احترام بھی ضروری ہے اور ان صلاحیتوں کے حامل افراد کا بھی۔

اسی طرح کم ظرف و کمینہ خصلت لوگوں اور ان کی عادتوں کو نگاہِ حقارت سے دیکھنا اور مسترد کرنا بھی ضروری ہے چاہے ان کے دنیاوی حالات جتنے شاندار نظر آئیں اور ان کی طرف سے خوف اور لالچ کے جتنے اسباب و ذرائع فراہم کیے جائیں۔ ان کے ساتھ ہم آہنگی جرم اور ان کی بڑائی بیان کرنا ظلم ہے۔

لیے راستہ روشن کیا اور اپنی عبادت وتقویٰ سے اللہ تعالیٰ کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کی اور ذکر الٰہی کے لیے ان کے دلوں کو کھول دیا۔

بلاشبہ تعلیم وتربیت کے ان اماموں کو زبردست عوامی محبت وحمایت حاصل ہوئی جس کے بعد سیاست کاروں اور حکمرانوں کی قدر افزائی اور بھی حقیر وبے وزن ہوگئی ان میں سے کسی نے بھی اس مرتبہ ومقام کے حصول کے لیے کوشش نہیں کی تھی ـــــ کہ اس طرح تو ان کا عمل ہی رائگاں ہوجاتا ـــــ بلکہ یہ تو ہر میدان میں اللہ تعالیٰ کے لیے کام کرنے والوں کے درمیان اللہ تعالیٰ ہی کے لیے محبت کے جذبات تھے۔

عوامی جذبات میں کبھی کبھی ایسے تصوّرات بھی شامل ہوجاتے ہیں جن پر نکتہ چینی کی ضرورت پڑتی ہے۔ عوام کے نزدیک ہیرو بہت کم غیر معمولی عادتوں اور کارناموں سے خالی ہوتا ہے مثلاً وہ کہتے ہیں "حضرت مریم کا رزق آسمان سے اترتا تھا اور ان کی کفالت کرنے والے (حضرت زکریا علیہ السّلام) دہشت زدہ رہ جاتے تھے"۔

اسی طرح لوگ کہتے ہیں کہ حضرت اسید بن حضیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تلاوتِ کلام پاک شروع کی تو فرشتے نازل ہونے لگے اگر وہ تلاوت جاری رکھتے تو مدینہ منورہ کی گلیوں میں فرشتے ہی فرشتے بھر جاتے۔

اسی طرح وہ علماء واولیاء سے بہت سی خلاف معمولی چیزیں منسوب کرتے ہیں۔

اولیاء کرام کی کرامتوں اور ان پر یقین کی ضرورت کی باتیں عجیب وغریب حد تک جا پہنچی ہیں بہت سے سادہ لوح کسی بزرگ کی طرف منسوب کسی خلاف عادت بات کو نہ ماننے والوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں ان کی بہت سی کتابوں میں ان باتوں پر یقین کو صحیح راستے کی علامتوں میں شمار کیا جانے لگا ہے۔

ان ساری باتوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے یہ تصور کہ قانون اسباب کو توڑنے والی کرامتوں کے ساتھ ہی ولایت ہوسکتی ہے باطل اور لغو ہے کیونکہ ولایت تو ایمان اور تقویٰ کا نام ہے۔

أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ۔ الَّذِينَ آمَنُوا

سنو جو لوگ اللہ کے دوست ہیں، جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا راستہ اختیار کیا

طرف رہنما کی برتری اور دوسری طرف ماننے والوں کی محبت واخلاص۔

میرے خیال میں جدّت طراز مصنف ہی کی طرح سمجھدار وقدردان پڑھنے والے کی بھی اہمیت ہوتی ہے۔ یہی اس حدیث کی بھی تفسیر ہے کہ "آدمی اسی کے ساتھ ہوگا جس سے وہ محبت کرتا ہے۔"

اسلامی تاریخ کے آغاز میں کوئی مسلمان خلیفہ کے پاس جاتا تھا تو اس لیے کہ یا تو ثواب کی نیت سے اس کی عزت کرے یا پھر اسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد دلادے۔ دور دراز کے محاذوں پر مجاہدین اپنے مومن بھائیوں کی دعاؤں کے منتظر رہا کرتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ہی کے لیے باہمی محبت عوام کے درمیان مضبوط رشتہ وتعلق کا ذریعہ تھی اور اسی نے زمانے تک قافلۂ اسلام کو باقی وبرقرار رکھا۔

پھر جب حکومت کا نظام انحراف کا شکار ہوگیا تو عوام نے اپنی وفاداری ان لوگوں کی طرف منتقل کردی جن کے کردار وعلم پر وہ اعتماد کرتے تھے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جب امام بخاری رحمۃ اللہ کو ان کے شہر کا حاکم تنگ کرتا ہے تو وہ علم کی اشاعت کے لیے دوسرے شہر چلے جاتے ہیں۔

سبحان اللہ ایک حقیر حاکم علوم حدیث کے سب سے بڑے پہاڑ کو بھگا رہا ہے؟ پھر اللہ تعالیٰ نے اس کا بدلہ یہ دیا کہ امام بخاری کی عزت شہروں شہروں اور قیامت تک کے لیے ہوگئی۔

هٰذَا ذِكْرٌ وَّ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ۔ (ص۔ ۴۹) یہ تو ایک ذکر تھا متقی لوگوں کے لیے یقیناً بہترین ٹھکانا ہے۔

امام احمدؒ بن حنبل کا انتقال ہوتا ہے تو ان کے جنازے میں شرکت کے لیے سارا شہر امنڈ پڑتا ہے آپ کے خیال میں انھیں سزا دینے والے خلیفہ کے جنازے میں کتنے لوگوں نے شرکت کی ہوگی؟

صرف محل کے چند وظیفہ خواروں نے!!

عوام ان فقہاء وعلماء کے اردگرد اکٹھے ہوگئے تھے جنھوں نے اپنے علم سے لوگوں کے

کھڑے رہ گئے۔ مجرم نے ان کی طرف دیکھا اور بولا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ انعام ہے اور وہ (جرم)، اسی کا فیصلہ تھا۔

ظاہر ہے اس طرح کے قصّوں کا لوگوں کے ذہنوں پر منفی اثر پڑتا ہے۔

میں جب نوجوان تھا تو ایک بار مصر کے کسی گاؤں میں ایک بیکار، گندے کپڑے پہنے ہوئے اور پراگندہ حال شخص کو مٹی کے ایک ٹیلے پر بیٹھے دیکھا۔ ایک آدمی نے کہا یہ فلاں ولی ہیں میں بغیر توجہ کے آگے بڑھ گیا تو اس شخص نے ملامت کرتے ہوئے کہا کہ کیا رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے نہیں فرمایا ہے کہ "بہت سے پراگندہ بال و شکستہ حال نظر آنے والے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر کوئی قسم کھالیں تو اللہ تعالیٰ اسے پورا فرما دیتا ہے"۔

میں نے کہا کہ اس حدیث شریف کا یہاں کیا موقع ہے؟

حدیث میں ان عظیم صلاحیتوں کی طرف اشارہ کیا گیا جو فقر و غربت سے ختم نہیں ہو جاتیں بہت سے پراگندہ حال لوگ معطر لباسوں والے خوشحال لوگوں سے زیادہ معزز ہوتے ہیں کیونکہ امام شافعیؒ کے بقول ان کے لباس پر نظر ڈالی جائے تو وہ چند سکوں کی مالیت بھی نہیں رکھتے لیکن ان کے اندر اتنے قیمتی دل ہوتے ہیں جو بے شمار دلوں سے زیادہ قیمتی ہوتے ہیں اگر تمہارا یہ ساتھی ولی ہوتا تو بے روزگار رہنے کے بجائے کچھ کماتا اور اپنے جسم کو صاف ستھرا رکھتا آخر یہ ولایت کی کونسی قسم ہے؟

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ قدیم و جدید زمانوں میں ایسے اچھے لوگ ہوئے ہیں جو ایمان و یقین اور تقویٰ کی بلند منزلوں تک پہنچے۔ ان سے خلاف معمول کرامتیں بھی صادر ہوئیں جو ان پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھا اور بدترین حالات میں ان کے لیے نجات کا ذریعہ بنا۔

لیکن آخر دوسرے لوگوں کو اس سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

جب انبیائے کرام کسی کو نفع نقصان پہنچانے پر قادر نہیں تو ان سے کم تر مرتبے کے لوگ کس طرح قادر ہو سکتے ہیں؟

قُلْ اِنِّیْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا — کہو، میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا

وَكَانُوا يَتَّقُونَ ۔ (یونس ۶۲) ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہیں ہے۔

لہٰذا جس مرد یا عورت میں ایمان و تقویٰ جمع ہو گیا وہ ولی ہے۔

جو عورت اللہ تعالیٰ کی مرضی کے حصول کی نیت سے اس کے حقوق کی ادائگی کے ساتھ اپنے گھر کی دیکھ بھال کرتی ہے اپنے بچوں کی پرورش کرتی ہے اور اپنے شوہر کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہے وہ ولی ہے۔ جو مرد سرکاری دفتر میں بیٹھ کر اسی نیت سے لوگوں کے مسائل حل کرتا ہے اور جلد جلد کام نمٹا دینے کی کوشش کرتا ہے ساتھ ہی نماز روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ اللہ کے حقوق بھی ادا کرتا ہے وہ ولیوں میں سے ہے۔

یہ بالکل ضروری نہیں کہ اس سے کوئی خلافِ معمول کرامت صادر ہو ولایت کی تکمیل کے لیے کرامت کی شرط مضحکہ خیز ہے اور دین میں اس کی کوئی بنیاد نہیں۔ بسا اوقات خلافِ معمول چیزوں کا صدور ـــــ جس پر عوام فریفتہ ہیں ـــــ ایسے لوگوں سے بھی ہو جاتا ہے جو ایمان و استقامت سے بیگانہ ہو چکے ہوتے ہیں میں نے بہت سے ایسے لوگوں کے بارے میں پڑھا ہے جن کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں لیکن انھوں نے ایسے خواب دیکھے یا ایسی پیشین گوئیاں کیں جو بعد میں سچ ثابت ہوئیں۔

لیکن اللہ تعالیٰ سے تعلق کے بغیر اور گمراہی کے ساتھ کسی چیز کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہو سکتی۔ چاہے کوئی پانی پر چل کر دکھائے یا مہینوں تک کھانا نہ کھائے۔ ایمان اور بہترین کردار کے بعد ہی کسی چیز کی قدر و قیمت ہو سکتی ہے۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ عوام اور نیم خواندہ لوگ مادی کرامتوں پر فریفتہ ہیں اور انھیں کو شمار کرتے رہتے ہیں یہاں تک کہ دنیا میں نافذ قانون اسباب ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے اس رجحان کا بہت بڑا اثر اسلامی تہذیب پر پڑ چکا ہے بلکہ اس کی بدولت اخلاق و کردار کی بہت سی قدریں بہنوں کے نزدیک پامال ہو چکی ہیں۔

ایک مثال لیجیے۔

ایک شخص نے کوئی جرم کیا۔ لوگوں کو معلوم ہو گیا اور اسے پکڑنے کے لیے دوڑ پڑے وہ بھاگتے بھاگتے دریا کے کنارے پہنچا اور زمین ہی کی طرح پانی پر دوڑنے لگا۔ لوگ دہشت زدہ

اصحابِ قبور سے کچھ امیدیں وابستہ کر لیتے ہیں لیکن ایسی ہی یا ان سے کہیں زیادہ امیدیں محلوں کا چکر لگانے والے اور حکام کے دم چھلے بھی وابستہ کرتے ہیں ایسے تمام جذبات جو اللہ تعالیٰ سے لو لگانے کا جذبہ کم کریں اور اللہ کے سوا دیگر مردوں یا زندوں سے امیدیں وابستہ کرنے کی طرف راغب کریں مسترد کیے جانے ہی کے لائق ہیں۔

عقیدۂ توحید کے تعلق سے حساس ہونا چاہیے لیکن یہ درست نہیں کہ ایک شرک کو باطل قرار دیا جائے دوسرے شرک کو قابلِ قبول۔ یہ کتنی افسوس ناک بات ہے کہ آدمی کا دل اللہ کی یاد سے خالی ہو اور اس میں زندہ یا مردہ دوسرے اشخاص بھرے ہوئے ہوں۔

ضرورتیں پوری کرانے کے لیے خود اللہ تعالیٰ سے مدد مانگنی چاہیے کسی قبر پر جا کر صاحبِ قبر سے مدد مانگنا جائز نہیں۔ آخر سب سے بڑے بادشاہ کو چھوڑ کر اس کے کسی بندے سے لٹکنا کیسے روا ہو سکتا ہے۔ آخر صاحبِ قبر اپنے ہی جیسے دیگر انسانوں کے لیے کیا کر سکنے کی قدرت رکھتا ہے؟

یہ بھی بہت افسوس ناک بات ہے کہ مسجدوں میں قبریں بنائی جائیں یا قبروں پر مسجدیں بنائی جائیں۔ اس کی حرمت صاف صاف آچکی ہے بہت سے مقامات پر آج لوگ کسی ولی ہی کی قبر پر مسجد بناتے ہیں اور عوام یہ سمجھتے ہیں کہ وہاں مرادیں پوری ہوتی ہیں۔

قبروں پر عمارت کی تعمیر، ان پر چادریں چڑھانا، قیمتی دھاتیں لگانا اور وہاں زائرین کی بھیڑ اکٹھا کرنا ایک عام رواج بن گیا ہے جبکہ ان باتوں کی کوئی دینی بنیاد نہیں۔

میں قاہرہ کے ایک سبزی فروش کو جانتا ہوں جس نے ایک مسجد تعمیر کی اور اس کے بننے کے بعد یہ اجازت حاصل کر لی کہ اسے مرنے کے بعد اسی میں دفن کیا جائے اور یہی ہوا اور اب اسے ولی سمجھا جاتا ہے۔

امام حسن البنا لکھتے ہیں:

"صالحین کی محبت اور ان کے نیک اعمال کی تعریف اور ان کا احترام اللہ تعالیٰ سے قربت کا ذریعہ ہے اللہ تعالیٰ کے اس قول میں اولیا ہی کا تذکرہ ہے کہ

اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ کَانُوْا یَتَّقُوْنَ۔ جو ایمان لائے اور جنھوں نے تقویٰ کا رویہ اختیار کیا۔

(یونس ۶۳)

قُلۡ اِنِّیۡ لَنۡ یُّجِیۡرَنِیۡ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ وَّلَنۡ اَجِدَ مِنۡ دُوۡنِہٖ مُلۡتَحَدًا۔ (الجن ۲۱)

اختیار رکھتا ہوں نہ کسی بھلائی کا، کہو مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی بچا نہیں سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔

بعض لوگوں پر منفی رجحان کا غلبہ ہوتا ہے تو وہ دوسروں کی قیمت پر زندہ رہنا چاہتے ہیں اور بغیر کسی سبب کو اختیار کیے ہوئے صرف نسبت ہی کو کافی سمجھتے ہیں۔

ایک قصّہ مشہور ہے کہ جب انگریزوں نے گذشتہ صدی کے دوران قاہرہ پر قبضہ کیا تو ایک افیمچی امام شافعیؒ کی قبر پر گیا اور انھیں برا بھلا کہنے لگا کہ انھوں نے حملہ آوروں کو پسپا کرنے میں کیوں کوتاہی دکھائی۔ ایک دوسرے افیمچی نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ جب ان سے کہیں بڑے بزرگ امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ حملہ آوروں کو پسپا نہیں کر سکے تو یہ کیا کرتے؟

دلچسپ بات یہ ہے کہ اسی سے ملتی جلتی بات ساتویں صدی ہجری میں اس وقت بھی لوگوں کی زبان پر آئی تھی جب تاتاریوں نے بغداد پر قبضہ کر لیا تھا۔

اَتَوَاصَوۡا بِہٖ بَلۡ ہُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ۔ (الذاریات ۵۳)

کیا ان سب نے آپس میں اس پر کوئی سمجھوتہ کر لیا ہے؟ نہیں، بلکہ یہ سب سرکش لوگ ہیں۔

ان قبروں میں انسانی وجود کی بوسیدہ ہڈیوں کے سوا اور کیا ہے روحیں تو کہیں دور اپنے ٹھکانوں پر پہنچ چکی ہیں۔ تب بھی ہمیں ایک جذباتی تعلق رہتا ہے کہ ان میں ہماری محبوب ہستیاں مدفون ہیں اور ایک زمانہ گزرنے کے باوجود بھی ہم اپنے آباء و اجداد اور اسلاف کو بھول نہیں سکتے۔

قبروں کی زیارت سے یادیں تازہ ہوتی ہیں، آنسو جاری ہوتے ہیں اور ہمیں یہ احساس ہوتا ہے کہ چاہے جتنے دنوں زندہ رہ جائیں ہمارا بھی یہی انجام ہونا ہے۔

ہمیں اس لیے قبروں کی زیارت کی ترغیب دی گئی ہے کہ اس سے دل نرم ہوتا ہے ہم اپنے اسلاف کے لیے دُعا کرتے ہیں۔ کبھی کسی قبر کی زیارت سے شجاعت و مردانگی کی یادیں تازہ ہوتی ہیں اور ہم صاحب قبر کی قدر اور اس سے وفاداری کا اظہار کرتے ہیں۔

قبروں کی زیارت کا مطلب ان کی عبادت کرنا نہیں ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ بعض لوگ

ایمان بالغیب

اسلام نے فکری آزادی پر کبھی پابندی نہیں لگائی بلکہ وہ گہرے غور و فکر اور جرأت مندانہ بحث و تحقیق پر ابھارتا ہے۔

قرآن کریم نے ذہنی و اجتماعی صلاحیتوں کو جن پر زنگ لگ چکا تھا پھر سے صیقل کیا انسانیت کے قدیم ورثہ کو از سر نو زندہ کیا اور نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈالی۔

لیکن صدیوں سے مسلمان ذہنی درماندگی کا شکار ہیں جس کے دور رس اثرات نمایاں ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

دیگر آسمانی مذاہب کی طرح اسلام نے بھی ہماری اس دنیا سے ماورا دیگر غیر محسوس دنیاؤں کے بارے میں بتایا ہے مثلاً زندگی و موت کے فرشتے ہیں، جن ہیں جو ہماری ہی طرح ایمان کے مکلّف ہیں اور ہماری ہی طرح ان میں بھی بُرے بھلے دونوں طرح کے افراد ہیں۔

ان دنیاؤں کے تعلق سے ہمارا علم محدود و ناقص ہے دین ہی نے ان کا اثبات کیا ہے اور ان کے وجود پر دلالت کرنے والی نصوص کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

لیکن توہم پرست اور خرافات میں دلچسپی لینے والے لوگوں نے ان غیب کی چیزوں کے بارے میں بہت سی باتیں گھڑلی ہیں اور ایسے ایسے تصرفات ان سے منسوب کر دیے ہیں جن کا دین سے کوئی اثبات نہیں ہوتا۔

جتنا ہمیں بتایا گیا ہے اس کا ماننا ضروری ہے لیکن توہم پرستوں کے گھڑے ہوئے

شرعی حدود کے ساتھ ان کی کرامت تسلیم شدہ ہے لیکن یہ اعتقاد رکھنا ضروری ہے کہ اولیائے کرام اپنی زندگی میں یا موت کے بعد خود اپنے نفع نقصان کے مالک نہیں تھے دوسروں کو کچھ دینا تو دور کی بات ہے۔

قبروں کی زیارت چاہے وہ جن کی بھی ہوں سنت ہے اور مسنون طریقے کے مطابق مشروع ہے لیکن کسی بھی صاحبِ قبر سے مدد مانگنا، اسے پکارنا، دور یا نزدیک سے حاجت طلب کرنا نذر ماننا، قبر کی تعمیر، اسے کپڑے سے ڈھانکنا، اس پر روشنی کرنا، اسے چھونا، غیر اللہ کی قسم کھانا اور اس جیسی چیزیں بدعت اور گناہ کبیرہ ہیں جن کی مخالفت اور روک تھام ضروری ہے۔"

کچھ لوگ تاویل اور رواداری سے کام لیتے ہیں اور معاملات کو اپنے حال پر چھوڑ دینے کے قائل ہیں لیکن یہ غلطی ہے ہم ان کی نیتوں پر شبہ نہیں کرتے کہ دلوں کا معاملہ اللہ تعالیٰ پر ہے لیکن ان سے یہ گزارش ضرور کریں گے کہ عقیدہ و شریعت میں اسلامی حقائق کا تحفظ کریں اور صحیح تعلیمات کو اختیار کریں خرافات اور بدعات سے کنارہ کش ہو جائیں جنھوں نے دین کا اصل چہرہ غبار آلود کر کے اس کی پیش رفت میں رکاوٹ کھڑی کر رکھی ہے۔

ایک قصّہ ہے کہ ایک گھڑیال نے کسی بچے کو نگل لیا حضرت دسوقیؒ نے اسے آواز دی وہ سمندر سے نکل کر چلتا ہوا آیا اور بچے کو حضرت کے سامنے رکھ دیا۔

ایک قصّہ ہے کہ انار کے ایک درخت نے حضرت ابراہیمؒ بن ادہم سے درخواست کی کہ وہ اس کا پھل کھائیں، جب تین بار درخواست کرنے کے بعد بھی انھوں نے ایسا نہیں کیا تو درخت نے آپ کے ایک ساتھی سے سفارش کرائی تب آپ نے دو انار لے لیے۔

ایک صوفی نے اپنا نیزہ زمین میں گاڑ دیا ایک چڑیا اس پر آ کے بیٹھ گئی اور انھیں بتایا کہ روم میں جو لشکر جنگ کے لیے گیا تھا وہ فتح یاب ہو کر لوٹ رہا ہے اور فلاں دن تک آجائے گا۔ صوفی نے چڑیا سے پوچھا تم کون ہو تو اس نے بتایا کہ میں مومنین کے دلوں سے فکر و رنج دُور کرنے والی ہوں۔

حضرت ابو جعفر اعورؒ سے قصہ منقول ہے کہ ہم لوگ حضرت ذوالنونؒ کے پاس تھے تو یہ ذکر ہونے لگا کہ چیزیں اولیار کی اطاعت کیسے کرتی ہیں۔ حضرت ذولنونؒ نے فرمایا کہ اطاعت اس طرح ہوتی ہے کہ اگر میں اس چارپائی سے کہوں کہ وہ گھر کے چاروں کناروں تک گھوم آئے تو وہ ایسا کرنے لگے۔ اتنے میں چارپائی نے ایسا ہی کر کے دکھایا۔

ایک قصہ ہے کہ حضرت ذوالنونؒ نے کھجور کے پیڑ کو قسم دلائی کہ وہ تازہ کھجور کھلائے تو اس نے بے موسم کے ایسا کیا۔

ایک کہانی میں ہے کہ ایک سانپ نرگس کی شاخ منھ میں لے کر حضرت ابراہیمؒ بن ادہم کو سوتے وقت پنکھا جھلا کرتا تھا۔

ایک قصہ میں ہے کہ حضرت ابو تراب نخشی کے ساتھیوں کو پیاس لگی تو انھوں نے زمین پر پیر مارا جس سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا پھر کسی ساتھی کے فرمائش پر ایک سفید شفاف پیالہ وہیں زمین سے اٹھا کر دے دیا۔

ایک کہانی ہے کہ ایک نوجوان صوفی پر حضرت ذوالنونؒ نے چوری کا الزام لگایا دونوں ایک کشتی میں سوار تھے نوجوان صوفی نے کہا آپ مجھے ایسا الزام دے رہے ہیں؟ اے اللہ تجھے قسم ہے کہ ہر مچھلی کو ایک ایک موتی دے کر بھیج دے چند لمحوں میں پانی کی سطح پر مچھلیاں ہی مچھلیاں نظر آ رہی تھیں اور سب کے منہ میں موتی تھے۔

قصوں کہانیوں کو جھٹلانا اور دینی و مذہبی حقائق کو ان سے محفوظ رکھنا چاہیے۔

روایت ہے کہ امام مالکؒ سے کسی نے سوال کیا کہ کیا انسان عورت جن مرد سے شادی کرسکتی ہے آپ نے جواب دیا نہیں۔

کیوں؟ اس لیے کہ امام مالکؒ کو خدشہ ہوا کہ کوئی عورت راستے سے بھٹک جائے گی تو یہی سہارا لے گی کہ اس نے جن سے شادی کی تھی اس لیے اس کا سدِ باب ضروری تھا۔

عوام میں پھیلی ہوئی خرافات کا ازالہ کرنا چاہیے روحوں کو حاضر کرنے کا جو شغل آج کل کافی پھیلا ہوا ہے وہ بھی اسی طرح کی خرافات کا نمونہ ہے جس کا دین سے کوئی تعلق نہیں اسی طرح فرشتوں اور جنّوں سے تعلق کی ساری باتیں لایعنی ہیں اور ان کی بنیاد پر کوئی دینی مسئلہ نہیں نکالا جاسکتا۔

اس طرح کی توہم پرستی پسماندگی کا دور شروع ہونے کے بعد رائج ہورہی ہے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے دور میں کہیں اس طرح کا ذکر نہیں ملتا۔ پھر آج لوگ محسوس دنیا اور غیب کی دنیا کو خلط ملط کیے دے رہے ہیں۔

محسوس دنیا میں ہم رہ رہے ہیں اور واضح طور پر اس کے بارے میں جانتے ہیں جبکہ غیب کی دنیا کے بارے میں ہمیں بہت کم حقائق کا علم ہے دونوں کو خلط ملط کرنے کا مطلب زندگی اور اس کے قوانین کو نظر انداز کرنا ہے جس سے علمی پسماندگی اور ذہنی درماندگی پیدا ہوتی ہے کام اور ترقی کے راستے بند ہو جاتے ہیں۔

اب آیئے توہم پرستی پر مبنی کچھ مثالوں پر ایک نگاہ ڈالیں کسی بزرگ کے بارے میں مشہور ہے کہ انھوں نے آخری سانس لینے سے پہلے اپنے آپ کو میت والا غسل خود دے لیا تھا اور ایک دوسرے بزرگ اپنے جنازے کے جلوس کی رہنمائی خود فرما رہے تھے۔

حضرت خواصؒ کے بارے میں روایت بیان کی جاتی ہے کہ وہ اپنے گدھے پر سوار تھے اسے مارا تو گدھے نے سر اٹھا کر کہا اور مارو یہ تو تم اپنے ہی سر پر مار رہے ہو۔

ایک قصہ بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ پڑھا رہے تھے تو ایک سانپ گرا اور ان کے سامنے کھڑا ہو کر کچھ باتیں کرنے لگا جسے ان کے علاوہ کوئی اور نہیں سمجھ رہا تھا۔

آج جب دیگر اقوام علم و جستجو کی راہ میں انتھک جدوجہد کی بدولت مادہ کے رموز و اسرار کا پتہ لگا رہی ہیں ہم لوگ اس طرح کی توہم پرستیوں میں پڑے ہوئے ہیں۔

اسلام ذہن و فکر سے خرافات کو، دل سے پست و ذلیل جذبات و خواہشات کو، اور انسانی کردار سے کجی کو دُور کرنے والا دین ہے وہ مثبت طور پر انسانی افکار و احساسات کو اس ہم آہنگی کے ساتھ تشکیل دیتا ہے کہ عقل و حق میں کوئی دُوری نہ رہ جائے اور انسان صراطِ مستقیم پر ثابت قدم رہے۔

جو چیز بھی انسانی ذہن کو خوابِ غفلت میں لے جائے اسلام سے اس کا تعلق نہیں ہو سکتا۔ بعض متدین لوگوں میں جو ذہنی خفتگی اور کسلمندی پائی جاتی ہے وہ شخصی کمزوری اور پسماندہ سماج کا اثر ہے اس کا دین سے کوئی رشتہ نہیں۔

آسمانی عبادت سے مربوط ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں کو مبہم رہنے دیا جائے۔ عبادات تو ذہن و دماغ کو اور بیدار کرتی ہیں۔

ایمان بالغیب کا مطلب اوہام و خرافات پر ایمان لانا اور ذہنی پراگندگی کو چھوٹ دینا نہیں۔

اس طرح کی نفسیات پیدا ہونے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انسان اسباب کو چھوڑ کر اتفاقات اور کرامات کا انتظار کرنے لگتا ہے عمل کے بغیر نہ دین حاصل ہو سکتا ہے نہ دنیا۔ اور جس قوم میں اس طرح کی نفسیاتی حالت پیدا ہو جائے وہ کبھی اُبھر نہیں سکتی۔

کتاب و سنت شخصی ذمّے داری اور انسانی ارادہ و اختیار کی آزادی کا اصول بتاتے ہیں اور یہ کہ انسان اپنے عمل، سے ہی اپنا بھلا یا بُرا مستقبل بناتا ہے اور اسی پر اسے آخرت میں بھی جزا یا سزا ملے گی۔

انسان فطری طور پر انوکھے پن کا متلاشی رہتا ہے۔ سادہ حقائق میں اسے کم کشش محسوس ہوتی ہے اس سے فائدہ اٹھا کر توہم پرست لوگ خرق عادت چیزوں اور کرامتوں کے تعلق سے من گھڑت مبالغہ آرائیاں کرنے لگتے ہیں۔

بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت سے نازک موقعوں پر غیر محسوس اور خلافِ معمول طریقوں سے انسان کی مدد کرتا ہے اور اپنے مقرب بندوں پر اس کی خصوصی نظرِ عنایت بھی ہوتی ہے لیکن

ایک کہانی ہے کہ کچھ لوگوں نے کرامات کا انکار کیا تو ایک صوفی شیر پر سوار ہو کر نکلا اور دریافت کیا کہ انکار کرنے والے کہاں ہیں؟

روایت بیان کی جاتی ہے کہ حضرت ابوالخیر سنانیؒ کی کرامتیں مشہور تھیں حضرت ابراہیم رقیؒ نے ایک دن ان کے پیچھے مغرب کی نماز پڑھی حضرت سنانی اچھی طرح قرأت نہیں کرپاتے تھے۔ حضرت رقی نے سوچا کہ بیکار اتنی دور سفر کی مشقت جھیل کر آیا۔ پھر وہ استنجا کے لیے نکلے تو ایک شیر سامنے آگیا انھوں نے آکر بتایا تو حضرت سنانی باہر نکلے اور چیخ کر شیر سے کہا کہ کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ میرے مہمانوں کو تنگ نہ کرنا یہ سُن کر شیر چلا گیا۔ بعد میں حضرت سنانیؒ نے حضرت رقیؒ سے فرمایا تم لوگ ظاہر ٹھیک کرنے میں لگے ہو اس لیے شیر سے ڈرتے ہو اور ہم لوگ باطن ٹھیک کرنے میں لگے ہوئے ہیں اس لیے شیر ہم سے ڈرتا ہے۔

اس طرح کے بے شمار قصے کتابوں میں مل جائیں گے کہ کوئی صوفی پانی پر چلتا تھا کسی کے اشارے پر کسی کی آنکھیں نکل کر گر پڑیں، کسی کو دفن کرنے کے لیے دریا کا پانی سوکھ گیا، کسی کے اشارے پر پہاڑ چل پڑا کوئی ہزار ہا میل دُور موجود اپنے استاد سے وہیں بیٹھے بیٹھے مشورہ کرلیا کرتا تھا کوئی اڑ کر مکہ مکرمہ چلا جاتا تھا وغیرہ وغیرہ۔

آخر دین کے نام پر اس طرح کے قصّے کہانیوں کا کیا فائدہ ہے؟ خدا کے فضل سے سلفِ صالح اس مرض سے محفوظ تھے اور اس طرح کے چکروں میں پڑتے ہی نہیں تھے تب انھوں نے پوری سچائی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے پیغام کو دنیا میں پھیلایا اور ایسی اسلامی تہذیب کے علمبردار بنے جو پوری انسانیت کے لیے خیر و برکت کا ذریعہ تھی۔

اگر وہ اس طرح کی توہم پرستیوں میں پڑے ہوتے تو نہ کوئی ملک فتح کرپاتے نہ کسی علاقہ کو ہدایت دے پاتے نہ ان کا کوئی اثر ہی باقی رہ جاتا۔

دنیا میں اللہ تعالیٰ کی سنت کے مطابق کچھ قوانینِ فطرت کی عملداری ہے یہ کوئی ایسا آٹا نہیں جسے جو چاہے جیسے چاہے گوندھے۔

عبادت میں مشغولیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قوانین فطرت بدل جائیں گے اور کائنات کے نظام میں انتشار پیدا ہو جائے گا۔

سے مدد طلب کرنے پہنچ گئے تھے اور جب بغداد کا سقوط ہوا تو اسی مزار سے پکڑ کر انھیں بھی مار دیا گیا۔

قاہرہ پر جب انگریزوں کا قبضہ ہوا تو بہت سے توہم پرستوں کو وہاں امام شافعیؒ کی قبر کی موجودگی کی وجہ سے اس کا یقین ہی نہیں آرہا تھا۔

اب اگر آپ اس طرح کی توہم پرستی پر نکتہ چینی کریں تو آپ پر اولیاءؒ کی دشمنی کا الزام لگ جائے گا۔

اولیائے کرامؒ کا بلند مرتبہ برحق، لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ کیا روحیں عالم برزخ میں پہنچنے کے بعد بھی اسی طرح سرگرمیوں میں حصّہ لیتی ہیں جیسے وہ دنیا کی زندگی میں لیا کرتی تھیں؟

موت ایک دنیا سے دوسری دنیا میں منتقلی کا نام ہے انسانی سرگرمی و عمل کا میدان دنیا ہے اور اس امتحان گاہ سے گزرنے کے بعد وہ اپنے عمل کے مطابق جزا و سزا کے مرحلے کی طرف گامزن ہو جاتا ہے اسے عمل کا دوسرا موقع نہیں دیا جاتا۔

دنیا عمل کی جگہ ہے حساب کی نہیں اور اس کے بعد حساب کی جگہ ہوگی عمل کی نہیں۔

اب یہ تصور کرنا کہ روحیں موت کے بعد بھی عمل میں مشغول ہو سکتی ہیں اور لوگوں کو نفع نقصان پہنچا سکتی ہیں دین سے کوئی تعلق نہیں رکھتا۔

اس طرح کی توہم پرستی اسلام کے مطابق صحیح نہیں قرار دی جا سکتی اور اس سے پرہیز کرنا چاہیے۔

اس چیز کو اوہام و خرافات تک پہنچا دینا انتہائی مضرت رساں ہے اور غلط لوگ عوام کا استحصال کرنے لگتے ہیں۔ کوئی مقامی مسجدوں میں نماز نہیں پڑھتا اور لوگوں میں یہ خیال پھیلا دیتا ہے کہ وہ مسجد حرم میں جا کر نماز پڑھتا ہے۔ کوئی اپنی غیر شرعی حرکتوں کا عجیب عجیب انداز میں جواز فراہم کرتا ہے۔ مزارات سے حاجت پوری ہونے کے قصے مشہور کیے جاتے ہیں اور پھر نذریں وصول کی جاتی ہیں۔

ایک دن ایک نیک آدمی میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ میں نے سنا ہے آپ نے امام حسینؓ کے مزار پر حاضر ہونے والوں پر نامناسب انداز میں نکتہ چینی کی؟

میں نے کہا وہ کیا؟

کہنے لگا آپ جامع ازہر میں تقریر کر رہے تھے جہاں سے امام حسینؓ کی مسجد قریب ہے آپ نے عقیدۂ توحید کی وضاحت کرتے ہوئے آپ کے مزار پر جانے والوں پر نکتہ چینی کی۔

میں نے کہا کہ میں امام حسینؓ پر کیسے نکتہ چینی کر سکتا ہوں جبکہ میں امام حسینؓ اور ان کے والد حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے محبت کرتا ہوں کاش میں ان کے ساتھ کربلا میں یا صفین میں یا کسی اور معرکہ میں شہادت سے سرفراز ہوا ہوتا۔ میں اہلِ بیت کے کسی فرد کی توہین کیسے کر سکتا ہوں جبکہ میں ان کی محبت کو دین اور ان سے نفرت کو بددینی سمجھتا ہوں۔

ہاں میں نے عقیدۂ توحید پر گفتگو کی تھی اور یہ بات میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اہلِ بیت ہی سے سیکھی ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر کسی چیز یا کسی شخص سے کوئی ایسی چیز مانگتا ہے جو اللہ تعالیٰ ہی سے مانگی جاتی ہے وہ گمراہی کا شکار ہے میری نکتہ چینی کسی شخص کے خلاف نہیں بلکہ اس گمراہی کے خلاف تھی۔

اس نے کہا گویا آپ اولیاء کی کرامات کے منکر ہیں۔

میں نے کہا اولیاء کرام توحید خالص کی بدولت ہی اس بلند مقام تک پہنچے تھے اور ہمیں بھی انھیں کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے۔

اوہام و خرافات توحید ہی کو گرد آلود کرتے ہیں۔

جب تاتاریوں نے بغداد پر حملہ کیا تو بہت سے توہم پرست ابو عمر نامی کسی بزرگ کے مزار

يَا اَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِاَزْوَاجِكَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا وَ اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنَاتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا (الاحزاب۔ ۲۸-۲۹)

اے نبی اپنی بیویوں سے کہو، اگر تم دنیا اور اس کی زینت چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ دے دلا کر بھلے طریقے سے رخصت کر دوں اور اگر تم اللہ اور اس کے رسول اور دار آخرت کی طالب ہو تو جان لو کہ تم میں سے جو نیکو کار ہیں اللہ نے ان کے لیے بڑا اجر مہیا کر رکھا ہے۔

آپ نے یہ مسلک اختیار فرما کر ان یہودیوں کی مخالفت فرمائی جو صرف دنیا کی پرستش کرتے تھے اور اس کے علاوہ ہر چیز کا انکار کرتے تھے اسی طرح ان کاہنوں اور نجومیوں وغیرہ کی مخالفت فرمائی جو لوگوں کو فریب دے کر ان کے مال ہڑپ کر لیتے تھے اور لوگوں کو آخرت کی نعمتوں کا وعدہ دے کر خود دنیا کی ساری نعمتیں اپنے لیے مخصوص کر لیتے تھے۔

اللہ تعالیٰ کے لیے اخلاص اور اسلامی اقدار کی پابندی عام لوگوں میں زیادہ مل جاتی ہے بڑے لوگوں میں کم۔ عام پیشہ وروں اور محنت کشوں میں ان چیزوں کی رعایت زیادہ پائی جاتی ہے لیکن دین اور علوم و اقدار کی باتیں کرتے رہنے والے بیشتر لوگ ان سے زیادہ تر خالی نظر آئیں گے۔

عالم اسلامی میں سیاسی بگاڑ کی ذمے داری بڑی حد تک ضمیر فروش اور دنیا پرست اصحابِ دین پر ہے اور یہ بہت پرانی بیماری ہے جس کے خلاف بیدار مغز ائمہ اور مخلص داعی و علماء ہمیشہ لڑتے چلے آئے ہیں ایک منافق "بزرگ" کی خوشامد پرستی اور دنیا پرستی ایک بہکے ہوئے نوجوان کے بگاڑ سے کہیں زیادہ خطرناک ہوا کرتی ہے۔

ماہرین تربیت ان مہلک نفسیاتی بیماریوں سے بخوبی واقف ہیں۔

تاہم انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ بیماریاں صرف بڑے لوگوں ہی میں نہیں پائی جاتیں۔ میں نے بہت سے مغرور غریب اور متکبر المزاج دولت مند بھی دیکھے ہیں اور متعدد مخلص سربراہانِ مملکت اور غلط کار عوام سے بھی پالا پڑا ہے۔ دنیاوی کاموں میں مشغول متعدد لوگ ایسے

نفسیاتی و جسمانی انحرافات

اخلاص دین کی روح، سچائی کی علامت، عمل کی صحیح بنیاد اور دنیا و آخرت میں اس کی مقبولیت کی ضمانت ہے لیکن لوگوں میں یہ چیز بہت نادر ہے۔ اخلاص کا مطلب ہے صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی نیت کرنا اور بیشتر لوگ جو کچھ کرتے ہیں یا نہیں کرتے وہ ان کی شخصیات، ذاتی مفادات اور فوری فائدوں کے مقاصد کے پیش نظر ہی ہوتا ہے۔

اخلاص کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی یاد، اس کے سامنے باریابی کی تیاری اور اس باریابی کے وقت اس خوشخبری کے انتظار پر ہے کہ

وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ۔ (البقرہ ۲۲۳)

اور اللہ کی ناراضی سے بچو خوب جان لو کہ تمہیں ایک دن اس سے ملنا ہے اور مومنین کو بشارت دو۔

اللہ تعالیٰ کو پہچاننے والے، اسے پکارنے والے اور اس کی طرف بلانے والے مخلص ترین انسان حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم ہیں جنھوں نے دنیا کے بارے میں اپنا موقف ان الفاظ میں واضح فرمایا کہ:

"میرا دنیا سے کیا سروکار؟ دنیا میں میری موجودگی تو بس ایسی ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی درخت کے سائے میں تھوڑی دیر ستانے کے لیے ٹھہر جائے پھر اٹھ کر اپنی راہ لے۔"

دنیا کی طرف نگاہ نہ اٹھانے ہی کی تلقین آپ نے اپنی ازواج مطہرات رضؓ کو بھی فرمائی تھی۔

کے دن سب سے پہلے جہنم میں جھونکا جائے گا۔

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِي الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (القصص ۸۳)

اور آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کردیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقیوں ہی کے لیے ہے۔

تدین ہی کے میدان میں عبادتوں کو گندی نیتوں کو چھپانے کا ذریعہ بنایا جاتا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ امیہ بن الصلت دورِ جاہلیت میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا بیان کرنے اور اس کی وحدانیت کی طرف بلانے میں پیش پیش رہا کرتا تھا۔ جب حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تو رسالت کے انکار اور کفر میں بھی پیچھے نہیں رہا آخر کیوں؟ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم تو اس سے کہیں زیادہ شیریں الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کر رہے تھے اور کہیں زیادہ مؤثر انداز میں وحدانیت کی دعوت دے رہے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ حسد نے امیہ کے ضمیر کو کھالیا اور اس کے مزعومہ ایمان کی قلعی کھول دی۔ وہ اللہ تعالیٰ پر نہیں اپنے نفس پر ایمان رکھتا تھا اور اللہ تعالیٰ کا نام اس لیے لیتا تھا کہ لوگ اسے توحید کا علمبردار اور غیر معمولی شخص سمجھیں۔ اس نے اہلِ کتاب سے یہ بھی سن رکھا تھا کہ عنقریب کوئی نبی مبعوث ہونے والا ہے تو وہ اپنے اشعار کے ذریعہ نبوت کا امیدوار بن رہا تھا اور جب یہ ظاہر ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کا انتخاب فرمایا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ سے ناراض ہو گیا اور رسول اللہ ؐ کی مخالفت کرنے لگا۔ گویا اللہ تعالیٰ کی حمد کے اپنے قصیدوں پر شرمسار تھا۔

اس شخص کی مثال لیجیے جس نے ایک موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے مالِ غنیمت تقسیم کرنے کے بعد کہا "انصاف سے کام لیجیے۔ اس تقسیم میں اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔"

اس بدتمیزی پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ بدل گیا آپؐ نے فرمایا "اگر میں ہی انصاف نہیں کروں گا تب کون کرے گا۔ اگر میں نے انصاف نہیں

ملے جو قابلِ احترام سمجھے اور آخرت کے کاموں سے وابستہ ایسے لوگ بھی دیکھے جو دھتکار دینے کے لائق تھے۔

مقبولیت کا مرکز قلبِ سلیم ہے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کو علم ہے کہ کون سا قلب سلیم ہے۔ ہمارے شروع کے علماء نے کتنی صحیح تشخیص کی تھی کہ گناہ دو قسم کے ہوتے ہیں دل و نفس سے تعلق رکھنے والے اور اعضاء جسم و بدن سے تعلق رکھنے والے۔

جسمانی گناہ اپنی ساری برائیوں کے ساتھ کم خطرناک ہیں مثلاً زیادہ کھانا کھانا جسم کے لیے خطرناک ثابت ہوتا ہے لیکن عظمت اور خود پرستی کا جنون، دل کی سختی، فرعونیت اور ذاتی سربلندی کے لیے انسانوں اور پیداوار کو تباہ و برباد کرنے تک پہنچا دیتا ہے۔ کسی ایسے فریب خورد لیڈر یا طالع آزما سربراہ کی مہم جوئیوں میں، جو اعلیٰ صلاحیتوں سے محروم اور بدترین امنگوں کا حامل ہو، ہزارہا جانیں ضائع ہوجاتی ہیں اور ملکی پیداوار اور وسائل کو نہ جانے کتنا نقصان پہنچ جاتا ہے۔

دلوں کے امراض یا نفسیاتی ذلتیں جب کسی پر غالب آجاتی ہیں تو وہ ان سے پیچھے ہٹنا نہیں جانتا کیونکہ ان کی برائی ہی اسے محسوس نہیں ہو پاتی، ابلیس کو دیکھئے جب اس نے حضرت آدم کو سجدہ کرنے کے حکم کی نافرمانی کی تو پشیمان ہونے کے بجائے یہ کہنے لگا:

قَالَ اَرَءَيْتَكَ هٰذَا الَّذِىْ كَرَّمْتَ عَلَىَّ لَئِنْ اَخَّرْتَنِ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَاَحْتَنِكَنَّ ذُرِّيَّتَهٗ اِلَّا قَلِيْلًا۔

(بنی اسرائیل ۶۲)

پھر وہ بولا دیکھ تو سہی، کیا یہ اس قابل تھا کہ تو نے اسے مجھ پر فضیلت دی؟ اگر تو مجھے قیامت کے دن تک مہلت دے تو میں اس کی پوری نسل کی بیخ کنی کر ڈالوں بس تھوڑے ہی لوگ مجھ سے بچ سکیں گے۔

نفس پرستی یا اپنی ذات کے ارد گرد گھومنے کا مرض صرف گندے طریقوں سے سربراہی حاصل کرنے ہی میں ظاہر نہیں ہوتا بلکہ کبھی کبھی کسی مشہور شخصیت میں کیڑے نکالنے، کسی نرالی رائے کو اختیار کرنے، گفتگو کرنے میں اپنی جھک پر اڑے رہنے اور بڑائی جتلانے اور اسی طرح کی دیگر چیزوں کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ اور ایسے ہی لوگوں کو قیامت

اس طرح کے لوگ دین کے لیے ایک مصیبت اور اس کے پھیلاؤ میں رکاوٹ ہیں۔
حضرت عبداللہ بن عمرؓ انھیں بدترین لوگ قرار دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ جو آیتیں کفار کے بارے میں نازل ہوئی تھیں ان کو ان لوگوں نے مومنین پر منطبق کر دیا۔

اور اس کی وجہ ان کی کج فہمی اور نا سمجھی تھی۔ احکام کے سمجھنے اور انھیں تطبیق دینے میں اسی طرح کی کند ذہنی و غلط کاری کے تعلق سے حضرت علیؓ کی روایت میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:
"بعد کے زمانے میں کچھ کم عقل نا سمجھ لوگ نکلیں گے جو بہترین باتیں کریں گے لیکن ایمان ان کے گلے سے نیچے نہیں اترا ہوگا اور دین سے وہ اسی طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار میں سے چیر کر نکل جاتا ہے"۔

یعنی ان کے عمل و کردار کا دین کی رُوح اور مقصد سے کوئی سروکار نہیں ہو گا بلکہ عبادت کی ظاہری صورت تو نظر آئے گی لیکن ان کے اخلاق بدترین، دل سخت اور عمل بُرے ہوں گے۔

اور دین اس طرح کی چیزوں سے بہت دُور ہے۔

دل کی سختی اور اندھاپن ایک خدائی لعنت ہے جو عہد توڑنے والوں، تقویٰ کے دائرے سے نکل جانے والوں اور ایمان کے ساتھ کھلواڑ کرنے والوں پر اترتی ہے۔

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِيثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوبَهُمْ قَاسِيَةً۔ (المائدۃ ۱۳)

پھر یہ ان کا عہد کو توڑ ڈالنا تھا جس کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دُور پھینک دیا اور ان کے دل سخت کر دیے۔

دل کی سختی انھیں خود پرستی، عدم تواضع و عدم وانکسار، دوسروں پر الزام تراشی اور کوئی عذر نہ قبول کرنے، نیز غلطی کر جانے والوں کو بدخواہی کے ساتھ رسوا کرنے پر آمادہ کرتی ہے۔ جب کہ یہ اوصاف ایمان کی بالکل ضد ہیں۔ ایمان تو اپنی ذات کے انکار، دوسروں سے محبت، خطاکار کی خطا پر پردہ ڈالنے، اسے ٹھوکر لگنے کے بعد سنبھالنے اور اس کی توبہ سے انتہائی خوش ہونے کا نام ہے۔

ایمان نام ہے بڑوں کی عزت، چھوٹوں پر شفقت اور علماء کی قدر دانی کا۔

ایمان یہ ہے کہ لوگوں کو خوش حال دیکھ کر خوشی محسوس ہو، ان کے مصائب پر تکلیف و رنج ہو، چاہے آپ پر اس کا کوئی اثر نہ پڑے۔

کیا تو یہ تو میرے لیے ناکامی وخسارے کی بات ہوگی۔"

یہاں اس شخص کی بے ادبی کی طرف توجہ دلانا مقصود نہیں بلکہ اس حماقت کے پس پشت کارفرما جذبے کی طرف دھیان دلانا مقصود ہے، جو بڑے رہنماؤں پر نکتہ چینی کرتا ہے وہ عام طور پر اپنے آپ کو ان سے برتر اور زیادہ صاف ستھرا سمجھتا ہے اور اپنی نکتہ چینی کے ذریعہ لوگوں پر یہی جتلانا چاہتا ہے۔

وہ شخص گویا معلم انانیت سے کہہ رہا تھا کہ "تم نہیں جانتے مجھ سے سنو" پھر شاید اپنے گھر جا کر غرور سے کہتا کہ "آج میں نے محمدؐ کو سبق سکھا دیا ہے۔"

اگر وہ کند ذہن تقسیم میں فرق کے اسباب کو سمجھنا چاہتا تو ویسی ہی گزارش کرتا اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ جواب پاتا کہ "میں کسی شخص کو دیتا ہوں ـــ جبکہ دوسرا شخص مجھے زیادہ محبوب ہوتا ہے ـــ اس ڈر سے کہ کہیں اللہ تعالیٰ اسے جہنم میں نہ ڈھکیل دے۔ اس طرح کے لوگوں کو تالیفِ قلب کے لیے دیتا ہوں اور دوسرے لوگوں کو ان کے دلوں میں جاں گزیں ایمان کے سپرد کر دیتا ہوں۔"

کچھ لوگوں کی رہنمائی ان کے پیٹوں کے راستے سے کی جاتی ہے جبکہ دوسروں کی عقل و دل کے ذریعہ۔ حضرت عمرؓ نے اس گستاخ کو قتل کرنے کی اجازت مانگی لیکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انکار فرمادیا۔

اس طرح کے لوگوں پر خبیث نفسیاتی امراض کا غلبہ ہوتا ہے اور انھیں دور کرنے کے بجائے برقرار رکھتے ہیں اور زیادہ عبادت گزاری کا مظاہرہ کر کے ان پر پردہ ڈالتے ہیں۔

اگر آدمی بخیل ہو تو اس کا علاج یہ ہے کہ وہ بار بار سخاوت کا کام کرے۔ کچھ دنوں میں اس کی عادت ہی ایسی بن جائے گی اور وہ ایک فطری انسان بن جائے گا لیکن اس کے بجائے اگر وہ لمبی لمبی نمازیں پڑھنے لگے تو اس کا بخل کا مرض دور نہیں ہوگا۔

کینہ و ذات پرستی کے شکار لوگ عبادت کی ظاہری صورتوں میں زیادہ مشغول نظر آتے ہیں اور جب موقع پاتے ہیں اپنا وار کر جاتے ہیں۔ ایسے لوگ بڑی تعداد میں حضرت علیؓ کے لشکر میں تھے لیکن انھوں نے ایسا الجھایا کہ آپ کی فتح شکست میں بدل گئی وہ نعرہ لگانے لگے کہ "اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلے گا" اس پر حضرت علیؓ نے فرمایا تھا "یہ ایک حق بات ہے لیکن اس سے مراد باطل لیا جا رہا ہے۔"

کل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة۔ | میں نکالی جانے والی) ہر نئی چیز بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔

۲۔ انسان کے گھڑے ہوئے ان اضافات کو تسلیم کرنا انسان کو عقائد و عبادات وغیرہ میں قانون و حکم بنانے کا حق دینا ہوگا جبکہ یہ حق اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہے۔

أَمْ لَهُمْ شُرَكَاءُ شَرَعُوا لَهُمْ مِنَ الدِّينِ مَا لَمْ يَأْذَنْ بِهِ اللَّهُ۔ (الشوریٰ ۲۱)

کیا یہ لوگ کچھ ایسے شریکِ خدا رکھتے ہیں جنھوں نے ان کے لیے دین کی نوعیت رکھنے والا ایک ایسا طریقہ مقرر کیا جس کی اجازت اللہ نے نہیں دی۔

قرآن کریم میں ان لوگوں کی سخت مذمت کی گئی ہے جو حلال و حرام کا فیصلہ کر لیتے ہیں اور اسے اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کر دیتے ہیں جبکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت نہیں دی۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَا تَصِفُ أَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هَٰذَا حَلَالٌ وَهَٰذَا حَرَامٌ لِتَفْتَرُوا عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ إِنَّ الَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُونَ مَتَاعٌ قَلِيلٌ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ (النحل ۱۱۶-۱۱۷)

اور یہ جو تمہاری زبانیں جھوٹے احکام لگایا کرتی ہیں کہ یہ چیز حلال ہے اور وہ حرام تو اس طرح کے حکم لگا کر اللہ پر جھوٹ نہ باندھو جو لوگ اللہ پر جھوٹے افترا باندھتے ہیں وہ ہرگز فلاح نہیں پایا کرتے۔ دنیا کا عیش چند روزہ ہے آخر کار ان کے لیے دردناک سزا ہے۔

لہٰذا ایجاد کردہ اضافے مسترد کر دیے جانے ہی کے لائق ہیں چاہے وہ افراد کے کیے ہوئے ہوں یا کمیٹیوں اور اکیڈمیوں کے۔ کیونکہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اپنے پاس سے شریعت ایجاد کرے اب وہ جو کچھ بھی ایجاد کرے گا وہ صرف گمراہی و نفس پرستی ہوگی۔

۳۔ دینی ذہن کی دینی امور میں جدت طرازی میں مشغولیت نے دنیاوی امور کو سخت نقصان پہنچایا کیونکہ دینی ذہن رکھنے والوں نے اپنی ساری ذہنی توانائی ایسی ایجادات میں لگا دی جن کی نہ کوئی اہمیت تھی اور نہ جن میں کوئی بھلائی۔ جبکہ دینی معاملات میں اتباع و پیروی ہی اصل ہے اور دنیاوی امور میں جدت و اختراع۔ حدیث میں آتا ہے کہ "تم اپنے دنیاوی امور

بدعت کا مطلب

دین میں نئی چیزیں ایجاد کرنا ایک ایسا رجحان ہے جو بہت سے دیندار لوگوں پر غالب آجاتا ہے پھر اس رجحان کے بنا پر انھیں یہ اچھا لگنے لگتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ اعمال و حرکات ایجاد کریں اور انھیں اللہ کے دین کا ضمیمہ یا حصہ بنا کر لوگوں سے ان پر اسی طرح عمل کرنے اور اختیار کرنے کا مطالبہ کرنے لگیں جیسے وہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی فرمودات کے تعلق سے کرتے ہیں۔

اسلام نے اس جدت طرازی کو مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر یکسر مسترد کر دیا ہے۔

۱۔ اگر ہم دین میں اس نئے ضمیمہ کو تسلیم کرلیں اور یہ سمجھنے لگیں کہ اصل دین واقعی اس کا ضرورت مند ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے دین کو ناقص صورت میں نازل کیا تھا جو بالکل لغویات ہے۔ اللہ تعالیٰ صاف اعلان کر چکا ہے۔

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔ (المائدۃ ۳)

آج میں نے تمہارے دین کو تمہارے لیے مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا۔

اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان موجود ہے کہ:

ایاکم و محدثات الامور فان — (دین میں) نئے نئے امور سے بچنا کیونکہ (دین

ہے۔ تو اسے پڑھ لیا کرو۔ اس کا پڑھنا فرض یا نفل نہ قرار دو کیونکہ فرائض و نوافل بنانا اللہ کا کام ہے کسی مخلوق کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے بندوں سے یہ کہے کہ میں نے تمہارے لیے فلاں فلاں حکم بنا دیے ہیں انھیں نماز یا زکوٰۃ میں بڑھا کر اللہ تعالیٰ سے تقرب حاصل کرو۔

ایک شخص جو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے نام سے کوئی حدیث گھڑتا ہے اور دوسرا کوئی مسلک یا روایت یا عمل ایجاد کرتا ہے پھر اسے سچا دین اور آخرت تک پہنچنے کا راستہ سمجھنے لگتا ہے دونوں میں آخر فرق کیا ہے؟

دونوں ہی بدترین جھوٹ کے مرتکب ہیں۔

جب دینی مزاج رکھنے والوں کا ایمان گرد آلود ہو جاتا ہے اور وہ ہوش و خرد سے بیگانے ہو جاتے ہیں تو ان تین چیزوں میں سے کوئی چیز ضرور کرتے ہیں:

۱۔ یا تو نصوص شرعیہ کو معطل کر کے اللہ تعالیٰ کے حکم کو پسِ پشت ڈال دیتے ہیں اور یہ صاف نافرمانی ہے۔

۲۔ یا پھر اپنے ذہنوں میں مختلف چیزوں کی ترتیب الٹ پلٹ لیتے ہیں چھوٹی چیزوں کو اولیت دینے لگتے ہیں اور بڑی چیزوں کو ثانوی حیثیت۔ اس سے چیزوں کی حقیقت الٹ جاتی ہے لہٰذا وہ بڑی بڑی اہم چیزوں کو نظر انداز کرنے لگتے ہیں اور چھوٹی چھوٹی حقیر چیزوں پر غور و خوض کرتے رہتے ہیں اس شخص کی طرح جس نے حضرت حسن بصریؒ سے اس کپڑے میں نماز پڑھنے کا مسئلہ پوچھا تھا جس میں مچھر کا خون لگا ہو تو انھوں نے دریافت فرمایا کہ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟ اس نے بتایا عراق (کوفہ) کا، تو فرمایا تم لوگ مچھر کے خون کے بارے میں تو مسئلہ پوچھتے ہو اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی کے فرزند کا خون بہانا مباح سمجھتے ہو؟

دین کے سمجھنے میں اسی نفسیاتی کجی کی تصویر کشی متنبیؒ نے اپنے اس شعر میں کی تھی۔

اغایۃ الدین ان تحفوا شواربکم

یا امۃ ضحکت من جہلہا الامم

کے بارے میں زیادہ باخبر ہو"، لیکن ان فریب خوردہ لوگوں نے اس اصول کو الٹ پلٹ دیا اور دینی تعلیمات میں جدت طرازیاں کرنے لگے جبکہ دنیاوی امور میں جمود و تعطل اختیار کر لیا جو ملّت کی پسماندگی اور بربادی کا ذریعہ وسبب بن گیا۔

۴۔ نئی نئی بدعتوں سے چمٹنا خود اصل سنتوں کی قیمت پر ہونا ہے جو لوگ اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے کچھ چیزیں ایجاد کرتے ہیں وہ انھیں کے لیے سرگرم و پُرجوش ہوتے ہیں اور اللہ اور رسولؐ کی ثابت شدہ تعلیمات کے مقابلے میں وہی ان کی خواہشات سے زیادہ قریب ہوتی ہیں پھر ان کی ادائگی کے لیے جو محنت کی جاتی ہے اس کے بعد بہت کم توانائی باقی رہ جاتی ہے جس سے اللہ اور رسولؐ کے احکام کی پیروی کی جا سکے اس طرح جو بدعت بھی رائج ہوتی ہے وہ کسی سنت کو نظر انداز کرنے ہی کا ذریعہ بنتی ہے۔

۵۔ دین کا مزاج عمومی ہے دین تمام انسانوں کی تنظیم کے لیے ہے اور کسی شخص کا خصوصی رجحان عمومیت کی دلیل نہیں بن سکتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک شخص نے مجھے اپنا تصنیف کردہ ایک کتابچہ دکھایا جس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم پر درود کی عبارتیں لکھی ہوئی تھیں وہ انھیں بہت بہتر سمجھتا تھا اور عوام میں پھیلانے کا خیال رکھتا تھا میں نے پڑھا تو اس میں گرمجوشانہ جذبات کی کارفرمائی تھی میں نے کہا جذبہ تو قابلِ قدر ہے لیکن اس میں کچھ جملے مبہم اور تکلف سے پُر ہیں میں نے مصنف سے کہا کہ اسے اپنے ہی لیے خاص رکھو لوگوں کو اس میں نہ الجھاؤ اس نے کہا: کیوں؟ میں نے کہا: رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو سکھا دیا ہے کہ وہ آپ پر کیسے درود بھیجیں۔ صحیح احادیث موجود ہیں اور پانچوں نمازوں کے آخری قعدوں میں تحیات کے بعد مسلمان اسے پڑھنے کے عادی ہو چکے ہیں اس لیے اب تمہاری اس تصنیف کی کوئی ضرورت نہیں۔ اس نے کہا اس سے دل میں اچھا اثر پیدا ہوتا ہے۔ میں نے کہا۔ تمہارے دل میں ہوتا ہے تو ٹھیک ہے لیکن تمہیں یہ حق نہیں کہ تم جو کچھ اچھا سمجھ بیٹھے ہو اس کا مکلّف لوگوں کو بھی بناؤ۔ لوگوں کا وقت اوّلاً اللہ تعالیٰ کی ملکیت ہے پھر خود ان کی۔ تمہیں اس کا حق نہیں کہ اپنے پاس سے ایجاد کردہ کسی معاملے میں ان کا وقت لگا دو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا سکھایا ہوا درود آدھے منٹ سے زیادہ نہیں لیتا اس کے بعد لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ سکتے ہیں۔ اگر تمہیں اپنی تصنیف بہت پسند

جن کی اصل تو دین ہے لیکن ان کی ہیئت دین کی بتائی ہوئی ہیئت سے مختلف ہوتی ہے مثلاً جمعہ کے دن سورۂ کہف کی کچھ آیتوں کی تلاوت اچھی چیز ہے لیکن اس تلاوت کو نمازِ جمعہ کے شعائر میں بنا دینا اور لوگوں کو اسے نماز سے پہلے سننے کے لیے اکٹھا کرنا نہ کبھی رسول اللہؐ کے دور میں ہوا نہ صحابہ کرامؓ و تابعینؒ کے دور میں۔

اسی طرح مقررہ اوقات میں اور متعین تعداد میں اللہ تعالیٰ کے ذکر یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود و سلام کے لیے مخصوص اوراد مقرر کرنا بھی ہے۔

بدعات میں سے بھی کچھ عمل سے اور کچھ چھوڑنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ واضح قاعدہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے سبب کے وجود اور کوئی رکاوٹ نہ ہونے کے باوجود جس چیز کو چھوڑ دیا اسے چھوڑ دینا ہی سنت اور اسے کرنا بدعت ہے۔

لوگ مرتے تھے تو نماز پڑھنے کے بعد دفن کر دیے جاتے تھے پھر سرسری طور پر تعزیت قبول کر لی جاتی تھی۔ بسا اوقات پڑوسی کھانا تیار کر کے بھیج دیتے تھے کہ میت کے گھر والے دوسری ہی چیز میں مشغول ہیں انھیں کھانا تیار کرنے کا موقع ہی نہیں۔

لیکن آج کے مسلمان کسی کے انتقال کے بعد یہ ضروری سمجھنے لگے ہیں کہ شامیانوں یا ہالوں میں جمع ہو کر قرآن خوانی کریں۔ آنے والوں کا استقبال کیا جائے اور چائے پانی اور سگریٹ وغیرہ سے ان کی تواضع کی جائے اور میت کے گھر والوں پر غیر ضروری بوجھ لد جائے۔

عوام سمجھنے لگے ہیں کہ مجمع میں اکٹھا ہو کر قرآن خوانی ناگزیر ہے۔

جبکہ علماء اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے ایسا نہیں کیا جبکہ لوگ اس وقت بھی وفات پاتے تھے اور ثواب کا حصول بھی مطلوب تھا اور رکاوٹ بھی نہیں تھی۔

لہٰذا ایسی صورت میں اس طرح قرآن خوانی کرنا بدعت ہے اور اس کا ترک سنت۔

کتنی ہی ایسی چیزیں ہیں جنھیں سلفِ صالح نے نہیں کیا اور آج کے مسلمان انھیں دین سمجھ کر کرنے کے شوقین ہیں بلکہ ان کی حیثیت ان کے نزدیک ثابت شدہ صحیح دین سے بھی زیادہ اہم ہو چکی ہے۔

کیا دین کا منتہائے مقصود یہی ہے کہ تم اپنی مونچھیں صاف کروالو۔
اے وہ قوم جس کی جہالت پر ساری قومیں خندہ زن ہیں۔

یہ ان لوگوں کے بارے میں ہے جو داڑھی مونچھ کو دین کی سب سے اہم چیز سمجھ بیٹھے تھے۔

۲۔ یا پھر وہ چیزوں کو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق نہیں بلکہ خود اپنی طرف سے اچھا یا بُرا سمجھنے لگیں اور دین کے معاملات اور اصول و فروع میں ایسی بہت سی بدعتیں گھڑ کر شامل کرنے لگیں جو جسم میں سرطان کی طرح سرایت کر جائیں اور جب تک اس حصّہ کو کاٹ کر پھینک نہ دیا جائے برابر بڑھتی رہیں۔

ہر بدعت مسترد کیے جانے ہی کے لائق ہے تاہم اپنی ضرر رسانی کے اعتبار سے سب کے درجات مختلف ہوتے ہیں جیسے کوئی گناہ قابلِ قبول نہیں ہوتا لیکن گناہ صغیرہ بھی ہوتا ہے اور کبیرہ بھی اور دونوں کا حکم الگ الگ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے چھوٹی چھوٹی بدعتوں کے خلاف جنگ پر اتنی شدّت سے زور نہیں دینا چاہیے جتنا شدید زور بڑی بڑی بدعتوں کے خلاف جنگ پر دینا ضروری ہے۔ زکام سے اتنا نہیں ڈرا جاتا جتنا سنگین قسم کے بخاروں سے ڈرا جاتا ہے۔

لیکن سنت پر زور دینے والے بہت سے لوگ ان دونوں باتوں میں فرق نہیں کر پاتے چھوٹی بدعت میں مبتلا شخص کے ساتھ بھی وہی معاملہ کرتے ہیں جو بڑی بڑی بدعتوں میں مبتلا لوگوں کے ساتھ کرتے ہیں اور اس حدیث کا حوالہ دیتے ہیں کہ "ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی کی جگہ جہنم ہے"۔ اور اس بات کو فراموش کر دیتے ہیں کہ صغیرہ گناہ کا مرتکب ویسا ہی گناہ گار نہیں جیسا کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

بدعتیں اپنے شر کے اعتبار سے مختلف درجات رکھتی ہیں علماء نے ان کی تفصیل لکھی ہے اور انھیں سمجھنا چاہیے تاکہ ان سے بحسن و خوبی نمٹا جاسکے۔

یہاں ہم چند عام بدعتوں کا ذکر کریں گے جن میں کچھ حقیقی ہیں اور کچھ اضافی ــــــ مثلاً بعض قبروں کے اِرد گرد اس طرح طواف کیا جاتا ہے جیسے کعبہ شریف کے اِرد گرد۔ ظاہر ہے اس بدعت کا دین سے کوئی تعلق نہیں اور یہ حقیقی بدعت ہے۔ اضافی بدعتیں وہ ہیں

دُنیا و آخرت

آخرت بالکل حقیقی چیز ہے اور اسے کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا لیکن اس کا مطلب دنیا سے آنکھیں پھیر لینا نہیں ہے۔ بالکل ویسے ہی جیسے آپ مستقبل کی بات کریں اور اس کے لیے تیاری کی ضرورت پر زور دیں لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوسکتا کہ آپ اپنے حال اور اس کی ضروریات کو نظر انداز کر دیں۔

دعوت و تربیت کے میدان میں کام کرنے والے کچھ لوگ اس حقیقت کو ذہن میں نہیں رکھتے نتیجہ میں اچھائی سے زیادہ خرابی پیدا ہوتی ہے اور لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ دین گویا دنیا کا دشمن ہے اور تقویٰ اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک آدمی پراگندہ حال نہ ہو جائے اور وہ زندگی کے حقائق، مادہ کے قوانین اور کائنات میں اللہ تعالیٰ کی سنت سے نابلد نہ ہو۔ اس سلسلے میں عقلی توازن میں بگاڑ نے مسلمانوں کی ایسی نسلیں پیدا کر دیں جن میں نہ دین کی سمجھ ہی پیدا ہوئی نہ دنیا ہی انھیں حاصل ہوسکی۔ بلکہ مسلمانوں کی تہذیبی پسماندگی میں اور اسباب کے علاوہ اس سبب کا بھی بڑا دخل ہے۔

بلاشبہ دین میں آخرت اور جنت و جہنم کے بارے میں بہت ساری باتیں موجود ہیں لیکن ان کا مقصد انسان کو صحیح راستے پر لانا، آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے سے روکنا اور اسے وسیع تر افق اور دائمی زندگی کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

دنیا کو سمجھنے میں کوتاہی، روئے زمین پر بے چارگی اور زندگی کی باگ ڈور اپنے

حقیقت یہ ہے کہ کسی چھوٹی بڑی بدعت کو تسلیم نہیں کیا جاسکتا کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "جس نے بھی ہمارے اس معاملہ (دین) میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جو اس کا حصّہ نہیں تو وہ اسی کے منہ پر ماردی جائے گی۔"

لیکن اس مرض کے علاج کے لیے حکمت ودانائی اور صبر وتحمل سے کام لینا چاہیے اور یہ مدِّ نظر رکھنا چاہیے کہ مکروہ سے پہلے حرام سے بچنا ضروری ہے اور ملت کو بنیادی دینی اصولوں پر اکٹھا کرنا لازمی ہے۔

بدعتوں کی برائی اسلامی معاشرہ میں دُور دور تک اثر انداز ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میرے دفتر میں ایک ملازم اکثر اونگھتا رہتا تھا مجھے معلوم ہوا کہ وہ کسی صوفی سلسلہ سے تعلق رکھتا ہے تو میں نے اس سے اس کے مقررہ اوراَد معلوم کیے۔ پتہ چلا وہ تقریباً دس لاکھ کی تعداد میں اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ، بعض آیات اور الفاظ کا ورد ہر رات کرتا ہے بیچارے کے اونگھنے کا سبب ظاہر ہوگیا اور مجھے ڈر لگنے لگا کہ وہ کسی دن ہوش ہی نہ کھو بیٹھے۔

کو فروغ حاصل ہوسکتا ہے۔

ہاں مال و دولت کو گمراہی و سرکشی، کبر و نخوت اور بخل و بگاڑ کا ذریعہ نہیں بننے دینا چاہیے بلکہ اسے دین کے مقاصد کی خدمت کے لیے حاصل کرنا چاہیے۔

دولت کا فتنہ بھی قابلِ نفرت ہے اور فقر و لاچاری کا فتنہ بھی۔ کبھی مالدار سرکشی اختیار کرتا ہے اور فقیر ذلت۔ لیکن مومن نہ سرکش بنتا ہے نہ ذلت اختیار کرتا ہے۔ بہت سے مالدار شکر گزار اور بہت سے غریب عزت و خودداری سے زندگی گزارنے والے بھی ہوتے ہیں۔

آخر مسلمانوں کو اس سے کیا فائدہ ہوسکتا ہے کہ وہ دنیا سے دست کش ہوجائیں اور دوسرے اس پر قابض ہوجائیں۔ اس طرزِ فکر سے ملت کا کارواں کیسے آگے بڑھ سکتا ہے جب یہ سمجھایا جانے لگے کہ حضرت عثمان و حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہما جیسے مالدار بھی جنھوں نے اپنی ساری دولت اسلام کی خدمت کے لیے وقف کر رکھی تھی جنت میں بے مال و دولت والے لوگوں سے بہت بعد میں داخل ہوسکیں گے۔

ابن کثیرؒ نے اپنی تفسیر میں ایک عجیب و غریب اسرائیلی حکایت درج کی ہے۔ دو آدمی ایک تجارت میں شریک تھے جس کا کل سرمایہ آٹھ ہزار دینار تھا ایک شریک نیک اور دوسرا بدکار تھا۔ بدکار ہنرمند اور نیک شخص بے ہنر تھا اس لیے بدکار نے تنگ آکر وہ کمپنی توڑ دی (ہم پوچھتے ہیں کہ مومن ہنرمند کیوں نہیں ہوتا جبکہ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہنرمند مومن کو پسند کرتا ہے) دونوں شریک اپنا اپنا حصّہ لے کر الگ ہوگئے۔

بدکار شخص نے ایک ہزار دینار سے اپنے لیے ایک گھر خریدا۔ نیک شخص نے ایک ہزار صدقہ کردیا تاکہ اسے جنت میں گھر مل جائے (ہم پوچھتے ہیں کہ آخر نیک آدمی کا دنیا میں گھر کیوں نہ ہو؟) پھر بدکار شخص نے ایک ہزار دینار سے شادی کرلی۔ نیک شخص نے ایک ہزار دینار صدقہ کردیا تاکہ اسے جنت میں حور ملے (ہم پوچھتے ہیں کہ اسی نیک شخص نے دنیا میں کسی عورت سے شادی کرکے دونوں کو گناہ سے بچانے کا سامان کیوں نہیں مہیا کیا اور اس بیوی پر خرچ کرکے بے شمار نیکیاں کیوں نہیں کمائیں؟) پھر بدکار شخص نے باقی دو ہزار دینار سے باغات خرید لیے جبکہ نیک شخص نے اپنے باقی دو ہزار دینار بھی صدقہ کردیے اور فقیر و بے چارہ ہوگیا۔

ہاتھ میں لینے سے محرومی و مجبوری کا نام تقویٰ نہیں ہو سکتا یہ تو طفلانہ طرزِ فکر ہے جس سے دین اور دین کے مقاصد کو بے اندازہ نقصان پہنچتا ہے۔ آخر اللہ تعالیٰ کی بخشی ہوئی صلاحیتوں سے کام نہ لے کر مجبوری و بے چارگی اختیار کرنے سے اسلام کی کون سی خدمت ہو سکتی ہے۔؟

علماء کہتے ہیں کہ کسی عمل کی صحت و قبولیت کے لیے نیک نیتی و سلامت روی ضروری ہے۔ سلامت روی کا مطلب یہ ہے کہ عمل نقل و عقل کے مطابق ہو مثلاً اگر کوئی شخص کھانے پینے کے بجائے بات چیت کا روزہ رکھے یا بغیر رکوع و سجود کے نماز پڑھے تو یہ عمل بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔

میں نے ایک واعظ کو سورہ "تکاثر" کی تفسیر بیان کرتے ہوئے سنا وہ لوگوں کو دنیا سے بے رغبتی کی تلقین کر رہا تھا مجھے خیال آیا کہ ہم لوگوں نے اس بات کو کتنا غلط سمجھ رکھا ہے۔ یہ سورہ زندگی کی بُرے پہلو کی بہت باریک بینی سے تصویر کشی کرتی ہے۔ آج دنیا کی چیزیں جمع کرنے کی ایک مجنونانہ دوڑ جاری ہے جس نے مال و دولت کے صحیح استعمال سے لوگوں کو غافل کر رکھا ہے اور یقیناً یہ قابلِ مذمت صورت ہے کیونکہ یہ دنیا کی پرستش اور دنیا سے ماورا چیزوں سے غفلت کی نمائندگی کرتی ہے لیکن، مال و دولت کے بارے میں اللہ تعالیٰ یہ بھی فرماتا ہے کہ:

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَعْرُوفًا۔ (النساء ۵)

اور اپنے وہ مال جنھیں اللہ نے تمہارے لیے قیام زندگی کا ذریعہ بنایا ہے نادان لوگوں کے حوالہ نہ کرو البتہ انھیں کھانے اور پینے کے لیے دو اور انھیں نیک ہدایت کرو۔

یعنی مال و دولت حاصل کرنا اور ان کو بڑھانا بھی حق ہے اس سے مومن اپنے فرائض سے غافل نہیں ہوتا بلکہ ان کی ادائگی میں مدد حاصل کرتا ہے۔ اس آیت کا مقصد آخرت کی طرف متوجہ کرنا ہے۔ دنیا سے غافل کرنا نہیں۔ فقر و لاچاری سے نہ اسلام کی کوئی خدمت ہو سکتی ہے نہ اسے طاقت مل سکتی ہے نہ اس کی تعلیمات

کہ اسے۔ جو خوشحالی اللہ تعالیٰ نے دی ہے وہ صرف اس کی اپنی ذات کے لیے نہیں ہے بلکہ اس میں ان لوگوں کا بھی حصہ ہے جو تنگ دست اور پریشان حال ہیں۔

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا۔

(الفجر ۱۵-۲۰)

مگر انسان کا یہ حال ہے کہ اس کا رب جب اسے آزمائش میں ڈالتا ہے اور اسے عزت و نعمت دیتا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میرے رب نے مجھے عزت دار بنا دیا اور جب وہ اس کو آزمائش میں ڈالتا ہے اور اس کا رزق اس پر تنگ کر دیتا ہے تو وہ کہتا ہے میرے رب نے مجھے ذلیل کر دیا۔ ہرگز نہیں، بلکہ تم یتیم سے عزت کا سلوک نہیں کرتے اور مسکین کو کھانا کھلانے پر ایک دوسرے کو نہیں اکساتے اور میراث کا سارا مال سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال کی محبت میں بری طرح گرفتار ہو۔

یعنی خوشحالی و دولت بھی آزمائش ہے اور فقر و تنگ دستی بھی۔ یہ تصور کرنا غلط ہے کہ خوشحالی باعث عزت افزائی اور تنگ دستی باعث اہانت ہے۔ اعتبار تو نتائج کا ہوگا جو تنگ دستی میں پاکیزگی اختیار کرتا ہے وہ خوشحالی کی وجہ سے سرکشی کرنیوالے شخص کے مقابلے میں یقیناً اللہ تعالیٰ کے یہاں زیادہ بہتر مقام پر فائز ہوگا۔ اور جسے خوشحالی ملی اور اس نے اپنے دروازے یتیموں اور مسکینوں کے لیے کھول دیے نیز خرچ کی جگہوں پر خرچ کرنے میں پیچھے نہیں رہا وہ امتحان میں کامیاب رہنے والا اور میدان میں سبقت لے جانیوالا ہے۔ حدیث میں دینے والے ہاتھ کو ہی افضل بتایا گیا ہے لینے والے ہاتھ کو نہیں۔

اب جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت میں سے اس کا حق ادا کرتے ہوئے جس کو دے رہا ہے اسے کمتر و ذلیل سمجھے وہ دین و دنیا دونوں کے تعلق سے سنگین قسم کے غلط طرز فکر میں مبتلا ہے اور اس کے نتیجے میں، دولت مندوں کے خلاف آتش حسد و نفرت بھڑک اٹھتی ہے۔ کفر و الحاد کی آندھیاں چلنے لگتی ہیں اور پوری انسانیت کا مستقبل خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔ کیا کیمونزم اسی طرح کی فضا میں نہیں پھیلا تھا؟

اس طرح کی منطق زندگی کے لیے تباہ کن ہے۔ میرا مقصد زندگی کی خوبصورتی کا قصیدہ پڑھنا نہیں کیونکہ میں بحیثیت مسلمان جانتا ہوں کہ ہماری جانیں اور ہمارے مال سب اللہ کے لیے ہیں اور آج دنیا کی قومیں ہم پر اسی لیے غالب آرہی ہیں کہ ہم میں دنیا کی محبت اور موت سے نفرت پیدا ہو گئی ہے۔

میں صرف یہ بتانا چاہتا ہوں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں موت جہاد ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں زندگی گزارنا بھی جہاد ہے۔ دنیا کمانے میں ناکامی دین کی مدد کرنے میں ناکامی کا سبب بنتی ہے جس کے پاس مال ہو گا وہی تو خرچ کر سکے گا اسی لیے تو حدیث میں آتا ہے کہ طاقتور مومن کمزور مومن سے بہتر ہے۔

منفی طرزِ فکر سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهُ مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ۔

(ھود۔ ۹-۱۱)

اگر کبھی ہم انسان کو اپنی رحمت سے نوازنے کے بعد پھر اس سے محروم کر دیتے ہیں تو وہ مایوس ہوتا ہے اور ناشکری کرنے لگتا ہے اور اگر اس مصیبت کے بعد جو اس پر آئی تھی ہم اسے نعمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو کہتا ہے کہ میرے تو سارے دلدّر دُور ہو گئے پھر وہ پھولا نہیں سماتا اور اکڑنے لگتا ہے۔ اس عیب سے پاک اگر کوئی ہیں تو بس وہ لوگ جو صبر کرنے والے اور نیکوکار ہیں اور وہی ہیں جن کے لیے درگزر بھی ہے اور بڑا اجر بھی۔

ان آیات سے پتہ چلتا ہے کہ انسان خوشحالی و تنگ دستی کی صورتوں میں فخر و مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے جبکہ اسے دونوں صورتوں میں اپنے دل پر قابو رکھنا چاہیے اور اپنے کردار کو نہیں بھولنا چاہیے اور مومن کی یہی ذمّے داری ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی محسوس کرتا ہے

کے یہاں جانے کی خواہش بھی نہیں ہوئی کیونکہ امام جعفرؒ کی محبت زیادہ جوش پر تھی۔

کئی دن کے بعد جب میرا صبر جواب دینے لگا تو عصر کی نماز کے بعد پھر میں امام جعفرؒ کے دروازے پر حاضر ہوا اور اجازت چاہی ایک خادم نکلا اور دریافت کیا کہ کیا کام ہے؟ میں نے عرض کیا سلام کے لیے حاضر ہوا ہوں اس نے بتایا کہ وہ ابھی نماز میں مشغول ہیں۔ میں انتظار کرنے لگا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد خادم نکلا اور کہا آجائیے۔

میں اندر گیا اور سلام کیا۔

امام صاحب نے جواب دیا اور دُعا دی۔

میں بیٹھ گیا۔ امام صاحب نے کچھ دیر سکوت فرمایا پھر میرا نام دریافت فرمایا۔

میں نے نام بتایا تو آپ نے پھر دُعا دی اور فرمایا، کس لیے آئے ہیں۔

میں نے اپنے دل میں سوچا کہ اگر اس ملاقات میں یہ دُعا ہی مل گئی تو میرے لیے بہت ہے۔

پھر عرض کیا: میں نے اللہ تعالیٰ سے دُعا کی ہے کہ وہ میرے لیے آپ کے دل میں جگہ پیدا کر دے اور آپ کے علم سے فیض پہنچائے۔ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میری دُعا قبول کر لی ہے۔

امام صاحب نے فرمایا: میاں! علم سیکھنے سے نہیں آتا یہ تو ایک نور ہے جو اللہ تعالیٰ اس شخص کے دل میں ڈال دیتا ہے جسے ہدایت دینا چاہتا ہے۔

اگر آپ علم حاصل کرنا چاہتے ہیں تو پہلے اپنے دل میں بندگی کی حقیقت تلاش کیجیے پھر اس حقیقت کو عملی جامہ پہنا کر علم طلب کیجیے اور اللہ تعالیٰ سے سمجھ مانگیے وہ آپ کو فہم عطا کرے گا۔

میں نے عرض کیا: بندگی کی حقیقت کیا ہے؟

آپ نے فرمایا: تین چیزیں (۱) اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا ذمے دار بنایا ہے آدمی اپنے آپ کو اس کا مالک نہ سمجھے کیونکہ غلاموں کو حق ملکیت حاصل نہیں ہوتا۔ وہ مال کو اللہ تعالیٰ کا مال سمجھتے ہیں اور جہاں اللہ تعالیٰ کا حکم ہے وہیں خرچ کرتے ہیں۔

امام جعفر صادقؒ کی وصیت

پہلے کے لوگوں کو علم حاصل کرنے کا کتنا شوق ہوتا تھا اس کا اندازہ آپ اس واقعہ سے کر سکتے ہیں۔

امام جعفر صادقؒ نے جب مدینہ منورہ میں سکونت اختیار کی تو ایک بزرگ عنوان نامی بھی ان کی خدمت میں پہنچے اس وقت ان کی عمر ۹۴ برس ہو چکی تھی۔ وہ خود ہی بیان کرتے ہیں۔

میں امام مالکؒ کے پاس مدت سے آیا جایا کرتا تھا۔ جب امام جعفرؒ مدینہ منورہ آگئے تو میرا دل چاہا کہ ان سے بھی کسبِ فیض کروں۔ میں نے حاضر ہو کر اپنی خواہش عرض کی تو امام جعفرؒ نے فرمایا:

دیکھو میری نگرانی کی جاتی ہے پھر میں کچھ اوراد و وظائف کا پابند ہوں اس لیے مجھے مشغول رہنے دو اور بدستور امام مالکؒ سے کسبِ فیض کرتے رہو۔

میں وہاں سے نکل آیا اور دل میں سوچنے لگا کہ اگر امام جعفرؒ نے میرے اندر بھلائی کے آثار دیکھے ہوتے تو منع نہ فرماتے۔ تب میں نے مسجدِ نبوی میں داخل ہو کر بارگاہِ رسالت میں سلام پیش کیا اور گھر چلا گیا۔ دوسرے دن پھر مسجدِ نبوی میں حاضر ہو کر دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ تعالیٰ سے دُعا کی کہ امام جعفرؒ کا دل میرے لیے نرم کر دے اور مجھے ان سے کسبِ فیض کا موقع عنایت فرما دے۔

میں کئی روز تک اپنے گھر غمزدہ پڑا رہا صرف فرض نمازوں کے لیے نکلتا تھا۔ امام مالکؒ

انھیں یاد کرلیجیے اور انھیں معمولی سمجھنے سے پرہیز کیجئے گا۔

جو باتیں ریاضتِ نفس سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں۔ جس چیز کی رغبت نہ ہو اسے نہ کھائیے کیونکہ اس سے حماقت و کند ذہنی پیدا ہوتی ہے۔

اور صرف بھوک لگنے ہی پر کھائیے۔

اور جب کھائیے تو حلال کھائیے۔ اور یہ حدیث پاک یاد رکھیے:

"آدمی نے اپنے پیٹ سے زیادہ بُرا کوئی برتن نہیں بھرا۔ اگر ایسا کرنا ناگزیر ہی ہے تو (پیٹ کا) ایک تہائی حصّہ کھانے کے لیے، ایک تہائی پانی کے لیے اور ایک تہائی سانس کے لیے ہونا چاہیے۔" (ترمذی)

جو باتیں بردباری سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں:

جو آپ سے کہے کہ "اگر تم ایک کہو گے تو دس سنو گے" اس سے کہیے "اگر تم دس کہو گے تو ایک بھی نہیں سنو گے۔"

جو آپ کو گالی دے اس سے کہیے "اگر تمہاری بات سچی ہے تو اللہ تعالیٰ مجھے معاف کرے اور اگر تم جھوٹے ہو تو اللہ تعالیٰ تمھیں معاف کرے۔"

اور جو آپ کی بدخواہی کرے اور بُرا بھلا کہے اس کی خیر خواہی کیجئے اور اس کے لیے بارگاہِ خداوندی میں دعا کیجیے۔

اور جو باتیں علم سے متعلق ہیں وہ یہ ہیں:

علماء سے وہی بات پوچھیے جو معلوم نہ ہو ان کا امتحان لینے کے لیے یا اپنی بڑائی جتانے کے لیے نہ پوچھیے۔

اپنی رائے سے کسی چیز پر عمل نہ کیجیے۔

جہاں تک ممکن ہو احتیاط سے کام لیجئے اور فتویٰ دینے سے اس طرح بھاگیے جیسے شیر سے بھاگتے ہیں، اپنی گردن لوگوں کے لیے پل نہ بنا ڈالیے۔

اب جائیے، میں نے اپنی نصیحت پوری کر دی۔

۲۔ آدمی اپنے لیے کوئی تدبیر نہ اختیار کرے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کا حکم فرمایا اور جن چیزوں سے منع فرمایا ہے بس ان کی بجاآوری میں مشغول رہے۔

جب انسان اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی چیزوں کا اپنے آپ کو مالک نہیں سمجھے گا تو جہاں خرچ کرنے کا حکم ہے وہاں خرچ کرنا آسان ہو جائے گا۔

اور جب انسان تدبیر کو (آسمانوں اور زمین کے) مدبّر کے حوالے کر دے گا تو دنیا کی مصیبتیں اس کے لیے آسان ہو جائیں گی۔

اور جب انسان اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی بجاآوری میں مشغول ہو گا تو ریاکاری اور لوگوں کے ساتھ مقابلہ آرائی کی طرف دھیان نہیں جائے گا۔

اور جب اللہ تعالیٰ کسی شخص کو ان تین نعمتوں سے نواز دے گا تو اس کے لیے دنیا، ابلیس اور مخلوق سب معمولی ہو جائیں گے۔

وہ نہ کثرت و فخر کے لیے دنیا طلب کرے گا۔

نہ لوگوں کے پاس موجود چیزیں عزت و سربلندی کے لیے طلب کرے گا۔

اور نہ اپنے اوقات رائگاں کرے گا۔

یہ تقویٰ کا پہلا درجہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تِلْكَ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ نَجْعَلُهَا لِلَّذِيْنَ لَا يُرِيْدُوْنَ عُلُوًّا فِى الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا ۭ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ۔ (القصص۔ ۸۳)

وہ آخرت کا گھر تو ہم ان لوگوں کے لیے مخصوص کر دیں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے نہ فساد برپا کرنا چاہتے ہیں اور انجام کی بھلائی متقین کے لیے ہی ہے۔

میں نے عرض کیا: امام صاحب مجھے نصیحت فرمائیے۔

آپ نے فرمایا: میں آپ کو نو ۹ باتوں کی نصیحت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی راہ کے طلبگار اپنے مریدوں کے لیے میری یہی نصیحتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ان پر عمل کی توفیق دے۔

تین باتیں ریاضتِ نفس سے متعلق ہیں، تین باتیں بردباری سے اور تین باتیں علم سے۔

انھیں تو اپنے علم کو بلند تر مقاصد کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔

حضرت عمارؓ بن یاسرؓ کی روایت ہے کہ مجھے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے قبیلۂ قیس کی ایک شاخ کے پاس دین سکھانے کے لیے بھیجا۔

(میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا) تو گویا وہ لوگ جنگلی اونٹ کی طرح تھے۔ بکری، اونٹ کے علاوہ انھیں کوئی اور فکر ہی نہیں تھی۔

میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس لوٹ آیا۔

آپؐ نے فرمایا: عمار! کیا کر کے آئے؟

میں نے پورا واقعہ سنایا تو آپؐ نے فرمایا: کیا میں تمھیں ان سے بھی زیادہ عجیب لوگوں کے بارے میں نہ بتاؤں۔

"یہ وہ لوگ ہیں جو وہ باتیں جانتے ہیں جن کو (قبیلۂ قیس کے) وہ لوگ نہیں جانتے پھر بھی انھیں کی طرح غافل ہیں"۔

حقیقت ہے کہ علمی معیار کا بلند ہونا اور ساتھ ہی اخلاقی و انسانی معیار کا گرنا عجیب و غریب چیز ہے اور یہ مصیبت بہت سے معاشروں میں عام ہے۔

اس کا علاج علم میں اضافہ نہیں بلکہ موجودہ علم کا بہتر استعمال ہے۔

امام جعفرؒ نے یہی راستہ دکھایا ہے۔

علم خصوصًا دینی علم حاصل کرنے والے کو اللہ تعالیٰ کی مرضی کے حصول کے لیے وقف ہونا چاہیے اور جلد سے جلد تقویٰ و خیر خواہی کا راستہ اختیار کر لینا چاہیے۔

حضرت علیؓ کی ایک روایت میں ہے کہ انھوں نے بعد کے زمانے میں ہونے والے فتنوں کا ذکر کیا تو حضرت عمرؓ نے دریافت کیا ایسا کب ہوگا؟

حضرت علیؓ نے فرمایا جب علمِ دین غیر دینی مقاصد کے لیے حاصل کیا جائے، عمل نہ کرنے کے لیے سیکھا جائے اور آخرت والے عمل سے دنیا طلب کی جائے۔

انسان جب اپنے علم کے مطابق عمل کرتا ہے تو اس کے اندر ایسی بصیرت پیدا ہو جاتی ہے جس سے حق و باطل اور خیر و شر میں تمیز کر سکے۔ یہی وہ نور ہے جو اللہ تعالیٰ صالحین کے

ہمارے قدیم دینی ورثہ میں جو بہترین نمونے موجود ہیں اور خیر و اخلاص کے ساتھ ادب سکھانے کی جو مثالیں پائی جاتی ہیں یہ وصیت انھیں میں سے ایک ہے۔

اس کی بعض باتوں کی مزید تشریح کی ضرورت ہے تاکہ کسی کو کوئی غلط فہمی نہ ہو جائے علم کا حصول سیکھنے ہی سے ہو سکتا ہے جبکہ امام جعفرؒ کا کہنا ہے کہ" علم سیکھنے سے نہیں آتا" امام صاحب کی مراد یہ ہے کہ علم سے فائدہ تبھی حاصل ہوگا جب صدق دلی سے اس پر عمل کیا جائے۔

بہت سے لوگ کافی علوم سے آگاہ ہوتے ہیں بڑی بڑی کتابیں انھیں یاد ہوتی ہیں لیکن یہ علم ان کے دماغ سے آگے نہیں بڑھتا۔ ایسا علم ذہنی تصورات کے علاوہ کچھ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ کیونکہ علم جب عمل سے کٹ کر محض ذہن وخیال کی چیز رہ جائے تو حقیقت سے بیگانہ ہوتا ہے اور اس کا فائدہ بہت کم ہوتا ہے۔ بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے علم کو حافظہ کے خزانہ میں محفوظ کرنے اور محض زبان پر جاری رکھنے کے خلاف آگاہی دی ہے۔ حضرت جابرؓ کی روایت میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

علم دو طرح کا ہوتا ہے، ایک علم دل میں ہوتا ہے اور یہی مفید ہے۔ دوسرا علم زبان پر ہوتا ہے جو ابنِ آدم کے خلاف اللہ تعالیٰ کی حجّت بنتا ہے"۔ (دارمی)

سارے علوم کے ساتھ ـــــ چاہے وہ دینی ہوں یا دنیاوی ـــــ اعلیٰ شریفانہ مقصد اور خالص نیت ہونی چاہیے۔

دینی علوم کا معاملہ تو واضح ہی ہے کہ دینی علم عمل کا راستہ، تربیت کا ذریعہ اور انسانی نفس کو بلندی تک لے جانے کی بنیاد ہوتا ہے۔

بقیہ سارے انسانی علوم کو بھی انسانیت کے عام فائدے کے لیے استعمال کیا جانا چاہیے۔ یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ اقتصادیات، کیمسٹری اور ایٹم وغیرہ کے کتنے ماہرین اپنے آپ کو ان نا ہنجار سیاستدانوں اور حکمرانوں کی خدمت کے لیے وقف کر دیتے ہیں جو نہ خدا سے ڈرتے ہیں، نہ اس کے بندوں پر رحم کرتے ہیں۔ جس طرح بہت سے علمائے دین دنیا کی طلب میں لگ جاتے ہیں۔

اسی طرح احتیاط کے باوجود انسان کو بغیر توقع کے تکلیف دہ صورت پیش آجاتی ہے اور اسے تعجب ہوتا ہے کہ احتیاط کی شدت کے باوجود ایسا کیوں ہوا۔

اس طرح کے حالات میں معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے مطمئن ہو جانا چاہیے۔

امام جعفرؒ کے پیچھے حکومت پڑی ہوئی تھی اور ہر لمحہ یہ اندیشہ رہتا تھا کہ انھیں پکڑ نہ لیا جائے جیسے اہلبیتؓ کے دیگر افراد پکڑ دھکڑ کا شکار ہو چکے تھے۔

ایسے وقت معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے جو لمحات میسّر تھے انھیں عبادت میں لگانے کے علاوہ اور کیا چارۂ کار تھا؟

البتہ انسانی تدبیر کو کام میں نہ لانے سے پرہیز کرنا تو یقیناً یہ امام جعفرؒ کی مراد نہیں تھی۔

ابن عطاء اللہ کا قول ہے کہ "اللہ تعالیٰ نے جب تمہیں وسائل مہیا کر رکھے ہیں تو اس وقت تجرد کا ارادہ خفی خواہشِ نفس ہے اور جب اللہ تعالیٰ نے اسباب نہ مہیا کیے ہوں اس وقت اسباب کا ارادہ ہمت عالیہ سے انحطاط کی علامت ہے۔"

آپ اپنے ارد گرد کے لوگوں کو بغور دیکھیں تو ہر ایک کو شکوہ سنج اور محروم الاحساس پائیں گے۔ اکثر لوگ یہ سوچتے رہتے ہیں کہ اگر وہ فلاں جگہ ہوتے یا انھیں فلاں چیز حاصل ہوتی تو زیادہ بہتر ہوتا۔

بیشتر لوگ اپنے موجودہ حالات سے صحیح طور پر فائدہ اٹھانا نہیں چاہتے۔

اگر وہ رضا اور خوش امیدی کا پہلو اختیار کرتے تو اپنے اوقات کا کہیں بہتر استعمال کرتے۔

انسانی احساسات ہمیشہ صحیح ہی نہیں ہوتے۔

وَعَسٰى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْئًا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْئًا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ (البقرہ ۲۱۶)

ہو سکتا ہے ایک چیز تمہارے لیے ناگوار ہو وہی تمہارے لیے بہتر ہو اور ایک چیز تمہیں پسند ہو وہی تمہارے لیے بُری ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

میں کبھی اپنی ملازمت سے متنفر رہتا تھا اور تمنا کیا کرتا تھا کہ کاش اس سے بے نیازی حاصل ہوتی۔ ان لوگوں سے حسد محسوس ہوتا تھا جن کے پاس اتنی دولت تھی کہ وہ مخلوقِ خدا

دلوں میں ڈالتا ہے۔

اچھے علم اور اچھے عمل ہی سے یہ نور سینہ میں جاگزیں رہتا ہے۔

اور دو قسم کے لوگ اس نور سے محروم رہتے ہیں: جاہل عبادت گزار اور کوتاہ عمل علماء۔

ایک جاہل عبادت گزار تو اپنی کم عقلی کی وجہ سے خود اپنے لیے بھی خطرہ ہوتا ہے اور اپنی قوم کے لیے بھی۔

اور بے عمل عالم اپنی بدنیتی اور غلط رخ کی وجہ سے خود اپنے لیے بھی خطرہ ہوتا ہے اور اپنی قوم کے لیے بھی۔

مسلمان اس بات کا مکلّف ہے کہ وہ اپنے معاملے کی تدبیر بھی کرے اور ساتھ ہی ساتھ اپنا معاملہ اپنے پروردگار کے سپرد بھی کر دے یعنی اپنا فرض پورا کرے اور اپنے عمل کے نتائج کو اللہ تعالیٰ کے حکم پر چھوڑ دے۔

آپ نے دیکھا نہیں کہ کس طرح آلِ فرعون کے مومن نے حق کے اظہار، حضرت موسیٰؑ کی حمایت اور اپنی قوم کو نجات کا راستہ دکھانے کے لیے اپنی پوری خیر خواہی صرف کر دی پھر معاملہ اللہ تعالیٰ پر چھوڑ دیا۔

فَسَتَذْكُرُونَ مَا أَقُولُ لَكُمْ ۚ وَأُفَوِّضُ أَمْرِي إِلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ بَصِيرٌ بِالْعِبَادِ۔

(غافر۔ ۴۴)

آج جو کچھ میں کہہ رہا ہوں عنقریب وہ وقت آئے گا جب تم اسے یاد کرو گے اور اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں وہ اپنے بندوں کا نگہبان ہے۔

انسان میں فائدہ پہنچانے والی چیز سے رغبت اور نقصان دہ چیز سے گریز فطری طور پر پایا جاتا ہے اور قرآن وسنت کی تعلیمات کے ساتھ اس کا ٹکراؤ بھی نہیں۔ ہاں یہ ضرور دیکھا گیا ہے کہ آدمی نفع بخش چیزوں مثلاً مال وجاہ وغیرہ کے سلسلہ میں حدود سے تجاوز کر کے زیادہ سے زیادہ کی خواہش کرنے لگتا ہے۔

اگر اس کی مرغوب چیزوں کو اللہ تعالیٰ حرام کر دیتا ہے تو وہ غمزدہ ہوتا ہے اور دیگر بہت ساری نعمتوں کا لطف بھی اسے مکدّر سا لگتا ہے۔

آپ کا ارادہ نفس پر مبنی ہے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے لیے جو چاہا ہے وہ حکمت وراحت پر مبنی ہے۔ تمنّاؤں پر محل تعمیر نہیں ہوتے۔

ابن عطاء اللہ کہتے ہیں ہمّت سے تقدیر کی دیوار میں شگاف نہیں ڈالا جاسکتا۔

امام جعفرؒ اور ابن عطاء اللہ دونوں بڑے تربیت کرنے والے ہیں اور ان کا سرچشمہ اسلام ہی ہے اس لیے وہ اسلام کے حدود کو پار نہیں کرسکتے۔

○

بھوک کے ذریعہ ریاضتِ نفس ـــــ جیسا کہ قدیم زمانہ کے بعض زاہدوں اور راہبوں سے ثابت ہے ـــــ قابلِ غور چیز ہے۔ انسانی جسم کو صحت اور نشو ونما کے لیے جتنے کھانے کی ضرورت ہے اس سے کم مقدار صحیح نہیں۔

جسم پر ظلم سے انسان کے سارے کام ہی معطل ہوتے ہیں جن میں عبادت بھی ہے اسے نہ دین پسند کرتا ہے نہ کوئی ذی ہوش۔

لیکن دیکھا یہ جاتا ہے کہ خاص طور پر آج کے دور کے لوگ اپنے جسم کی ضرورت سے کہیں زیادہ اسے چارہ مہیا کرتے ہیں۔

عام لوگ زیادہ سے زیادہ کھانے پینے کا رجحان رکھتے ہیں۔

یہ بھی صحیح ہے کہ بہت سے علاقوں میں لوگ بھکمری کا شکار ہیں لیکن یہ بھوک فقر و درماندگی کی وجہ سے ہے ریاضت و مجاہدہ کی بنا پر نہیں۔

اسلام بہرحال بدن کو بھوکا رکھنے کو ناپسند کرتا ہے اس نے تو پاک چیزوں کو مباح بھی کیا ہے اور ان پر شکر کا بھی مطالبہ کیا ہے۔

كُلُوا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ○ (البقرہ ۱۷۲)

اگر تم حقیقت میں اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو تو جو پاک چیزیں ہم نے تمہیں بخشی ہیں انھیں بے تکلف کھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو۔

لیکن اس کے ساتھ ہی زیادہ کھانے کے محرکات کے خلاف آگاہی دینا بھی ضروری ہے۔

سے الگ تھلگ رہ سکتے تھے۔

کبھی یہ محسوس ہوتا تھا کہ جو لوگ الگ تھلگ ہیں وہ زندگی کے معرکہ سے فرار اختیار کیے ہوئے ہیں۔ کام تو خدمت کا ذریعہ اور انسانی مقام کو مستحکم کرنے کا سبب ہے۔

انسانی نفس میں طرح طرح کے رجحانات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

بہر حال جو بھی صورت ہو کوشش حتی المقدور کرنی چاہیے پھر بغیر کسی تلخی کے یا منفی ذہنیت کے حقیقت کو تسلیم کرنا چاہیے۔

یہی اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کا مطلب ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کے آگے سپر انداز ہو جائیں اور یہ سمجھیں کہ اس کی حکمت زیادہ بلند اور فیصلہ زیادہ نافذ ہونے والا ہے۔ ہمیں جو وسائل میسّر ہیں ان کے اندر پوری سنجیدگی کے ساتھ اور راضی برضا رہ کر کام کرتے رہنا چاہیے۔

ظاہر ہے اس کا مطلب یہ نہیں کہ دین اسباب کو ترک کرنے اور زندگی کے میدان میں سُست گامی اختیار کرنے کو کہتا ہے۔

اگر ایک وکیل تمنّا کرتا ہے کہ کاش وہ ڈاکٹر ہوتا۔ یا ایک قلمکار تمنّا کرتا ہے کہ کاش وہ افسر ہوتا اور آپ اس سے یہ کہتے ہیں کہ قسمت پر راضی رہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ اس سے یہ کہہ رہے ہیں کہ دنیا سے دلچسپی لینا چھوڑ دو۔

اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ حقیقت کو بدلنا ممکن نہیں تو اس کے دائرے ہی میں کام کیجیے کسی کی تمنّا کے حصول کے لیے زمین کی گردش نہیں بدل سکتی۔

ابن عطاء اللہ یہی کہتے ہیں کہ اگر آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف اپنا رُخ کرنے کا فیصلہ کر لیا تو آپ جس پیشہ یا کام سے بھی متعلق ہوں آپ فوراً ایسا کر سکتے ہیں۔ یہ سوچنا غلط ہے کہ فلاں کام چھوڑ کر یا فلاں پیشہ اختیار کر کے زیادہ آسانی ہوگی۔

موجودہ اسباب کو چھوڑنا ایک طرح کی بے روزگاری ہوگی۔

دوسرے کام کو اختیار کرنے کی خواہش خوش فہمی پر مبنی بھی ہو سکتی ہے۔

حقیقت پسند بنیے۔

آپ جو چاہتے ہیں وہ نہیں ہوتا تو آپ وہی چاہیے جو ہو رہا ہے۔

آج عوام کی بہت بڑی تعداد وجودیت، اشتراکیت اور اباحیت وغیرہ کا شکار ہے اور اس دنیا سے آگے ان کی نگاہ ہی نہیں جاتی۔

اس لیے انھیں جو کچھ مل سکتا ہے اس پر ٹوٹے پڑتے ہیں کیونکہ ان کے لیے یہی اوّلین اور آخری موقع نظر آتا ہے۔ اس زندگی کے بعد کسی دوسری زندگی کا تصوّر ہی ان کے پاس نہیں ہوتا۔

پھر دنیا کی نعمتوں کی تقسیم پر لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں کہ کہیں کسی شخص کو دوسرے شخص سے زیادہ حصّہ نہ مل جائے۔

اس مادی رجحان اور طرزِ فکر کے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کریم کہتا ہے:

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِينَ كَفَرُوا عَلَى النَّارِ ط أَذْهَبْتُمْ طَيِّبَاتِكُمْ فِي حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا فَالْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُونِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُونَ فِي الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُونَ ۝ ع (الاحقاف - ۲۰)

پھر جب یہ کافر آگ کے سامنے لاکھڑے کیے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا تم اپنے حصّے کی نعمتیں دنیا کی زندگی میں ختم کر چکے اور ان کا لُطف تم نے اٹھا لیا اب جو تکبّر تم زمین میں کسی حق کے بغیر کرتے رہے۔ اور جو نافرمانیاں تم نے کیں ان کی پاداش میں آج تم کو ذلّت کا عذاب دیا جائے گا۔

خود رائی

جس رائے پر عمل کرنے سے امام جعفر صادقؑ نے منع کیا ہے وہ خواہشِ نفس اور بدعت ہے یعنی ایسی چیز ایجاد کرنا جس کی اللہ کے دین میں کوئی اصل نہ ہو۔

علماء کے درمیان اس بارے میں کوئی اختلاف نہیں کہ مقبول عبادت کی بنیاد مکمّل پیروی اور اللہ اور اس کے رسول کی مرضی تلاش کرنے پر ہے۔

یہ اچھے ایمان کی علامت ہے کہ آدمی پہلے یہ جاننے کی کوشش کرے کہ دین کیا کہتا ہے اس سے پہلے کہ کسی معاملہ میں اپنی رائے ظاہر کرنے لگے۔ کیونکہ اگر اللہ تعالیٰ اور

جو لوگ استطاعت رکھتے ہیں وہ کم نرخی حدِ اعتدال میں رہتے اور آسودگی پر قناعت کرتے ہیں۔

ایسا تو بہت کم ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کے لیے کھانا نہ کھائے یا اس کو اپنے کھانے میں شریک کرلے

نفس کو خوش کرنے کی اس مجنونانہ حرکت کو اسلام بجا طور پر مسترد کرتا ہے۔ تغذیہ کی کمی سے قوموں کو بچانا ضروری ہے۔

اس لیے کھانے میں اسراف اور پیٹ کو اتنا بھر لینا جو بمشکل ہضم ہو اس سے بچنے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیئے۔

اس معاملہ میں شروع ہی سے تربیت کی ضرورت ہے تاکہ کھانے پینے کی صحیح عادتیں پیدا ہوں۔

پھر جسم مختلف ہوتے ہیں اور ان کی ضروریات بھی مختلف ہوتی ہیں۔

اسلام اس سلسلے میں ان باتوں کی اہمیت دیتا ہے کہ: کھانا زندگی کا مقصد نہ بن جائے۔ یہ کتنی گراوٹ کی بات ہے کہ انسان اپنی عظیم صلاحیتوں کو اس حقیر مقصد کے لیے استعمال کرے۔ کھانا تو زندگی کے لیے اور ان فرائض کی ادائیگی کا ذریعہ ہے جن کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے اور ذریعہ کی وقعت اس کے نتائج ہی سے ہوتی ہے۔

اسی لیے متقی لوگوں کا کھانا اور ان کا سونا بھی عبادت ہے کیونکہ اس طرح انھیں ضروری طاقت اور راحت حاصل ہوتی ہے۔

اسلام جسم کے ساتھ دشمنی کو مسترد کرتا ہے اور حدود کے اندر زندگی کی پاک و خوشگوار چیزوں سے فائدہ اٹھانے کی ترغیب دیتا ہے۔

كُلُوا وَاشْرَبُوا — کھاؤ، پیو،

وَلَا تُسْرِفُوا (الاعراف ۳۱) — اور حد سے تجاوز نہ کرو۔

یہ احساس ہر دم رہنا چاہیے کہ دنیا کو آخرت کی تیاری کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ یہ مستقل ٹھکانہ نہیں ہے۔

اوراد

آخر میں ان اوراد کا سوال پیدا ہوتا ہے جن کی پابندی امام جعفرؒ کرتے تھے اور جن کی ادائگی کے خواہاں تھے۔ قدیم زمانہ میں عام مسلمانوں میں کیا اوراد رائج تھے اور اسلام کا ان سے کیا تعلق ہے۔

یہ بات ابتدائی طور پر واضح رہنی چاہیے کہ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ کوئی عبادت ایجاد کرے۔ اگر کوئی شخص خاص اذکار کا پابند ہے تو اسے دوسروں سے ان اذکار کی پابندی کرانے کا حق نہیں۔

یہ حکم دینا کہ فلاں چیز فرض ہے یا فلاں چیز مستحب ہے یہ صرف شارع کا حق ہے کسی انسان کو اس میں شرکت کا حق نہیں ہے۔

حدیث میں آتا ہے کہ قرآن کریم کی تلاوت ثواب کا بڑا ذریعہ ہے۔

اب روزانہ کتنی مقدار تلاوت کی جائے اس کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے کہ مہینے میں زیادہ سے زیادہ ایک بار قرآن کریم ختم کیا جائے یا جو زیادہ چستی محسوس کرے وہ ہفتہ میں ایک بار ختم کرے۔

اس سے کم مدّت میں قرآن پاک ختم کرنا بہتر نہیں ہے کہ تب اس پر غور و فکر کا موقع ہی نہیں مل سکے گا۔

پھر اگر تجارت یا جہاد جیسی مشغولیت درپیش ہو تو اس میں بھی کمی کی جا سکتی ہے۔

عَلِمَ اَنْ سَيَكُوْنُ مِنْكُمْ مَّرْضٰى وَ اٰخَرُوْنَ يَضْرِبُوْنَ فِى الْاَرْضِ يَبْتَغُوْنَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ وَ اٰخَرُوْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ۔ (المزمل۔ ۲۰)

اسے معلوم ہے کہ تم میں کچھ مریض ہوں گے کچھ دوسرے لوگ اللہ کے فضل کی تلاش میں سفر کرتے ہیں اور کچھ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس جتنا باآسانی پڑھا جا سکے پڑھ لیا کرو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

مطلب یہ ہے کہ فرائض کی مکمل ادائگی ناگزیر ہے نوافل وقت میسّر ہونے اور دلی رغبت و توجہ کی صورت میں ادا کی جائیں گی۔

اس کے رسول کی رہنمائی موجود ہے تو پھر کسی کو کوئی بات کہنے کا حق حاصل نہیں یہی اس آیت سے بھی واضح ہے کہ :

يَآ يُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَيْنَ يَدَيِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۔ (الحجرات ۔ ۱)	اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ اور اس کے رسول کے آگے پیش قدمی نہ کرو اللہ سے ڈرو اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔

اس لیے انسان کو اپنی رائے مؤخر رکھنی چاہیے یہاں تک کہ آسمانی ہدایت واضح ہو جائے۔ پھر اگر کوئی امر بالکل واضح ہو جائے تو دل و دماغ سے اسے قبول کر لے اور خود اپنی رائے سے فوراً دستبردار ہو جائے۔ کیونکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

"تم میں سے کوئی اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس کی خواہش اس چیز کے تابع نہ ہو جائے جسے لے کر میں آیا ہوں"۔

یہی امام جعفرؒ کے اس قول کا بھی مطلب ہے کہ "تم کسی چیز میں اپنی رائے سے عمل کرنے سے بچو"۔

بہت سے ایسے جاہل عبادت گزار ہوئے ہیں جن کی نیتیں نیک ہوتی ہیں اور وہ اللہ اور اس کے رسول کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جوش و جذبہ سے بھی معمور ہوتے ہیں لیکن وہ بعض چیزوں کے کرنے یا نہ کرنے میں کتاب و سنت کی ہدایات کی مخالفت کر جاتے ہیں۔ یہ احمقانہ طریقہ ہے بلکہ دین سے برگشتگی، دین کے حدود پر حملہ اور لوگوں کو دین سے روکنے کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

کتنے جاہل عبادت گزاروں نے اسلام کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔

یہ بات ناگزیر ہے کہ اصل دین کو پہچانا جائے تاکہ اس پر صحیح طریقے سے عمل ہو۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک عالم شیطان پر ایک ہزار عبادت گزاروں سے بھاری ہوتا ہے۔ (ترمذی)

جس رائے سے منع کیا گیا ہے وہ یہ نہیں ہے کہ اہلِ علم اور اہلِ حل و عقد کسی نص کو سمجھنے اور اس پر قیاس کرنے نیز قرآن و حدیث کے عام اصولوں کی بنیاد پر نئے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

بلکہ یہ راستہ تو دین کو زندہ رکھنے اور اُسے ہمہ گیر بنانے کا ہے۔ اس سلسلے میں اختلاف رائے ہونا بھی فطری ہے اور مختلف رایوں کا احترام بھی کرنا چاہیے اور بغیر تعصب کے ان میں سے جو پسند ہو قبول کر لینا چاہیے۔ فقہ کے مختلف مسالک کے درمیان موازنہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ یہ سب اجتہاد کی قسم ہے جس پر اجر کی بشارت دی گئی ہے اسے قابلِ ملامت خود رائی نہیں قرار دیا جا سکتا۔

تجارت و جہاد بھی عبادت ہے جیسے نماز اور تلاوتِ کلام پاک عبادت ہے۔

بہت سے مسنون اذکار صبح و شام کے لیے ہیں جنھیں زبان سے ادا کرنے میں چند منٹ ہی لگتے ہیں۔

اس طرح کے اذکار جو نفلی ہیں وہ تجارت و جہاد سے نہیں روکتے۔ کوئی بھی ذی ہوش یہ نہیں سمجھ سکتا کہ ان اذکار کا ورد تلاوتِ کلام پاک سے زیادہ اہم ہے جس کا حکم ابھی اُوپر آچکا ہے۔

یہ بات پوری طرح واضح رہنی چاہیے کہ دین نام ہے فرائض و نوافل کا۔ اور نوافل کی ادائگی فرض کی ادائگی کے بعد ہی کی جا سکتی ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ: یہ تو تمام مسلمان جانتے ہیں۔

میں عرض کروں گا کہ تطبیق کی صورت میں صحیح آگاہی کا پتہ نہیں چلتا۔

اقتصادی و علمی برتری ملّتِ اسلامیہ کے لیے فریضہ ہے۔

اگر کوئی مدرّس اس علمی برتری کے مقصد کی تکمیل میں حصّہ لے رہا ہے اور اسے موقع نہیں ہے تو وہ بس فرض نماز ادا کرے اور پھر ان فرائض کی تکمیل میں لگ جائے جن سے اسلام کی سربلندی ہو۔ اگر فرائض کو نقصان پہنچا کر اوراد میں مشغول رہا جائے تو یہ قابلِ قبول نہیں۔ اور وہ بھی جب اوراد مسنون ہوں۔ اگر کسی شخص نے اوراد کا کوئی سلسلہ اپنے پیرو کاروں کے لیے متعیّن کیا ہے تو یہ معاملہ بدعت کا ہے اور حضرت عبداللہؓ بن مسعود کا یہ قول ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ "سنت پر تھوڑا عمل بدعت پر زیادہ سے زیادہ کوشش کے ساتھ عمل سے بہتر ہے"۔

امام جعفرؒ صادق کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ آپ کو عباسی خلفاء ناپسند کرتے تھے اور خائف رہتے تھے کہ عوام اُن کے پاس زیادہ جمع نہ ہوں کہ ان کی حکومت خطرے میں پڑ جائے۔

چنانچہ نیک امام نے فتنہ سے بچنے اور سیاست کے شور شرابہ سے ہٹ کر تلاوت و ذکر اور اپنے کچھ مریدوں کو علم سکھانے ہی کو ترجیح دی۔

عزلت نشینی، تلاوت و ذکر میں مشغولیت اور اپنی جان اور دین کو بچانے کی امام صاحب کی خواہش میں شاید یہی راز بھی مضمر تھا۔